سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ
سرگزشت
کراچی
فروری 2023
بانی
معراج رسول
قیمت 150 روپے
بقلم خود: ایک معروف قلم کار کی چونکا دینے والی آپ بیتی
عشق ناتمام: نواب سراج الدولہ سے جڑی ایک داستانِ محبت
کچرا کنڈی: ایسی دلچسپ سچ بیانی جو آنسو لا دے یا دہلا جائے

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

جلد 32 ♦ شمارہ 10 ♦ فروری 2023ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرِ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نیلا ظہیر

♦♦♦

مارکیٹنگ منیجر
محمد شہزاد عثمان
0333-2256789

♦♦♦

سرکولیشن منیجر
سید منیر حسین
0333-3285269
محمد شہزاد خان
0333-2256789

♦♦♦

قیمت فی پرچہ 150 روپے ♦ زرِ سالانہ 2000 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: 63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا، کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ♦ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

بسم اللہ الرحمن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

سال گزشتہ یعنی 2022، ایک ایسا سال تھا جو دہلاتے ہوئے گزرا۔ جنوری سے دسمبر تک دل بیٹھ بیٹھ جاتا تھا۔ قسم قسم کے منحوس اندیشے ڈراتے رہے تھے۔ ہمارے پاس سونا اگلتی زمین، بھرپور افرادی قوت، معدنیات سے بھرے پہاڑ، بل کھاتی ندیاں، آبی خزانے سے بھرا سمندر، پھر بھی ہم ترقی یافتہ کی فہرست میں پہنچنے کی بجائے ترقی پذیر ممالک کی فہرست میں ہی رہے بلکہ افواہوں کی زد میں رہے۔ یہ افواہیں دشمنانِ وطن پھیلاتے رہے اور ہم دہلتے رہے کہ ہم دیوالیہ کے قریب آ گیا۔ یہ وطن تحفۂ خداوندی ہے۔ خدارا سیاست داں سنبھل جائیں اور کرسی کی فکر چھوڑ کر تعمیر وطن کی جانب توجہ دیں۔ خدا نے ہمیں بہت کچھ دیا ہے۔ اس سے فائدہ اٹھائیں۔ ملک کو آگے بڑھائیں۔

# قلم کار

14 اپریل 1893ء میں اس نے دہلی کے ایک معروف خانوادے میں آنکھ کھولی۔ اس خاندان کی وجہ شہرت انگریز دشمنی تھی۔ 1857ء کے بعد حکومت انگلیشیہ نے پوری طرح برصغیر پر پنجے گاڑ دیے تھے۔ حب الوطنی کی سزا املاک کا ضبط ہونا تھا۔ پھانسی یا کالا پانی بھیج دینا عام سی بات تھی۔ ایسے وقت میں مسلم امرا کی بڑی تعداد حکومتی عہدے لینے سے گریز کرتی اور تجارت یا زمینداری میں روزی تلاش کرتی۔ ان کے خون میں بھی انگریز دشمنی گردش کر رہی تھی۔ گھر والوں نے انہیں فارسی یا اردو کے علاوہ کسی اور زبان کی جانب بڑھنے نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انگریزی پڑھنے والوں کے پاس انگریزوں کی غلامی کا لائسنس مل جاتا تو نوکری مل جاتی تھی مگر اس خاندان میں ہر ایک کو تاکید تھی کہ کبھی نوکری نہیں کرنا۔ وہ بھی انگریزی پڑھنے سے گریز کر رہا تھا کہ چودہ سال کا ہو چکا تھا مگر انگریزی کا ایک حرف نہیں پڑھ سکا تھا۔

چاندنی چوک کے مدرسے میں اسے داخل کیا گیا تھا۔ وہ مدرسے کی تعلیم کے ساتھ نصاب سے باہر کی کتابیں بھی شوق سے پڑھتا۔ اس کی عادت سی بن چکی تھی کہ مدرسے سے گھر پہنچتے ہی وہ بستہ ایک طرف رکھ کر گھر میں آنے والے اخبار و رسائل کھول کر بیٹھ جاتا۔ کھانا کھاتے وقت بھی اس کے ہاتھ میں کتاب رہتی۔ ایک روز بازار سے گزر رہا تھا کہ مولوی سید وحید الدین سلیم (لٹریری اسسٹنٹ سرسید) جو ایک دکان پر بیٹھے ہوئے تھے۔ انہوں نے اسے اشارے سے بلایا، نام پوچھا پھر بولے۔ "میاں میں قیافہ شناس ہوں، چہرہ پڑھنے کے علم سے واقف ہوں۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم ایک کامیاب ادیب ہو گے۔ وقت نکال کر میرے گھر آجایا کرو۔ میں تمہیں مضمون نگاری سکھاؤں گا۔" اس نے حیرت سے انہیں دیکھا پھر کہا۔ "مولوی صاحب، میں کسی سے کچھ سیکھنا نہیں، مضمون نگاری آتی ہو گی تو خود ہی آجائے گی۔" وہ جھنجلا کر بولے۔ "تمہاری مرضی۔" سال ہا سال گزر گئے مولوی صاحب اردو کے پروفیسر بن کر عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد چلے گئے۔ تعطیلات پر پانی پت آئے تو خواجہ سجاد حسین خلف مولانا حالی سے ملنے ان کے ہاں گئے۔ وہاں وہ بھی تھا۔ اسے دیکھ کر بولے۔ "میاں رسالہ اردو میں تمہارا مضمون "سنسکرت کے عربی و فارسی تراجم" پڑھا بہت پسند آیا۔" اس نے فوراً کہا۔ "مولوی صاحب یاد ہے آپ نے ایک بار کہا تھا کہ مضمون نویسی سکھاؤں گا۔" مولوی صاحب نے قہقہہ لگا کر جواب دیا۔ "واقعی تم نے کر دکھایا کہ مضمون نویسی آتی ہو گی تو آجائے گی۔" مولوی صاحب نے خوب تعریف کی۔ اس مضمون سے بہت پہلے اس نے ایک مضمون "ریل گاڑی" لکھ کر مولوی محبوب عالم کے اخبار "انتخاب لاجواب" میں بھیجا تھا۔ وہاں سے دل شکن جواب آیا کہ مضمون ردی میں پھینک دیا ہے۔ یہ کام تمہارے بس کا نہیں ہے لیکن اس نے حوصلہ نہ ہارا اور لکھتا رہا۔ پھر ایک دن وہ آیا کہ وہی محبوب عالم اس کی تحریریں خصوصی طور پر اپنے اخبار میں لگانے لگے۔ 1914ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشن کانفرنس علی گڑھ کے لیے اس نے "لوریاں پہیلیاں" لکھی جو 87 کتابوں میں پہلے نمبر پر آئی۔ اسی دوران اس نے حالی مسلم ہائی اسکول پانی پت میں ملازمت کی پھر مولانا حالی کی لائبریری کا لائبریرین بن گیا۔ 1918ء میں اس نے اپنی ایک لائبریری قائم کر لی جو قیام پاکستان کے وقت حکومت ہند نے ضبط کر لی۔ بحیثیت مدیر اس نے جھنگ سے نکلنے والے اخبار عروج کو عروج پر پہنچایا پھر 1930ء میں رسالہ رہنمائے تعلیم کی ادارت سنبھال لی۔ 1934ء میں مولانا حالی کی پیدائش کا صد سالہ جشن اورنگ آباد دکن میں منایا گیا تو مولانا حالی کے فرزند خواجہ سجاد حسین کو بھی مدعو کیا گیا، انہوں نے اسے اپنا نمائندہ قرار دے کر اورنگ آباد بھیج دیا کیونکہ حالی پر اس سے زیادہ کسی اور نے کام نہیں کیا تھا۔ جواہرات حالی (غیر مطبوعہ نظمیں) مکاتیب حالی (خطوط حالی) افکار سلیم (مولانا وحید الدین سلیم کی نظمیں) مضامین سلیم (تین حصے) مکتوبات سرسید، سرسید کا سفرنامہ لندن۔ مقالات سرسید (16 حصے) سیرۃ ابن ہشام، تاریخ اشاعت اسلام، مولانا حالی کی سوانح عمری، مشاہیر پانی پت، ترجمہ طبقات ابن سعد، ترجمہ کتاب الاصنام از ہشام کلبی، مفصل تاریخ اسلام، تاریخ تمدن اسلام، تاریخ مشاہیر اسلام، جغرافیہ تاریخ اسلام، سرسید کا سفرنامہ پنجاب، کلیات نثر حالی، کلیات نظم حالی، تاریخ اخبارات و رسائل، ایمان کی باتیں (بچوں کے لیے) جیسی تصنیفات ان کی ہے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سی کتابیں مشہور و معروف ہیں۔ 79 سال کی عمر میں وہ 12 اکتوبر 1972ء کو فشارِ خون کے عارضہ میں لاہور میں پیوند خاک ہوئے۔ ہم انہیں شیخ محمد اسماعیل پانی پتی کے نام سے پہچانتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

# اہلِ سلوک

ضیا تسنیم بلگرامی

انسان مٹی کا پتلا ہے۔ خاک سے بنا ہے اور خاک میں ہی اسے مل جانا ہے لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ اس خاک کے پتلے کو اللہ تعالیٰ نے خلیفۃ الارض قرار دیا ہے لیکن اسے یہ بلند مرتبہ اپنی کوشش سے حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اس ولی کامل نے بھی اپنی "پہنچ" کا ادراک کرایا اپنی کوشش سے مرتبہ حاصل کیا۔

## ایک ولی کامل کی زندگی کا عکس

تلاشِ معاش کے سلسلے میں جو خاندان ہندوستان کا رخ کرتے تھے، وہ رہزنوں سے بچنے کے لیے بڑے بڑے قافلوں میں شامل ہو جاتے تھے چنانچہ ایک ایسا ہی قافلہ ترکستان کے شہر خجند سے چلا تو اس میں ایک ایسا خاندان بھی شامل ہو گیا جس کا سلسلۂ نسب خلیفۂ اوّل حضرت ابوبکر صدیق سے مل جاتا تھا۔ اس خاندان کی خصوصیت یہی تھی کہ اس کے ہر فرد نے دامنِ قناعت کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا اور رسول مقبول کی محبت سے سرشار رہتا تھا۔ یہ خاندان نورِ باللہ کا تھا۔

قافلے نے درۂ خیبر عبور کیا تو لوگ بچھڑنے اور نئے اس میں شامل ہونے لگے۔ ان قافلے والوں نے خانوادۂ صدیقی میں یہ خاص بات محسوس کی تھی کہ وہ کسی کے آگے دستِ طلب نہیں دراز کرتے تھے۔ ان کے پاس جو کچھ روکھا پھیکا تھا، وہی انہیں کافی تھا۔ ان کی اس ادا نے سبھی کو متاثر کیا تھا۔ یہ کم گو بھی بے حد تھے۔ ہاں عبادت میں ان کا کوئی

مد مقابل نہ تھا۔ یہ لوگ دہلی پہنچ کر آباد ہو گئے۔ ذریعۂ معاش میں سرکاری ملازمتیں زیادہ پسند آ گئیں۔ مغل بادشاہ شاہ جہاں کو عمارتیں بنوانے کا بڑا شوق تھا۔ اس نے شیخ نور اللہ کو بلوایا اور دیر تک فن مہندسی پر بات کرتا رہا۔ شیخ نور اللہ کوئی معمولی آدمی تو تھے نہیں اور خدا نے انہیں دلیری بھی بلا کی بخشی تھی۔ انہوں نے بادشاہ کو قائل کیا اور شاہ جہاں نے انہیں ملازم رکھ لیا۔

کام کرتے کرتے خانۂ خدا اور رسولؐ خدا کی یاد نے بے چین کیا تو حج کرنے چلے گئے۔ وہاں سے مدینہ منورہ چلے گئے اور رسول مقبولؐ کے مزار اقدس پر حاضری دی۔ خوب گڑگڑا کر روئے اور دعا مانگی۔ "یا رسول اللہ! میرا سینہ تو سوزِ عشق سے لبریز ہے مگر میں چاہتا ہوں کہ مجھے ایسی اولاد ملے جس کے سوز و گداز کا چرچا عام ہو جائے اور اس حقیر کے خاندان کا نام روشن ہو۔"

دعا مانگنے کے بعد شیخ نور اللہ کو غیر معمولی سکون میسر آ گیا جس سے انہیں یقین ہو گیا کہ ان کی دعا قبول ہو گئی۔ شیخ نور اللہ حجاز سے واپس آئے تو حاجی شیخ نور اللہ ہو گئے۔

حجاز سے واپسی کے بعد انہیں معلوم ہوا کہ گھر میں کسی کی آمد کا انتظار ہو رہا ہے۔ یہ انتظار 24 جمادی الثانی 1060ھ کو ختم ہو گیا۔ ایک نومولود نے پورے گھر کو خوشی سے مالا مال کر دیا۔ شیخ نور اللہ نے بچے کے کان میں اذان کہی اور بیوی سے کہا۔ "نیک بخت! معلوم نہیں کیوں مجھے اس لڑکے نے جو استغنا بخش دیا ہے، اس کا لفظوں میں اظہار ناممکن ہے۔"

بیوی نے شرما کر جواب دیا۔ "اور یہی حال میرا ہے۔ میں خود کو غنی محسوس کر رہی ہوں۔"

بیوی کے لفظ "غنی" نے دونوں ہی کو چونکا دیا۔ شیخ نور اللہ نے کہا۔ "نیک بخت! ذرا ٹھہر جا۔ دم لینے دے۔ یہ لفظ "غنی" مجھے تو الہامی معلوم ہوتا ہے۔ ذرا ابجد سے اس کے اعداد تو نکالنا۔ ضرور اس میں کوئی خاص بات ہے۔"

بیوی نے جواب دیا۔ "میں کیا جانوں کہ حروف ابجد سے اعداد کیونکر نکالے جاتے ہیں۔ آپ واقف ہیں تو ہوں... میں کچھ نہیں جانتی۔"

شیخ نور اللہ نے غنی کے اعداد نکالے تو پتا چلا کہ 1060 نکلتے ہیں، بولے۔ "خوب! اس سے تو سن تاریخ نکل آیا۔ بچہ بڑا گوہر ہے۔ خدا نے چاہا تو اسی بچے سے اپنی تمنا پوری ہوں گی۔"

خاندان والوں نے مبارک بادیاں دیں اور پوچھا۔ "بچے کا نام کیا رکھا؟"

شیخ نور اللہ نے جواب دیا۔ "نام ابھی کہاں رکھا۔ اب رکھوں گا۔"

یہ کہہ کر آپ اندر چلے گئے۔ یہاں بھی خاندان کے قریبی رشتے دار موجود تھے اور بضد تھے کہ لڑکے کا نام جلد از جلد رکھا جائے۔ شیخ نور اللہ کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا، کچھ دیر کے لیے مراقبے میں چلے گئے۔ کافی دیر بعد جب آپ نے خود کو مراقبے سے نکال کر ہوش و حواس کی دنیا میں قدم رکھا تو ان کے کانوں میں بس ایک ہی آواز "کلیم اللہ" گونج رہی تھی۔ یہ خود کو مصروف رکھنے کے لیے مذہبی کتابوں کے مطالعے میں مصروف ہو گئے۔ اتنے میں دربار شاہی سے بلاوا آ گیا۔

شیخ نور اللہ دربار شاہی میں پہنچے اور بادشاہ کو خوشخبری سنائی۔ "حضور والا! آج میرے نسب کا نام روشن کرنے والا پیدا ہو چکا ہے۔"

بادشاہ نے بھی مبارک باد دی اور جب بادشاہ کو یہ معلوم ہوا کہ نومولود کا نام کلیم اللہ رکھا گیا ہے تو دوسری مبارک باد دی۔ بادشاہ نے کہا۔ "حاجی نور اللہ! جب بچہ کچھ سیانا ہو جائے تو اس کی تعلیم و تربیت پر خصوصی توجہ دینا۔"

شیخ نور اللہ نے دل میں کہا۔ "حضور والا! یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے۔"

چنانچہ جب کلیم اللہ ذرا بڑے ہوئے تو انہیں اس وقت کے لائق ترین اساتذہ کے سپرد کر دیا گیا۔ حدیث، فقہ اور دوسرے ظاہری علوم شیخ ابو الرضا سے پڑھے اور علوم باطنی شیخ ابو الفتح قادری سے حاصل کیے۔

کلیم اللہ نے ہوش سنبھالتے ہی جو کچھ دیکھا یا سنا، وہ ان کی حیرت اور خوف میں اضافہ کرتا رہا۔ وہ آسمانوں کی طرف دیکھتے تو خوفزدہ ہو جاتے کہ آخر یہ کیا ہے جس کے حدود اور انتہا کا پتا نہیں چلتا۔

رات کو جھلمل انجم اور چاند کو دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتے کہ یہ سب کیا ہے اور انہیں کس نے اتنی بلندی پر نصب کر رکھا ہے؟ ستاروں کی روشنی اور چشمک زنی الگ حیران کر رہی تھی۔ چاند جو سب سے بڑا تھا، مستقل سوال بنا ہوا تھا۔ یہ کیا ہے اور اس کا خالق کون ہے؟ صبح سب کی روشنی ماند پڑ جاتی اور سورج پوری دنیا کو روشن و منور کر دیتا تو وہ اور



زیادہ حیرت زدہ ہو جاتے۔ اب اس حیرت میں ان کا خوف بھی شامل ہو جاتا۔

بے چین اور مضطرب طبیعت ہزاروں سوال پیدا کرنے لگی۔ پیچیدہ ترین سوالات کا لامتناہی سلسلہ تھا جو ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ باپ کے پاس ان سوالوں کے تشفی بخش جوابات نہیں تھے۔ اسی دوران ان کی ملاقات ایک ایسے بزرگ سے ہو گئی جنہیں صوت لایزالی سننا آتا تھا اور یہ آواز کس طرح سنی جائے وہ بزرگ اس فن میں ماہر تھے۔ ناتجربے کار کلیم اللہ نے ان بزرگ سے کہا۔ "محترم بزرگ! میں وہ آواز سننا چاہتا ہوں جسے صوت سرمدی یا صوت لایزالی کہتے ہیں۔ کیا اس سلسلے میں آپ میری مدد فرمائیں گے؟"

ان بزرگ نے کلیم اللہ کو ذرا غور سے دیکھ کر پوچھا۔ "میاں صاحبزادے! کیا تم طلب صادق رکھتے ہو؟"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "بالکل۔ اگر مجھ میں طلب صادق نہ ہوتی تو میں یہاں تک نہ آتا۔"

بزرگ نے فرمایا۔ "یہ بہت مشکل مشغلہ ہے۔ عموماً لوگ اس کے متحمل نہیں ہوتے۔"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "میں طلب صادق رکھتا ہوں۔ آپ آزما کر تو دیکھیں۔"

چنانچہ ان بزرگ نے انہیں اس مشغلے میں لگا دیا جس سے کلیم اللہ صوت سرمدی سن سکیں۔

آخر کئی سال بعد کلیم اللہ کے کانوں میں صوت سرمدی آنے لگی۔ ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ یہ بھاگے بھاگے ان بزرگ کے پاس گئے اور عرض کیا۔ "قبلہ! میں اب ایک عجیب سی آواز سن رہا ہوں۔"

بزرگ نے پوچھا۔ "یہ کیسی آواز ہے؟ تم کیا محسوس کر رہے ہو؟"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "یہ آواز مجھے کچھ بتا رہی ہے۔ میں کیا بتاؤں مگر مجھے یہ آواز جو کچھ بتا رہی ہے وہ عجیب و غریب ہے۔ میں ان آوازوں کے معانی و مطالب جاننے کے لیے اپنی زندگی برباد کر دوں گا۔"

بزرگ کو اس تڑپ اور لگن نے بہت زیادہ متاثر کیا، کہا۔ "کلیم اللہ! مایوس نہ ہو۔ ایک دن تو اپنی منزل مقصود کو پہنچے گا۔"

اب کلیم اللہ صوت سرمدی میں ایسے مگن ہوئے کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہ رہا لیکن اب بھی انہیں ایک شکایت تھی۔ وہ خود کو کچھ خالی خالی محسوس کرتے رہتے تھے۔

آخر انہوں نے اس آواز سے پوچھا۔ "اے آواز! مجھے بتا کہ میں جس منزل کی تلاش میں ہوں، اسے کب پاؤں گا۔ وہ مجھے کب ملے گی؟"

جواب میں جو آوازیں سنائی دیں، انہوں نے کلیم اللہ کو مطمئن نہیں کیا۔ یہ ان بزرگ کے پاس گئے اور ان سے پوچھا۔ "حضرت! میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ایک ایسا مشغلہ دیا جس سے میں صوت لایزالی سن سکا۔ لیکن اب میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ یہ آواز میری راہنمائی نہیں کر رہی۔ مجھے میری منزل کا پتا نہیں دے رہی۔"

بزرگ نے ان کے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا اور جواب دیا۔ "میرے بچے! تو مایوس نہ ہو، انتظار کر، وقت کا انتظار۔ اللہ نے چاہا تو وہ وقت بہت جلد آ جائے گا جب تجھے اپنی منزل کا پتا چل جائے گا۔"

کلیم اللہ نے کہا۔ "بزرگوار! میں ان لوگوں میں سے نہیں ہوں جو قناعت کر لیتے ہیں۔ میں مادی اور دنیاوی معاملات میں تو قناعت اختیار کر سکتا ہوں مگر دینی اور روحانی معاملات میں نہیں۔ خدا کے لیے بتائیے کہ مجھے میری منزل کب ملے گی؟"

اس سوال کا جواب ان بزرگ کے پاس بھی نہیں تھا۔ وہ لاجواب ہو کر چپ ہو گئے۔

آپ نے کہا۔ "اچھا پھر میں چلا۔"

بزرگ نے پوچھا۔ "کہاں؟"

آپ نے جواب دیا۔ "وہاں، جہاں میرے سوال کا جواب ملے گا۔"

آپ نے اپنے شوق اور طلب میں کسی شے کو بھی آڑے نہیں آنے دیا۔ باپ نے یہ رنگ جو دیکھا تو سکوت اختیار کیا۔ کسی بھی جگہ مخالفت نہیں کی۔ آپ نے اپنے سینے میں ایک آگ سی لگی محسوس کی۔ یہ آگ انہیں آوارہ و سرگرداں رکھتی۔ کسی جگہ قرار ہی نہ آتا تھا۔

ایک دن آپ نے چند لڑکوں کے ساتھ ایک خوب صورت ترین لڑکا دیکھا۔ یہ لڑکا اپنے ساتھیوں سے الگ ہی نظر آتا تھا۔ کلیم اللہ نے اس لڑکے کو دیکھا تو بس دیکھتے ہی رہ گئے، فرمایا۔ "سبحان اللہ! کیا حسن پایا ہے اس لڑکے نے۔"

لڑکوں نے دیکھا کہ ایک سادہ لوح جوان انہیں برابر دیکھے جا رہا ہے تو ان میں سے ایک نوجوان آپ کے پاس آیا اور پوچھا۔ "کیوں جناب! ذرا یہ تو بتائیں کہ ہم لڑکوں میں ایسی کیا بات ہے کہ تم اسی طرف دیکھے جا رہے ہو؟"

آپ نے جواب دیا۔ ”یہ کس بے وقوف نے کہہ دیا تم سے کہ میں ان لڑکوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں صرف ایک لڑکے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ خوب صورت حسین ترین لڑکا۔ جس کا دور دور تک کوئی ثانی نہ ہوگا۔“

ایک نے پوچھا۔ ”جناب والا! آپ صحیح الدماغ تو ہیں؟“

آپ نے فرمایا۔ ”کیا تجھے اس پر شبہ ہے کہ میں صحیح الدماغ ہوں؟“

لڑکے نے کہا۔ ”اگر تم صحیح الدماغ ہوتے تو اس حسین ترین لڑکے کے بارے میں یوں بے حیائی سے بات نہ کرتے۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو یہ کس قسم کی باتیں کر رہا ہے؟“

ایک دوسرے لڑکے نے جب یہ دیکھا کہ بات بڑھ رہی ہے اور یہ کوئی رنگ اختیار کر جائے گی تو وہ درمیان میں آ گیا اور اپنے ساتھی کو پیچھے ہٹا کر کلیم اللہ سے پوچھا۔ ”ہاں، تم کیا پوچھ رہے تھے مجھ سے پوچھو۔“

آپ نے پوچھا۔ ”وہ تم میں جو خوب صورت ترین لڑکا ہے، وہ کون ہے؟“

لڑکے نے جواب دیا۔ ”وہ کھتری قوم کا لڑکا ہے۔ اس سے تمہیں کیا کام ہے؟“

آپ نے کہا۔ ”اس سے میرا کام تو کوئی بھی نہیں مگر وہ مجھے اچھا لگتا ہے۔“

لڑکے نے کہا۔ ”مجھ سے یہ بات کہہ دی تم نے مگر کسی اور سے ہرگز نہ کہنا کیونکہ کھتری قوم تمہاری جان لے لے گی۔“

آپ نے فرمایا۔ ”تو معلوم نہیں کیا کہہ رہا ہے۔ میں یہ کہہ رہا ہوں کہ وہ لڑکا مجھے اچھا لگتا ہے اور تو کچھ اور سمجھ رہا ہے۔“

لڑکے نے واپس جاتے ہوئے کہا۔ ”میں کیا سمجھ رہا ہوں اور دوسرے کیا سمجھیں گے، بس ختم کرو ان باتوں کو اور اپنے گھر واپس جاؤ۔“

آپ نے جواب دیا۔ ”میں تو نہیں کھڑا ہوں۔ تم اپنے اپنے گھر جا سکتے ہو۔“

وہ لڑکا واپس چلا گیا۔ اس نے لڑکوں سے معلوم نہیں کیا بات کی کہ وہ اسی وقت چلے گئے۔

آپ کو ان کے چلے جانے کا بے حد افسوس ہوا۔ آپ اس کھتری زادے سے باتیں کرنا چاہتے تھے مگر نہ کر سکے۔ وہ کچھ دیر گم صم کھڑے سوچتے رہے پھر وہاں سے چل دیے۔

اس کے بعد انہوں نے اس کھتری زادے کو کئی دن تلاش کیا مگر وہ کہیں نظر نہ آیا۔ ان کا کہیں دل ہی نہ لگتا تھا۔ ان کی پریشانی کو دوسرے بھی محسوس کر رہے تھے۔ گھر والوں نے پوچھا۔ ”کلیم اللہ! تم پریشان پریشان، کھوئے کھوئے نظر آتے ہو۔ آخر کیوں؟“

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ ”مجھے نہیں معلوم کیا ہو گیا ہے۔ میرا دل کوئی مسلتا رہتا ہے اور میرا سکون ختم ہو چکا ہے۔“

خاندان کے کسی بزرگ نے انہیں مشورہ دیا۔ ”برخوردار! اگر تم ہمیں نہیں بتانا چاہتے تو کوئی بات نہیں۔ یہاں ایک مجذوب رہتے ہیں شہر کے شرقی حصے میں۔ تم ان کے پاس چلے جاؤ۔ ان کے لیے کچھ لیتے جاؤ۔ اگر وہ مجذوب تمہاری چیز قبول کر لیں تو اس کا یہ مطلب ہوگا کہ تم جو کچھ چاہتے ہو، وہ مقصد حاصل ہو جائے گا۔ اگر نہ قبول کریں تو یہ سمجھ لینا کہ کام نہیں بنے گا۔“

کلیم اللہ الجھن میں پڑ گئے۔ آپ اب یہ سوچ رہے تھے کہ اگر وہ اس مجذوب کے پاس جائیں تو کیا خیال، کیا مقصد لے کر جائیں؟ اسی فکر میں کافی وقت گزارنے کے بعد آپ نے بازار سے ریوڑیاں خریدیں اور ان مجذوب کے پاس روانہ ہو گئے۔ آپ نے دیکھا وہاں ایک ہجوم تھا۔ آپ ایک طرف اس انتظار میں بیٹھ گئے کہ اپنی باری آئے تو جائیں۔ ابھی انہیں بیٹھے ہوئے دو ساعت بھی نہیں گزرے تھے کہ ان مجذوب نے آواز دی۔ ”کلیم اللہ! وہاں کہاں بیٹھ گیا۔ آجا میرے پاس آ۔ میرے قریب آ۔“

کلیم اللہ پکار سن کر ان مجذوب کے پاس گئے اور دست بستہ سلام عرض کیا۔

انہوں نے سلام کا جواب دیا اور پوچھا۔ ”تو میرے پاس آیا ہے تو وہ ریوڑیاں کہاں رکھ دیں جو تو نے میرے لیے خریدی تھیں؟“

کلیم اللہ نے وہ ریوڑیاں ان کی طرف بڑھا دیں اور جواب دیا۔ ”حضرت! جو چیز آپ کے لیے خریدی گئی ہے، وہ آپ ہی کی خدمت میں پیش کی جائے گی۔ یہ لیجیے اپنی ریوڑیاں۔“

مجذوب نے ریوڑیاں لے لیں اور انہیں کھانے لگے۔

کچھ دیر بعد کلیم اللہ نے ان سے پوچھا۔ ”کیا میں



جاسکتا ہوں؟“

ان مجذوب نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اب ان کا حال کچھ ایسا تھا گویا وہ اپنے ہوش ہی میں نہ ہوں۔

کلیم اللہ نے دوبارہ پوچھا۔ ”حضرت! میں پوچھ رہا ہوں کہ کیا میں چلا جاؤں؟“

مجذوب نے بڑبڑانا شروع کر دیا۔ ”لوگ میرے پاس آتے ہیں تو کچھ پوچھ کر آتے ہیں۔ منہ اٹھایا اور چلے آئے۔ تو اب کیا ہے، اسی طرح منہ اٹھاؤ اور واپس چلے جاؤ۔ مجھ سے کیوں پوچھتے ہو۔“

کلیم اللہ کو اجازت مل چکی تھی۔ وہ اٹھے اور واپس چلے آئے۔ وہ جیسے ہی باہر نکلے، انہوں نے کھتری زادے کو باہر کھڑے دیکھا۔ اس نے آپ کو دیکھتے ہی کہا۔ ”جناب! میں آپ کا بہت دیر سے انتظار کر رہا تھا۔“

آپ اس کو دیکھ کر پریشان ہو گئے، پوچھا۔ ”تو میرا کیوں انتظار کر رہا تھا؟“

کھتری زادے نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کیوں انتظار کر رہا تھا۔ بس یہ سمجھیے کہ میں گھر میں بیٹھا تھا کہ کسی نے مجھے حکم دیا کہ اٹھ اور مجذوب کے در پر پہنچ جا۔ وہاں کوئی تیرا منتظر ہے۔“

کلیم اللہ اس کو ساتھ لے کر ایک درخت تلے بیٹھ گئے، پوچھا۔ ”اس دن جب میں نے تجھے پہلی بار دیکھا تھا تو کیا تو نے بھی کچھ محسوس کیا تھا؟“

کھتری زادے نے جواب دیا۔ ”پتا نہیں کیا بات ہے کہ میں خود بھی اس دن سے بہت پریشان ہوں۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اگر میں اس وقت تجھ سے یہ کہہ دوں کہ مجھے تیری ضرورت نہیں، واپس چلا جا تو، تو کیا کہے گا؟“

کھتری زادے نے افسردگی سے جواب دیا۔ ”میں کیا جواب دوں گا۔ میں افسوس کروں گا کہ مجھے ذلیل کر کے رخصت کر دیا جبکہ میں یہاں آیا بھی خود اپنی مرضی سے تھا۔“

آپ نے فرمایا۔ ”اس وقت مجھے افسوس تو اسی بات کا ہے کہ تو مجھے تلاش کیے بغیر ہی مل گیا۔ میرے دل میں تیری قدر اس وقت ہوتی جب میں تجھے تلاش کرتا اور تو مجھے بہ مشکل ملتا لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا۔“

کھتری زادے نے پوچھا۔ ”پھر میرے لیے کیا حکم ہے؟ میں ٹھہر جاؤں یا چلا جاؤں؟“

آپ نے جواب دیا۔ ”ٹھہرنے کا کوئی کام نہیں۔ تو جاسکتا ہے۔“

کھتری زادہ ملول اور افسردہ اٹھ کر چلا گیا۔ آپ اپنے گھر چلے گئے۔ آپ نے شام تک کا وقت بہت کرب میں گزارا۔ پوری رات بے چینی میں گزری۔ آپ کو کھتری زادے سے قربت ہو گئی تھی۔ دوسرے دن صبح ہوتے ہی آپ مجذوب کے پاس چلے گئے۔ وہاں وہی بھیڑ بھاڑ تھی۔ غرض مندوں نے مجذوب کو چاروں طرف سے گھیر رکھا تھا۔ کلیم اللہ کا خیال تھا کہ حسب سابق انہیں آواز دی جائے گی مگر ایسا نہیں ہوا اور صبح سے شام تک بیٹھے رہنے کے باوجود نظر انداز کر دیا گیا۔

تیسرے دن آپ پھر اسی مجذوب کے پاس چلے گئے۔ مجذوب نے انہیں دیکھا مگر نظریں چرا لیں۔

چوتھے دن پھر وہی واقعہ پیش آیا۔ ہاں پانچویں دن بھی یہ مجذوب کی خدمت میں پہنچ گئے۔ اس بار مجذوب نے انہیں پوری توجہ سے دیکھا اور پوچھا۔ ”کلیم اللہ! تو آتا ہے اور مجھ سے دور بیٹھ جاتا ہے۔ کیا میں اس کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟“

اس وقت مجذوب کو ہوش و حواس میں دیکھ کر کلیم اللہ کو بڑی خوشی ہوئی۔ آپ ان کے پاس چلے گئے اور پوچھا۔ ”آپ نے مجھے یاد فرمایا تھا؟“

مجذوب نے جواب دیا۔ ”ہاں، میں نے تجھے یاد کیا تھا۔ پہلے یہ بتا کہ تو ہر روز آتا ہے اور کہیں ادھر ادھر بیٹھ کر واپس چلا جاتا ہے۔ میں پوچھتا ہوں، تو ایسا کیوں کرتا ہے؟“

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ ”حضرت! سچی بات تو یہ ہے کہ نہ تو میں یہاں پوچھ کر آتا ہوں اور نہ پوچھ کر واپس جاتا ہوں اس لیے اس معاملے میں آپ کو شکایت نہیں ہونی چاہیے۔“

مجذوب کے ہونٹوں پر ہنسی آ گئی، کہا۔ ”کلیم اللہ! تو کیا ہے؟ یہ کیسی باتیں کر رہا ہے اس وقت تو۔ ذرا اپنے لفظوں اور جملوں پر غور تو کر۔“

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ ”میں کیسی باتیں کر رہا ہوں۔ مجھے تو کوئی انوکھی نازیبا اور رکیک بات معلوم نہیں دی۔ ویسے آپ کی کسی بات کی میں تردید بھی نہیں کر سکتا۔“

مجذوب اس وقت کلیم اللہ پر بے حد مہربان تھے۔ مجذوب نے کہا۔ ”اچھا، اب تو ایسا کر مجھے نیند آ رہی ہے۔ تو

رکھ کر سو جاؤں۔"

اس طرح بیٹھ جا، میں تیرے زانو پر سر رکھ کر سو جاؤں۔"

کلیم اللہ نے پوچھا۔ "آپ نے کچھ مجھ سے فرمایا؟"

مجذوب نے جواب دیا۔ "ہاں، میں تجھ سے ہی یہ کہہ رہا ہوں کہ تو میرے پاس اسی طرح بیٹھ جا کہ میں تیرے زانو پر اپنا سر رکھ کر سو جاؤں۔"

کلیم اللہ نے حکم کی تعمیل کی اور اس طرح بیٹھ گئے کہ مجذوب نے ان کے زانو پر سر رکھ دیا اور ذرا سی دیر میں خراٹے لینے لگے۔

کافی دیر بعد جب مجذوب کی آنکھ کھلی تو وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گئے اور کلیم اللہ سے پوچھا۔ "کیوں جی، میں کتنی دیر سویا ہوں تیرے زانو پر؟"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "بہت تھوڑی دیر۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ آپ بہت وقت لگائیں گے بیداری میں لیکن یہاں تو الٹا ہو گیا۔"

مجذوب نے پوچھا۔ "کیا الٹا ہو گیا؟"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "میری تو یہ خواہش تھی کہ آپ جلیں اور میں آپ کے زانو پر سر رکھ کر سو جاؤں۔"

مجذوب نے کلیم اللہ کو ڈانٹ دیا۔ "میں کہتا ہوں تجھ کو آخر ہو کیا گیا ہے۔ تو تو میرا دماغ خراب کر دے گا۔"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "میں آپ کا دماغ کیوں خراب کرنے لگا۔ دماغ تو آپ میرا خراب کریں گے؟"

مجذوب نے کہا۔ "مشکل تو یہ ہے کہ تو اپنے حالات اور واردات پر غور نہیں کرتا۔ ایک ذرا سے میرے سونے سے تیری دنیا ہی بدل گئی۔ اب تو پہلا جیسا نہیں رہا۔"

مجذوب کا یہ کہنا تھا کہ کلیم اللہ کو اپنے اندر آگ سی آگ محسوس ہوئی۔ ان کی حالت ہی غیر ہونے لگی۔

مجذوب نے انہیں اپنے پاس بٹھایا اور کہا۔ "کلیم اللہ! میں تیرے شوق سے واقف ہوں اور یہ بھی جانتا ہوں کہ تو کیا چاہتا ہے۔"

کلیم اللہ نے کہا۔ "اگر آپ میری ہر بات سے واقف ہیں تو پھر میں اپنی محرومیوں کا علاج کس سے چاہوں؟ میرے درد کا مداوا کون کرے گا؟"

مجذوب نے پوچھا۔ "تجھے اپنے اندر کیا محسوس ہو رہا ہے؟"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "آگ ہی آگ۔ میں اس آگ میں جلا جا رہا ہوں۔ میں اس آگ میں جھلسا جا رہا ہوں۔"

مجذوب نے کہا۔ "کلیم اللہ! اگر تم اسی قسم کی آگ چاہتے ہو تو اس کی میرے پاس کوئی کمی نہیں، بہت ہے لیکن یاد رکھو، اس تھوڑی سی آگ سے تمہارا کام نہیں ہو گا۔ اس آگ کے لیے مخصوص پانی درکار ہے۔ یہ پانی بھی تمہیں ملنا چاہیے۔"

کلیم اللہ نے پوچھا۔ "پھر یہ پانی کہاں سے ملے گا مجھے؟ اس پانی کے لیے مجھے کہاں جانا ہو گا؟"

مجذوب نے جواب دیا۔ "حجاز مقدس۔ وہاں تمہیں شیخ یحییٰ مدنی ملیں گے۔ یہ پانی ان سے ملے گا۔"

کلیم اللہ نے مایوس لہجے میں پوچھا۔ "حجاز مقدس۔ تو مجھے یہ دور دراز سفر بھی اختیار کرنا ہو گا؟"

مجذوب نے جواب دیا۔ "ہاں، اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ اپنے مزاج اور اپنی طبیعت میں اعتدال رکھو تو تمہیں حجاز مقدس ضرور جانا پڑے گا اور وہاں شیخ یحییٰ مدنی ہی تمہاری مدد کر سکیں گے۔"

کلیم اللہ اپنے گھر گئے اور مجذوب نے جو کچھ کہا تھا، اس پر عمل درآمد کی تدبیریں سوچنے لگے۔

کئی دن بعد آپ کسی کو کچھ بتائے بغیر حجاز مقدس روانہ ہو گئے۔ آپ کے سینے میں جو آگ روشن تھی وہ آپ کو کہیں بھی چین سے نہیں بیٹھنے دیتی تھی۔ آپ نے سورت سے حجاز کا سفر شروع کیا۔ مکہ معظمہ میں حاضری اور خانہ کعبہ کا غلاف پکڑ کر عرض کیا۔ "یا رسول اللہ! میں یہاں تک آ گیا ہوں۔ آپ جانتے ہیں کہ مجھے ایک مجذوب نے یہ بشارت دی کہ میرے سینے میں جو آگ روشن ہے، اس کو اعتدال میں رکھنے کے لیے پانی درکار ہے اور یہ پانی مجھے یہاں کے کسی یحییٰ مدنی سے ملے گا۔ اب میں انہیں کہاں تلاش کروں گا۔ آپ میری مدد فرمائیں۔"

مکے کے بعد کلیم اللہ مدینے روانہ ہو گئے۔

☆☆☆

مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ جاتے ہوئے ایک نخلستان میں قافلہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اس قافلے میں ہر قسم کے لوگ تھے۔ تاجر، سپاہی، کسان، ہنرمند، اہل علم۔ لیکن یہاں چند لوگ ایسے بھی تھے جہاں بڑی رونق تھی۔ یہ چند لوگ ایک خیمے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔ اس خاص خیمے میں ایک بزرگ کا قیام تھا۔ یہ بھی مدینہ منورہ تشریف لے جا رہے تھے۔ انہیں ان کے مریدوں نے ہر طرف سے گھیر رکھا تھا۔ یہ بزرگ انہیں ہدایتیں فرماتے اور انہیں بتاتے کہ یہاں جو کچھ ہے فریب ہے اور جو شخص اس فریب سے بچ گیا وہی

مرید جوان ہوئی دعا ہے۔ یہ کہہ کر ان کا مرشد کو پیچھے اللہ ہو گیا۔ وہ بولتے بولتے اچانک خاموش ہو گئے۔ ان کے مریدوں کے ہوش و حواس ہی اڑ گئے۔

ایک مرید نے مؤدبانہ عرض کیا۔ "حضور! آپ اچانک خاموش کیوں ہو گئے؟"

آپ نے کہا۔ "کیا تو میرا ایک کام کرے گا؟"

مرید نے فدویانہ انداز میں کہا۔ "آپ ایک کام کو کہہ رہے ہیں۔ میں تو آپ کے دس کام کر سکتا ہوں۔ آپ حکم دے کر تو دیکھیں۔"

آپ نے فرمایا۔ "مجھے آج ایک ایسے شخص سے ملاقات کرنا ہے جو میرا معتقد ہے اور میں اس کو اس لیے یاد کر رہا ہوں کہ وہ مجھے یاد کر رہا ہے۔"

ایک مرید نے پوچھا۔ "پھر جناب آپ نے بتایا نہیں کہ آپ کا مطلوب، حضور! شخص ہے کون؟"

آپ نے جواب دیا۔ "دیکھو! او انسان میری باتیں غور سے سن اور اس پر پورا عمل کر۔"

مرید نے عرض کیا۔ "آپ مکمل کر وضاحت فرمائیں کس کو لانے کے یہاں لانا ہے؟"

پیر نے جواب دیا۔ "تم تو قافلے کے شاہی حصے میں چلے جاؤ۔ وہاں لوگوں سے پوچھو کہ ہندوستان والے قافلے میں کوئی صاحب کلیم اللہ نامی تشریف رکھتے ہیں۔ بس تم اس شخص کو اپنے ساتھ لے آؤ۔"

سعادت مند مرید قافلے کے شاہی حصے میں چلا گیا۔ یہاں ہندوستانی زیادہ تھے۔ اس شخص نے با آواز بلند اعلان کیا۔ "کیا یہاں کلیم اللہ نامی کوئی صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

یہ آواز کلیم اللہ کے کان میں بھی پڑی لیکن انہوں نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی۔ انہیں خیال گزرا کہ یہاں ان کا جاننے والا کوئی ہے ہی نہیں۔ شاید یہ کوئی اور کلیم اللہ ہیں جنہیں آواز دی جا رہی ہے۔

اس شخص نے ایک بار پھر آواز دی۔ "کیا یہاں کلیم اللہ صاحب تشریف رکھتے ہیں؟"

کلیم اللہ نے پھر کوئی توجہ نہیں دی۔ وہ شخص کئی آوازیں دے کر واپس چلا گیا اور اپنے پیر مرشد سے کہہ دیا۔ "حضور! وہاں اس نام کا کوئی بھی شخص نہیں ہے۔"

پیر مرشد نے کہا۔ "ایسا نہیں ہو سکتا۔ تم غلط کہتے ہو۔"

مرید نے اصرار کیا۔ "حضرت! میں نے ایک نہیں کئی آوازیں دی ہیں اور میری آواز وہاں ہر شخص نے سن لی۔ اگر اس نام کا کوئی شخص وہاں ہوتا تو ضرور جواب دیتا۔"

پیر نے کہا۔ "اچھا تو ایک بار اور جا اور اس طرح اعلان کر۔ میں کلیم اللہ جہاں آبادی سے مخاطب ہوں۔ براہ کرم وہ میرے پاس آ جائیں تاکہ میں انہیں اپنے پیر کے پاس لے جاؤں۔"

وہ مرید واپس گیا اور اسی طرح اعلان کرنے لگا۔

اب کلیم اللہ کا شبہ دور ہو چکا تھا۔ وہ فوراً اپنے دوستوں سے جدا ہو کر اس آواز پر اس مرید کے پاس پہنچے اور کہا۔ "میرا نام ہی کلیم اللہ جہاں آبادی ہے۔ کہو، کیا کام ہے مجھ سے؟ میں حاضر ہوں۔"

مرید نے کہا۔ "بھائی میرے! ابھی کچھ دیر پہلے بھی میں یہاں آیا تھا اور آوازیں لگا کر چلا گیا۔ تم اس وقت کیوں خاموش رہے تھے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میں نے سوچا، یہاں میرا جاننے والا ہے ہی کون؟ کوئی اور ہوگا میرا ہم نام جسے پکارا جا رہا ہے۔"

مرید نے کہا۔ "اچھا تو اب چلیے میرے ساتھ۔ آپ نے تو خاموش رہ کر مجھے پریشان کر دیا۔"

کلیم اللہ نے کہا۔ "وہی سوال اس وقت بھی میرے دل و دماغ میں کھٹک رہا ہے کہ آخر میرا جاننے والا یہاں کہاں سے آ گیا؟"

مرید نے مسکرا کر جواب دیا۔ "وہ کچھ بھی کہیں، مجھے جو حکم دیا گیا ہے، میں اسے پورا کر کے رہوں گا۔ اب آپ مل چکے ہیں اس لیے میرے ساتھ چلیں اور دیکھیں کہ میرا پیر کتنا شاندار اور روشن ضمیر ہے۔"

کلیم اللہ نے کہا۔ "تو کہتا ہے تو میں چلا چلتا ہوں۔ خدا ہم دونوں پر رحم فرمائے۔"

مرید انہیں اپنے پیر کے پاس لے گیا۔ پیر نے انہیں دیکھا تو مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "آؤ کلیم اللہ! تم اتنے بے نیاز ہو گئے ہو کہ کسی کی آواز پر کان ہی نہیں دھرتے۔ آخر ایسا کیوں ہے؟"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "پیر مرشد! بات صرف اتنی سی ہے کہ میں خود کو یہاں گمنام آدمی سمجھتا ہوں چنانچہ جب میرے نام کی آواز پڑی تو میں نے اس پر کوئی توجہ ہی نہیں دی۔"



پیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "جب تو ہندوستان سے چلا تھا تو مجھے مطلع کر دیا گیا تھا۔"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "اگر یہ بات تھی تو تمہیں مجھے تلاش کرنا چاہیے تھا۔"

پیر نے کسی جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور کلیم اللہ سے پوچھا۔ "کیا تو مجھ سے واقف ہے؟"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "نہیں، میں آپ کو نہیں جانتا کیونکہ ابھی تک تعارف تو ہوا ہی نہیں۔"

پیر نے کہا۔ "مجھے یحییٰ مدنی کہتے ہیں۔ مجھے ایک عرصے سے تیری تلاش تھی۔ آج میں بہت خوش ہوں کہ تو مجھے مل گیا۔"

اس تعارف نے کلیم اللہ کو بے قابو کر دیا۔ وہ اپنے پیر مرشد کے قدموں میں گر گئے اور سسکیاں لے لے کر رونے لگے۔

یحییٰ مدنی نے انہیں اٹھا کر اپنے سینے سے لگایا اور فرمایا۔ "تو روتا کیوں ہے؟ اپنے جذبات پر قابو کیوں نہیں رکھتا؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "میں روتا کیوں ہوں آپ مجھ سے یہ نہ پوچھیں بلکہ اس پر حیرت کریں کہ میں مارے خوشی کے مر کیوں نہیں گیا۔"

یحییٰ مدنی نے پوچھا۔ "اس مجذوب نے تیرے سینے میں آگ سی لگا دی تھی۔ اب اندر کا کیا حال ہے؟"

کلیم اللہ نے اب جو اپنے بارے میں غور کیا تو یہ محسوس کر کے حیران رہ گئے کہ اب اندر کی آگ میں حدت نہیں تھی۔

یہاں سے یہ لوگ مدینہ منورہ کی طرف چل دیے۔ کلیم اللہ ہر روز اپنے آپ میں کچھ غیر معمولی سا تغیر محسوس کرتے۔ یہاں تک کہ مدینہ میں داخل ہونے سے پہلے ان لوگوں نے رباط عامر نامی عمارت میں قیام کیا۔

کچھ دیر بعد کلیم اللہ نے کھڑے ہو کر بے چینی سے کہا۔ "حضرات! براہ کرم آپ لوگ جتنی جلدی اس عمارت کو چھوڑ دیں تو بہتر ہوگا۔ آپ لوگوں کے لیے بہتر قیام و طعام کا بندوبست کیا گیا ہے یہاں، یہی سوچ کر باہر نکل چلیں۔"

چنانچہ رباط عامر کو اسی وقت خالی کر دیا گیا۔ اس کا خالی ہونا تھا کہ اس کے در و دیوار ہلنے لگے۔ زلزلے کے جھٹکے تو نہ تھے۔ ایسا لگتا تھا ہر چیز زمین بوس ہو جائے گی۔

یحییٰ مدنی نے رباط عامر کے کھنڈر کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔ "کیا بات ہے کلیم اللہ! کیا یہ بات تم کو پہلے ہی سے معلوم تھی کہ رباط عامر کے در و دیوار زمین بوس ہونے والے ہیں؟"

کلیم اللہ نے جواب دیا۔ "پیر مرشد! مجھے خود نہیں معلوم کہ میں نے اچانک رباط عامر کو کیوں خالی کرا لیا تھا۔"

یحییٰ مدنی نے انہیں اپنے پاس ہی رکھ لیا اور انہیں تربیت دینے لگے۔

انہوں نے کلیم اللہ کو اپنا مرید کر لیا اور ان کے لیے خاص لباس سلوایا اور اس لباس کو پہنانے کے بعد انہیں اپنا خلیفہ نامزد کر دیا۔ کلیم نے اپنے پیر مرشد سے پوچھا۔ "اب مجھے کیا کرنا ہوگا؟"

یحییٰ مدنی نے جواب دیا۔ "اب یہاں کا کام ختم ہو گیا۔ تم ہندوستان واپس جاؤ اور اپنے دین اسلام کو سر بلند رکھو۔"

کلیم اللہ دہلی واپس آ گئے۔ ان کا آبائی مکان خالی ہو چکا تھا کیونکہ سبھی اللہ کو پیارے ہو چکے تھے۔ آپ نے اپنے مکان کو کرائے پر اٹھا دیا۔ اس مکان کا کرایہ ڈھائی روپے ماہانہ ملنے لگا اور آپ خود جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیان ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگے۔ اس مکان کا کرایہ آٹھ آنے مہینا تھا۔

آپ نے شادی کر لی اور تبلیغ و اشاعت اسلام کا کام شروع کر دیا۔

یہ فرخ سیر کا زمانہ تھا۔ یہ مغل بادشاہ آپ کا بے حد معتقد تھا۔ اس نے آپ کی عسرت اور اسلام کی تبلیغ و اشاعت کے پیش نظر کئی بار کوشش کی کہ آپ کو جاگیر دے دے لیکن آپ نے ہر بار انکار کر دیا۔

ان کے علم اور زہد و تقویٰ کا پورے ملک میں چرچا تھا۔ جب آپ وعظ فرماتے تو فصاحت و بلاغت کا دریا بہنے لگتا اور لوگ مسحور ہو جاتے۔ طبیعت میں صفائی اتنی زیادہ تھی کہ نہ تو خود میلے کپڑے پہنتے اور نہ ہی محفل میں گندگی پسند فرماتے۔ آپ بہت بڑے عالم بھی تھے اور قطب زمانہ بھی۔ ہر روز صبح غسل فرماتے۔ نماز پابندی سے ادا فرماتے اور نفل بہت زیادہ پڑھتے۔ پوری پوری رات عبادت میں گزر جاتی۔

آپ نے تبلیغ و اشاعت اسلام کی خاطر جو خطوط لکھے ہیں، وہ بے مثل ہیں۔ ایک بار اپنے مشہور زمانہ مرید اور

خلیفہ حضرت نظام الدین اورنگ آبادی کو خط میں لکھا۔
"اور دوام خلق موجب شکر الٰہی ہے۔ جتنا اژدہام خلق زیادہ ہوگا، اتنا ہی خداوند تعالیٰ کا شکر زیادہ کرنا چاہیے۔ رجوع خلائق محض خداوند تعالیٰ کا فضل و کرم ہے۔ اس سے تنگ نہیں ہونا چاہیے کیونکہ یہ دولت ہر ایک کو حاصل نہیں ہے۔"

آپ کے ایک مرید نے پوچھا۔ "پیر مرشد! ہمیں جو فتوحات حاصل ہوتی ہیں، ان کا مصرف کیا ہونا چاہیے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "ان کو فقراء میں خرچ کردینا چاہیے۔"
مرید نے مزید استفسار چاہا، پوچھا۔ "کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فتوحات نہیں آتیں۔ اس صورت میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟"
آپ نے فرمایا۔ "جس دن فتوحات نہ آئیں، اس دن کو غنیمت تصور کرنا چاہیے کیونکہ فقر و فاقہ میں عظیم تاثیر ہوتی ہے۔"
کسی نے پوچھا۔ "حضرت! یہ وصل کا کیا مفہوم ہوتا ہے؟"
آپ نے جواب دیا۔ "وصل عبارت ہے، جملہ اشیاء سے ترک تعلق کرلینا اور کسی چیز کی طرف التفات نہ کرنا۔ بے رنگی محض میں گم اور ہلاک ہوجانا۔"
آپ کے پاس ایک مرید منہ لٹکائے ہوئے حاضر ہوا۔ وہ بہت دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔ وہ کچھ کہنا بھی چاہتا تھا مگر سب کے سامنے کہا بھی نہیں جاتا تھا۔ آخر آپ اس کی پریشانی کو بھانپ گئے اور اس سے پوچھا۔ "تو مجھے بھوکا معلوم ہوتا ہے۔"
اس نے جواب دیا۔ "جی، میں بہت زیادہ بھوکا ہوں۔"
آپ نے اپنے ایک مرید کو حکم دیا۔ "اسے اندر لے جاؤ اور خوب شکم سیر ہوکر کھانا کھلادو۔"
جب یہ دونوں اندر چلے گئے تو ان دونوں کے پیچھے پیچھے خود بھی پہنچ گئے۔ آپ نے کھانا کھاتے ہوئے مرید سے آہستہ سے پوچھا۔ "ہاں، وہاں سب کے سامنے تو کچھ نہیں پوچھ سکتا تھا مگر اب معلوم کرنے آیا ہوں کہ تجھے کون سی پریشانی لاحق ہوگئی ہے؟"
اس نے جواب دیا۔ "حضرت! میں نے امرود کا باغ لگایا تھا۔ میں نے ان کی دیکھ بھال میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی مگر ادھر کچھ دنوں سے اس کے کئی درخت سوکھ گئے اور سوکھتے جارہے ہیں۔ میں خوفزدہ ہوں کہ اگر اسی طرح پورا باغ خشک ہوگیا تو کیا ہوگا۔ میں تو برباد ہوجاؤں گا۔"
آپ نے اپنے حقے کا پانی اس کو دے دیا اور کہا۔ "اس پانی کو خشک ہونے والے درختوں کی جڑوں میں ڈال دے۔ وہ پھر سے سرسبز و شاداب ہوجائیں گے۔"
وہ مرید حقے کا پانی لے کر چلا گیا اور اس پر شاندار طریقے سے عمل کیا اور اتنا ہی شاندار اس کا نتیجہ برآمد ہوا۔
چند مریدوں نے آپ سے کہا۔ "حضرت! ہمیں اپنے اقوال زریں مرحمت فرمائیں۔ انہیں ہم محفوظ کرلیں گے اور ان کی نقلیں ادھر ادھر پھیلادیں گے۔"
آپ نے فرمایا۔ "لکھو، معرفت کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ ایک علمی، دوسری حالی۔
لکھو، توحید کے چار مرحلے ہیں۔ ایک توحید ایمانی، دوسری توحید علمی، تیسری توحید حالی، چوتھی توحید الٰہی۔
لکھو، محبت ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر دنیا میں ایمان و عمل کی صحت اور سقم کا دارومدار ہوتا ہے اور آخرت مجازات کا حصہ ہے۔
لکھو، اس چیز کا گم کرنا فقر ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ڈھونڈی جاتی ہے۔
اپنے تمام امور کو نسیان کے ہاتھ میں سونپ دینا توکل ہے۔"
آپ نے اپنے ایک مرید کو ذکر و فکر کی بابت بتایا۔
"اے عزیز! ذکر و فکر حاصل کرنے میں اپنی ساری امت اور تمام اوقات صرف کردے اور ایک لمحہ اور ایک ساعت بھی ایسی چیز کی طرف مشغول اور مصروف نہ ہو جو تیرے لیے ذکر و فکر حاصل کرنے میں مخل انداز ہو۔"
آپ کی شہرت شاہی محلات سے فرماں روا کے جھونپڑوں تک پہنچی ہوئی تھی اور جس کو بھی آپ کی ضرورت پیش آتی تھی، بھاگا بھاگا چلا آتا تھا۔
ایک سال بارش نہیں ہوئی۔ عوام اور خواص دعاؤں میں مشغول ہوگئے لیکن کسی کی بھی دعا باب اجابت تک نہیں پہنچی۔ آخر علمائے عصر نے آپس میں یہ طے کیا کہ چلیے کلیم اللہ کی خدمت میں چلیں اور ان سے دعا کا تقاضا کریں۔ چنانچہ یہ لوگ آپ کی خدمت میں پہنچے اور مدعائے دل بیان کردیا۔
آپ نے فرمایا۔ "دلی میں ایک سے ایک بزرگ موجود ہے پھر تم مجھے ہی کیوں پریشان کرتے ہو؟"
ایک عالم نے جواب دیا۔ "نہیں جناب! ہم تو آپ کے قائل ہیں۔ آپ کی عظمت، آپ کی بزرگی اور آپ کے طرز زندگی کے نہ صرف قائل بلکہ مداح ہیں اور ہم اپنے قیاس اور اندازے سے بتاسکتے ہیں کہ آج اس ملک میں آپ جیسا کوئی بھی نہیں۔"
کلیم اللہ نے شرمندگی سے اپنا سر جھکالیا اور کہا۔ "آپ لوگ میرے نفس کو سرکشی کا سبق دے رہے ہیں۔ یہ اچھی بات نہیں۔"
ایک عالم نے کہا۔ "حضرت! کیا آپ جانتے ہیں کہ ہم یہاں کیوں آئے ہیں؟"
آپ نے فرمایا۔ "دلوں کا حال خدا جانتا ہے لیکن ابھی ابھی آپ ہی میں سے کسی نے یہ بتایا تھا کہ بارش نہیں ہورہی اس کے لیے دعا کرنی ہے۔"
لوگوں نے یک زبان کہا۔ "بے شک ہماری دعائیں بیکار گئیں۔ اب آپ ہی کچھ کیجیے۔"
آپ نے فرمایا۔ "تو تم سب میرے ساتھ دعا میں شریک ہوجاؤ۔ معلوم نہیں خدا کس کی دعا قبول کرلے۔"
ایک عالم نے کہا۔ "ہماری دعائیں تو بیکار گئیں۔ اب آپ ہی کی دعا کارگر ہوگی۔ آپ دعا مانگیں اور ہمیں اس دعا کا اثر دیکھنے دیں۔"
آپ اپنے حجرے سے باہر نکلے اور آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے فرمایا۔ "خدایا! اپنے بندوں پر رحم فرما۔"
اتنا کہہ کر آپ دوبارہ حجرے میں چلے گئے۔
لوگوں نے اپنے دلوں میں سوچا کہ یہ کیسی دعا ہے۔ شاید کلیم اللہ نے انہیں ٹال دیا ہے۔
ایک عالم نے کہا۔ "حضرت! ٹھیک طرح سے دعا فرمائیں۔ بھلا یہ بھی کوئی دعا ہوئی۔"
آپ نے فرمایا۔ "اس کو میری دعا قبول کرنی ہے تو میری اتنی ہی دعا کافی ہے۔"
کسی اور نے کہا۔ "لیکن اس دعا میں بارش کا تو ذکر ہی نہیں۔"
آپ نے جواب دیا۔ "خدا عالم الغیب ہے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ میں کیا چاہتا ہوں۔"
لوگ ابھی بحث میں پڑے تھے کہ معلوم نہیں کدھر سے بادل آئے اور بارش شروع ہوگئی۔ اس بارش سے کچھ لوگ بھیگنے لگے۔ آپ نے ان سے کہا۔ "آپ لوگ باہر کیوں کھڑے ہیں؟ بھیگ جائیں گے۔ اندر آجائیں۔"
اس بارش نے لوگوں کے دلوں میں ایک ہنگامہ، ایک انقلاب برپا کردیا۔ وہ آپ کے قدموں میں گر گئے۔

☆☆☆

آپ کے اوراد و وظائف بہت مشہور ہیں۔ ایک بار آپ سے کسی نے پوچھا۔ "حضرت! میری ایک حاجت ہے۔ میں کس طرح دعا مانگوں کہ میری وہ حاجت پوری ہوجائے؟"
آپ نے فرمایا۔ "پہلے چند نفلیں پڑھ لے اس کے بعد گوشے میں بیٹھ کر اپنے ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھادے اور سو بار "یارب یارب" کا ورد کر پھر جو دعا مانگے گا، پوری ہوگی۔ اگر تو ہزار بار یارب، یارب کہے گا تو کامیابی تجھے ہوجائے گی۔"
کسی دوسرے موقع پر آپ نے فرمایا۔ "اسی طرح اگر سو بار "اللہ اکبر، اللہ اکبر" کہہ کر کوئی دعا مانگے گا تو یہ دعا تعلق قبول کرلی جائے گی۔"
ایک دبلے پتلے سے آدمی نے آپ سے روزی کشادہ کرنے کی دعا جاننا چاہی، کہنے لگا۔ "حضرت! میں بہت پریشان ہوں، دعا کیجیے کہ میں آسودہ زندگی سے ہمکنار ہوجاؤں۔"
آپ نے فرمایا۔ "ہر روز صبح سو بار لاحول ولا قوۃ الا باللہ العظیم پڑھ کر دعا مانگ کر، پھر دیکھنا کہ دعا کس طرح قبول ہوتی ہے۔"
یہ باکمال ذات بعمر 81 سال 9 ماہ، 24 ربیع الاول 1142ھ کو رحلت فرما گئی۔ دلی میں جامع مسجد اور لال قلعے کے درمیان میں آپ کا مزار آج بھی مرجع خاص و عام ہے۔ دور دور سے لوگ آتے ہیں اور اپنی دل کی مرادیں پاکر واپس چلے جاتے ہیں۔

++

**حوالہ جات:**

دلی کے بائیس خواجہ، ڈاکٹر شارب۔ تاریخ صوفیائے چشت، ڈاکٹر خلیق نظامی۔
انوار الاصفیا، شعبہ تصنیف و تالیف شیخ غلام علی اینڈ سنز

دوسرے، تیسرے روز ان کے پاس آتا، محفل موسیقی کا اہتمام کرواتا اور بھرپور انعام و اکرام دے کر رخصت کر دیتا۔
ایک روز بشو کو میر جعفر کی جانب سے انفرادی ملاقات کے لیے طلب کیا گیا۔ واپسی کے بعد اس کا چہرہ سنجیدگی اور مختلف سوچوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔
"کیا بات ہے چا جی؟ کیا کہہ رہا تھا وہ بوڑھا گدھا؟" منی نے دریافت کیا۔
"وہ بوڑھا گدھا کسی لومڑی کی طرح مکار ہے میری بچی! اسے شاید اس بات کا احساس ستانے لگا ہے کہ وہ تم دونوں پر بہت زیادہ دولت لٹانے لگا ہے اس لیے تم سے بیاہ کا سندیسہ دیا ہے اس نے۔" بشو نے بتایا۔
"کیا؟ دونوں سے بیاہ؟ لیکن ان کے دھرم میں تو ایک سمے میں دو بہنوں سے بیاہ کیا ہی نہیں جاتا۔" ہو حیران ہوئی۔
"اگر یہ لوگ اپنے دھرم چلتے تو آج......" بشو نے طنز کرتے ہوئے فقرہ ادھورا چھوڑا اور پھر کہنے لگا۔ "خیر چھوڑو!"
"تو آپ نے کیا جواب دیا ہے؟" منی نے استفسار کیا۔
"میں نے تو اسے یہی کہا کہ ہم کھانے کمانے والے لوگ ہیں۔ اپنے ہاتھ پاؤں کٹوا کر اس کے حوالے کر دیں گے تو کھائیں گے کیا؟ جواب میں وہ کہنے لگا کہ تمہاری بیٹیاں محل میں ملکہ بن کر رہیں گی۔ بنگال کے صوبے دار کا بہنوئی تمہارا سسر بننے والا ہے۔ اس سے بڑھ کر اور کیا چاہیے تمہیں؟"
منی اور ہو حیرانی سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔
بشو نے اپنا سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔
"میں نے اسے دھرم کے بارے میں بتایا کہ تم دونوں سے اکٹھا بیاہ کرے گا تو لوگ اس کے خلاف ہو جائیں گے اس لیے پہلے کسی ایک سے بیاہ کر لے پھر دوسری کے بارے میں وچار کرے۔ تو اسے میرا یہ مشورہ پسند آیا۔ اس نے منی سے بیاہ کی رضامندی دی ہے۔"
بشو کی یہ بات سن کر منی کے چہرے پر چمک در آئی۔ آنکھیں احساس تفاخر و غرور سے جگمگا اٹھی تھیں۔ میر جعفر اس شادی میں بالکل تاخیر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ منی کو ہر صورت اپنے حرم کا حصہ بنانا چاہتا تھا۔ دوسری جانب بشو کے ذہن میں اب ایک اور منصوبہ پروان چڑھنے لگا تھا۔

☆☆☆

ہو محل کے دریچے میں کھڑی افق کی وسعتوں میں نظریں جمائے کسی گہری سوچ میں گم تھی۔ اس کے چہرے پر افسردگی اور تکدر کے رنگ بھی نمایاں تھے۔ میر جعفر اور منی کی شادی طے ہو چکی تھی۔ اس بات نے ہو کے دل پر ٹھیس لگائی تھی۔ وہ حسن و جمال میں کسی بھی صورت منی سے کم نہ تھی۔ اس کے باوجود میر جعفر نے اسے اپنے حرم کا حصہ بنانے کا فیصلہ کر کے ہو کے نسوانی وقار کو چوٹ پہنچائی تھی۔ وہ کبھی بہن سے کسی قسم کے حسد میں مبتلا نہیں تھی البتہ چند روز مضطرب ہونے کا دکھ اسے بے کل کیے ہوئے تھا۔ بہترین پُرآسائش زندگی، کنیزوں کے جھرمٹ اور تعیشات کے خواب تو اس نے بھی کئی بار دیکھے تھے۔ اب یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہونے سے پہلے ہی ٹوٹ گئے تھے۔
ان خیالات میں غرق ہو کو اندازہ ہی نہ ہوا کہ بشو کس لمحہ اس کے عقب میں چلا آیا ہے۔
"کیا سوچ رہی ہو بچی؟" اس نے ملائمت سے دریافت کیا۔
"میرے ساتھ یہ انیائے (ناانصافی) کیوں چا جی؟" وہ بوجھل سے انداز میں بولی۔
"کیسا انیائے؟" اسے اچنبھا ہوا۔
"کیا میں اس قابل نہیں کہ کوئی نواب میری محبت میں گرفتار ہو سکے۔ مجھے سب کے سامنے اپنا سکے۔ مجھ پر اپنی چاہت نچھاور کر کے مہارانی بنا کر رکھ سکے۔" اس کا انداز مزید بوجھل ہوا۔
"ایسا کیوں سوچ رہی ہو؟ تم اس سے بھی کہیں زیادہ کی حق دار ہو۔" بشو نے پچکارا۔
"تو کیا اس لیے نواب میر جعفر نے میری بجائے منی کو بیاہ کے لیے چن لیا؟" وہ ہونٹ چباتے ہوئے بولی۔
ہو کے لیے اپنی دلی کیفیات کی ترجمانی اب بھی بہت مشکل ثابت ہو رہی تھی کہ اسے چاہنے اور چاہے جانے کی تمنا خلش میں مبتلا کیے ہوئے ہے۔ وہ اپنے جذبات دیوانہ وار کسی پر نچھاور کر دینا چاہتی ہے۔
"تمہارا بھاگیہ (قسمت) اس سے بھی زیادہ روشن ہو گا۔ میں تمہارے لیے ایک بندوبست کر آیا ہوں۔" وہ معنی خیزی سے بولا۔
ہو اپنی بادامی آنکھوں میں حیرت سموئے والد کو دیکھنے لگی۔ بشو دھیمی آواز میں کہنے لگا۔
"آج محفل رقص میں بنگال کا ولی عہد مرزا محمد آئے گا۔ اگر تم اسے لبھا لو تو قسمت مہربان ہو جائے گی۔"
"مرزا محمد کی تو ابھی کچھ سمے پہلے ہی شادی ہوئی ہے۔ وہ میری اور کیسے کھنچے گا؟" ہو کو مایوسی ہوئی۔
"وہ سب تم مجھ پر چھوڑ دو اور بس وہ کرتی جاؤ جو میں کہہ رہا ہوں۔ بہترین بناؤ سنگھار کرو۔ مرزا محمد پر اپنے حسن کی ایسی بجلیاں گراؤ کہ وہ دوبارہ ہوش میں نہ آ سکے۔" اس نے سمجھایا۔
ہو نے بد دلی سے سر ہلایا اور بناؤ سنگھار میں مصروف ہو گئی۔ اس شام میر جعفر نے محفل رقص کا خصوصی بندوبست کیا ہوا تھا۔ منی نے اپنے رقص سے اسے بے خود کر دیا۔ اسی اثنا میں مرزا محمد اور اس کے حفاظتی دستے کی آمد کا غلغلہ بلند ہوا۔ میر جعفر ڈھٹائی اور بے نیازی سے وہیں براجمان رہا۔ مرزا محمد محفل کا انداز، منی کی بے باکی اور میر جعفر کی ڈھٹائی دیکھ کر بیک وقت خفت و خلش محسوس کرنے لگا تاہم وہ اپنے مزاج میں غالب مروت اور جذبہ ہمدردی سے مجبور ہو کر اسے کوئی سخت بات نہ کہہ سکا۔
"کہیے مرزا محمد؟ کیسے آنا ہوا؟ اب آ ہی گئے ہو تو اس محفل رقص سے بھی لطف اندوز ہو۔ واللہ ایسا کمال کا رقص میں نے آج تک کہیں نہیں دیکھا۔" وہ سرور کے عالم میں کہنے لگا۔
"بس ایک مجبوری ہمیں یہاں لے آئی ہے۔ ولی عہد مقرر کرنے کے بعد نانا جان نے ہمیں آپ سے سپہ سالاری کی عملی تربیت حاصل کرنے کا حکم دے رکھا ہے۔ بس اسی تربیت کی چاہ میں یہاں چلے آئے تھے ہم لیکن یہاں تو رنگ ہی نرالے ہیں۔" وہ جز بز ہو کر بولا۔
"آپ بالکل درست جگہ اور درست وقت پر تشریف لائے ہیں صاحبزادے!" وہ شیرینی سے مخاطب ہوا۔ "تربیت کا اصل گہوارہ تو یہی ہے۔ ملکی اور جنگی امور میں سر کھپانے کے بعد فرحت و سکون یہیں ملتا ہے۔"
مرزا محمد میر جعفر کی اس بے باکی پر شدید اضطراب محسوس کرنے لگا۔ اس کے کچھ کہنے سے قبل بشو وہاں چلا آیا اور میر جعفر سے اجازت لے کر ولی عہد کی دل پشوری کا اہتمام کرنے لگا۔ اس کے دیکھتے ہی دیکھتے بشو نے ہو کو وہاں طلب کر لیا۔
وہ ایک انقلابی لمحہ تھا۔ ولی عہد کی دید نے ہو کو یکدم ہی وارفتگی میں مبتلا کر دیا تھا۔ مرزا محمد کا شخصی تاثر، متانت اور پُروقار انداز ایک ہی پل میں ہو کے دل میں گھر کر گیا۔ اس نے آداب محفل کے تحت میر جعفر کے روبرو سر جھکایا اور دونوں گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اس کے دائیں ہاتھ کو بوسہ دے دیا۔ اس کے بعد وہ اسی وارفتگی کے عالم میں آگے بڑھی اور مرزا محمد کے سامنے جا بیٹھی۔ مرزا محمد نے اضطراری طور پر اپنا ہاتھ بغل میں دبا لیا۔ ہو نے حیران کن تیز رفتاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے ولی عہد کا بایاں ہاتھ تھاما اور بوسہ ثبت کر دیا۔
مرزا محمد اس کے لمس کی حدت، عقیدت مندانہ انداز اور بے اختیاری پر دنگ تھا۔ ایسی بے خودی اس نے کبھی کہیں نہ دیکھی تھی۔ اسی بے اختیاری میں مرزا محمد نے اپنا ایک قیمتی ہار فضا میں اچھال کر ہو کی جانب بڑھا دیا جسے اس نے ماہرانہ انداز میں اپنی گرفت میں لے کر دلکش انداز میں سر تسلیم خم کر دیا۔ مرزا محمد اس ادا پر اپنا دل مزید گھائل محسوس کرنے لگا تاہم میر جعفر کی موجودگی اور اپنے ذاتی وقار نے اسے ضبط پر مجبور کیے رکھا۔
اس کے بعد منی اور ہو نے رقص کا شاندار مظاہرہ کیا۔ ہو نے اپنے رقص سے مرزا محمد کو ایک بار پھر بے خود ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس کی آواز کا سوز براہ راست دل پر اثر انداز ہو رہا تھا۔ مرزا محمد کو اپنا دل قطرہ قطرہ پگھلتا محسوس ہونے لگا۔
رقص کے اختتام پر میر جعفر نے اپنی منظور نظر منی کو بے بہا انعامات سے نوازا۔ ہو خاموشی سے ایک جانب کھڑی رہی۔ مرزا محمد کو اس پر ترس سا آنے لگا۔ بشو نے اس کی یہ کیفیت بھانپ لی اور شاطرانہ انداز میں کہنے لگا۔
"لگتا ہے شہزادہ محترم یہاں اپنی طبیعت پر جبر کیے بیٹھے ہیں۔ انہیں ہمارا رقص پسند نہیں آیا۔"
مرزا محمد اس کا مدعا سمجھ گیا اور متانت سے بولا۔
"ہماری یہاں آمد اس مقصد کے لیے نہیں ہوئی تھی۔ سر دست ہمارے پاس کچھ نہیں ہے۔ دل و دماغ میں شمشیر و سناں کا سودا سمایا ہے۔ پہلے وہ میدان سر کرنا ضروری ہے۔"
ہو کی نظریں ہنوز اسی پر مرکوز تھیں۔ وہ اس کی ہر ایک جنبش کو دل پر نقش کر رہی تھی۔ اس کی سماعت میں میر جعفر کے الفاظ پڑے جو معنی خیزی سے کہہ رہا تھا۔
"ہمارے ہوتے ہوئے خود کو تنہا کیوں محسوس کر

رہے ہیں شہزادہ محترم؟ ہمارے پاس جو کچھ موجود ہے وہ آپ کے نانا حضور کا ہی دیا ہوا ہے۔ ہم آپ کی جانب سے تحائف ادا کر دیں گے۔"

مرزا محمد خاموشی سے واپس ہو گیا۔ اس کی نظریں ہنوز ہو کے سراپا اور وارفتگی میں الجھی ہوئی تھیں۔ مرزا محمد کی یہ نظریں بزبان خاموشی ہو کو بہت کچھ سمجھانے لگیں۔

☆☆☆

میر جعفر نے منی سے شادی کر لی تھی۔ بہن کی رخصتی کے بعد ہو خود کو بہت تنہا محسوس کرنے لگی۔ کچھ روز اسی تنہائی اور مرزا محمد کی یادوں کی کشمکش میں بیت گئے پھر ضبط کا یارا نہ رہا تو ایک دن بشیراں کے ساتھ مرزا محمد کے پاس اس کے تحائف کا شکریہ ادا کرنے چل دی۔

مرزا محمد ایک زرکار منقش آبنوسی کرسی پر براجمان تھا۔ ہو اس کے سامنے گھٹنوں کے بل جھک کر بیٹھ گئی۔ بشیراں اس کے عقب میں قدرے فاصلے پر کھڑا تھا۔ ہو نے اس کے دونوں ہاتھ تھام کر اپنے لمس کی حدت ثبت کر دی۔ مرزا محمد ایک بار پھر بے اختیاری محسوس کرنے لگا اور اسی عالم بے خودی میں گویا ہوا۔

"تم دہلی چلی جاؤ۔"

"اس در سے اب میری آتما ہی جا سکتی ہے۔ شریر (جسم) تو کہیں بھی نہیں جائے گا۔" اس نے ایک بار پھر شہزادے کے ہاتھ پر بوسہ دیا۔

"وہاں مغل خاندان کے کئی شہزادے تمہارا ہاتھ تھامنے کے لیے تیار ہو جائیں گے۔" مرزا محمد نے نظریں چرا لیں۔

"یہ ہاتھ اب کسی قابل رہے ہی کہاں ہیں؟" ہو افسردہ ہوئی۔

"مرشد آباد میں تمہارے لیے کچھ نہیں رکھا۔" اس نے سمجھانا چاہا۔

"یہاں میرا سورگ (جنت) ہے۔" وہ برجستہ بولی۔

"ہم اپنی زوجہ سے بہت محبت کرتے ہیں۔" مرزا محمد نے اس سے زیادہ خود کو یاددہانی کروائی۔

"اور مجھے آپ کے اس پریم سے بھی پریم ہے۔"

اس برملا اظہار پر مرزا محمد دنگ رہ گیا۔ اسے یک لخت اپنا مقام و منصب یاد آ گیا تھا۔ صوبے داری اور ولی عہدی میں ایسے جذبات مہلک ثابت ہوا کرتے تھے۔ ہو کی نسوانی حس بھی اس کا گریز بھانپ گئی۔ اس کا دل یکدم بجھ گیا۔

"میں آپ کے لیے بوجھ بن کر نہیں رہنا چاہتی شہزادہ حضور! اگر کبھی میری کلاہ یاد آئے تو فوراً اپنی اس داسی کو یاد کر لیجیے گا۔" وہ افسردگی سے بولی۔

"تمہارا فن ہمیں بھولا ہی کب ہے؟" مرزا محمد نے بے ساختہ کہا۔

ہو یہ بات سن کر جھوم سی اٹھی۔ اس نے مخصوص اشارہ کر کے سازندوں کو بلوایا اور محبت کی سوزش میں سوختہ ہوتے ہوئے شاندار رقص کا مظاہرہ کیا۔ مرزا محمد بے خود ہو چکا تھا۔ رقص کے اختتام پر ہو ایک بار پھر اس کے قدموں میں آ بیٹھی۔

"مجھے میر جعفر سے بچا لیجیے شہزادہ محترم! میں اس کے حرم کا حصہ نہیں بننا چاہتی۔ مجھے اس سے شادی میں کوئی دلچسپی نہیں ہے۔" وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

"تم فکر نہ کرو! ہم میر جعفر سے نمٹ لیں گے۔ نانا جان سے کہہ کر ایک ہی پل میں اسے معزول کروا دیں گے۔" اس نے تسلی دی۔

"وہ شخص ایک فتنہ ہے شہزادہ محترم! اس کی مکاری بھانپنا بہت مشکل ہے۔ مجھے اس سے خوف محسوس ہوتا ہے۔" وہ مضطرب ہو کر کہنے لگی۔

مرزا محمد اس کے خدشات کو باطل قرار دے کر دلاسے دیتا رہا۔ اسے اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہو سکا کہ ہو سے ملاقات اور گفتگو کی ہر خبر من و عن میر جعفر تک پہنچائی جا چکی ہے اور اس نے جوابی طور پر مرزا محمد کو زک پہنچانے کا ایک منصوبہ بھی تیار کر لیا ہے۔

اسی شام وہ مرزا محمد کی رہائش گاہ پر پہنچا اور نہایت متانت و وقار سے لطف النساء کے سامنے مختلف امور پر بات چیت کا آغاز کر دیا۔ مرزا محمد بھی محتاط انداز میں تلے جوابات دیتا رہا۔ روانگی سے قبل میر جعفر نے بڑے اطمینان سے پوچھا۔ "ہو سے ملاقات کیسی رہی؟ اس کے رقص نے ذہنی تناؤ کافی حد تک دور کر دیا ہوگا؟"

مرزا محمد سے اس سوال کا فوری طور پر کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اس کے کچھ بھی کہنے سے قبل لطف النساء نے میر جعفر سے دریافت کیا۔ "کیا وہ بہت باکمال رقاصہ ہے؟"

اس سوال پر میر جعفر کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ رینگ گئی۔ وہ ملائمت سے کہنے لگا۔ "بے شک! اس کا رقص لاجواب ہے۔ وہ کسی کے بھی ہوش و خرد خاکستر کر سکتی ہے۔ کبھی کبھی ہمیں ایسا لگتا ہے کہ ان دونوں بہنوں کو مرہٹوں نے کسی خصوصی مقصد کے تحت یہاں بھیجا ہے۔ ہم نے اسی لیے منی سے شادی کر لی تاکہ ان کی چال انہی پر لوٹا سکیں۔"

میر جعفر کے اس انکشاف پر لطف النساء جز بز ہو کر رہ گئی۔ اس رات مرزا محمد اور لطف النساء میں بہت بحث ہوئی۔ یہ بحث تلخ کلامی اور پھر کئی روز تک ان بن میں ڈھلی رہی۔ انجام کار مرزا محمد نے ہو سے آئندہ ملاقات نہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

☆☆☆

ہو کے شب و روز نہایت افسردہ ہو چکے تھے۔ اس نے کئی دنوں سے مرزا محمد سے ملاقات نہیں کی تھی۔ پژمردگی دل کی گہرائی تک اپنے ڈیرے جما چکی تھی۔ اس نے محل میں کئی کنیزوں اور خواجہ سراؤں سے دوستی گانٹھ لی تھی۔ اس کی دلکش شخصیت اور پُر وقار اطوار یوں بھی ہر کسی کے لیے ناقابل مزاحمت تھے۔ اس پر مستزاد میر جعفر سے متوقع شادی کی خبروں نے بھی اس کی اہمیت میں اضافہ کر رکھا تھا۔ یہ کنیزیں اور خواجہ سرا انعام و اکرام کے لالچ میں اسے مطلوبہ معلومات فراہم کیا کرتے۔ اسے قدرے تاخیر سے ہی سہی لیکن میر جعفر کی مکارانہ حرکت کا بھی علم ہو گیا تھا۔

کچھ روز بعد اسے ایک اور معاملے کے بارے میں آگاہی ہوئی جس کے بعد اسے مرزا محمد کے گریز کا پس منظر قدرے سمجھ آنے لگا۔ اس کا مرزا محمد کی خالہ 'مہر النساء' سے غائبانہ تعارف ہوا جو ایک حسن پرست اور بے راہ رو عورت تھی۔ مہر النساء نے پہلے اپنے شوہر کے نائب 'حسین قلی خاں' سے ناجائز مراسم استوار کیے۔ مرزا محمد نے علی وردی خاں کی رضامندی سے حسین قلی خاں کا کام تمام کر دیا۔ اپنے محبوب کو آنکھوں کے سامنے قتل ہوتے دیکھنا مہر النساء کے لیے شدید جذباتی صدمہ تھا۔ اس نے مرزا محمد سے بھیانک انتقام لینے کی قسم اٹھائی تھی۔ مہر النساء کے کردار کے اس پہلو سے آگاہی کے بعد ہو کو اندازہ ہو گیا کہ مرزا محمد کی اصل ذہنی الجھن کیا ہے۔ وہ یقیناً ہو سے دانستہ طور پر گریز کر رہا تھا تاکہ اسے بھی مہر النساء کی طرح بے راہ رو یا بدکردار نہ سمجھا جائے۔ اس نکتے سے آگہی کے بعد وہ صبر و سکون سے وقت کا کسی نئے موڑ کا انتظار کرنے لگی۔

ہو کا یہ اندازہ درحقیقت بالکل درست تھا۔ مہر النساء کے پیدا کردہ حالات اور انجام کار واقعات نے مرزا محمد کو بہت تازہ کر رکھا تھا۔ اسے کسی بھی پل سکون دل کے ہی نہیں دے رہا تھا۔ ذہن کے نہاں خانوں سے ہو کا خیال بھی مضطرب رکھتا تھا۔ اس کے ناز و انداز ایک بے نام سی خلش میں جگانے لگے تو وہ ایک شب اس سے ملاقات کے لیے چلا گیا۔

"زہے نصیب! آج اس کنیز کی یاد کیسے آ گئی؟ مجھے اپنی قسمت پر یقین ہی نہیں ہو رہا ہے۔" وہ مسرور ہو گئی۔

"بس تم سے ملنے کا دل چاہا تو چلا آیا۔" مرزا محمد نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"کاش یہ دل روز ہی ایسی خواہش کیا کرے۔" وہ نہال ہوئی۔

مرزا محمد اس کی بے ساختگی اور والہانہ پن سے بے خود ہونے لگا۔ بشیراں دونوں کو تنہا چھوڑ کر اپنے رہائشی کمرے میں چلا گیا۔ ہو نے وارفتگی میں مرزا محمد کے شانے سے سر ٹکا دیا۔

"اتنے پریشان کیوں ہیں شہزادہ حضور؟"

"زندگی میں چھوٹی موٹی پریشانیاں اور مسائل تو چلتے ہی رہتے ہیں۔" اس نے دانستہ طور پر بے نیازی کا مظاہرہ کیا۔

"اپنی ہر پریشانی مجھے سونپ دیجیے اور میری قسمت کی ہر خوشی آپ رکھ لیں۔" ہو نے بے اختیار کہا۔

"ایسا نہیں ہو سکتا۔ ایسا کبھی ہوا ہی نہیں کرتا۔ ہر شخص کو اپنی قسمت میں لکھی اذیت خود ہی جھیلنی پڑتی ہے۔" مرزا محمد پژمردگی سے مسکرایا۔

"لیکن میں آپ کے سکھ اور سکون کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں شہزادہ محترم!" اس نے یقین دلایا۔

مرزا محمد اس کی وارفتگی پر نہال ہو گیا۔ دو طرفہ ملاقاتوں کا یہ سلسلہ کچھ روز یونہی جاری رہا۔ ان دونوں کی قربت میں تیزی سے اضافہ ہو رہا تھا۔

"نواب میر جعفر ہماری ملاقاتوں پر کوئی نہ کوئی زہر ضرور اگلے گا شہزادہ محترم!" ہو نے کسی خدشے کے تحت کہا۔

"میں نانا جان سے کہہ سن کر کسی نہ کسی طرح اس کا بندوبست کر لوں گا۔" اس نے بے نیازی سے جواب دیا۔

"وہ شخص بہت خطرناک ہے۔ کسی بھی حد تک جا سکتا ہے۔" ہو اس کے شدید دباؤ میں تھی۔

مرزا محمد خاموش ہو گیا۔ کچھ لمحوں کے بعد ہو کہنے لگی۔

"کیا ہم یونہی رات کے اندھیروں میں چھپ چھپ کر ملتے

رہیں گے؟"

"تو اس میں حرج کیا ہے؟" مرزا محمد بدک گیا۔ اسے بہو کے انداز گفتگو سے اب کوفت ہونے لگی تھی۔

"حرج یہ ہے کہ ہمارے اس رشتہ کو کوئی نام دے دیجیے جیسے منی کو میر جعفر نے دیا ہے۔" اس نے دل کڑا کرکے کہہ دیا۔

"ہم لطف النساء کی موجودگی میں شادی کیسے کرسکتے ہیں؟" مرزا محمد نے قدرے رعونت سے جواب دیا۔

"جس طرح لطف النساء کی موجودگی میں ہم ملاقاتوں کے لیے آسکتے ہیں۔" بہو نے تڑپ کر کہا۔

"اپنی حد میں رہو!" وہ بھڑک گیا۔

"میں اپنی حد ہی تو جاننا چاہتی ہوں شہزادہ محترم! مجھے بتا دیجیے کہ آخر ہمارا کیا رشتہ ہے؟" اس نے آزردگی سے جواب دیا۔

"ہمارے درمیان ویسا کوئی رشتہ قائم نہیں ہوسکتا جیسا تم سوچ رہی ہو۔ تم ایک طوائف ہو اور یہی تمہاری حد ہے۔" مرزا محمد نے درشتی سے کہا اور اٹھ کھڑا ہوا۔

بہو احساس توہین سے شل رہ گئی۔ اس کے لیے ایک فیصلہ پر پہنچنا بہت آسان ہوگیا تھا۔

☆☆☆

مرزا محمد کے لیے ہر جانب سے مشکلات میں اضافہ ہورہا تھا۔ زخم خوردہ مہر النساء نے میر جعفر کے سامنے گریہ زاری کے بعد مرزا محمد کے خلاف مدد طلب کی۔ میر جعفر علی وردی خاں سے خائف ہونے کے باعث کوئی بھی براہ راست قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ اس نے مہر النساء کو اپنی حفاظت کے لیے فوج تیار کرنے کا مشورہ دیا۔ مہر النساء نے اس مشورے پر سنجیدگی سے عمل کا آغاز کردیا۔

دوسری جانب بہو بھی اپنی زخمی انا اور مجروح جذبات سے مغلوب ہوگئی تھی۔ مرزا محمد کے رویے اور گریز نے اسے یک دم ہی کسی انتقامی کارروائی پر مجبور کردیا۔ یہ انتقام میر جعفر سے شادی کے علاوہ اور کیا ہوسکتا تھا؟ میر جعفر اس کی رضامندی پر بے حد خوش تھا۔ اسے اس بات کی بھی پروا نہیں تھی کہ عوام الناس میں اس غیر شرعی شادی کی بابت چہ میگوئیاں ہورہی ہیں۔ وہ بہو اور منی کو لے کر مرزا محمد کی رہائش گاہ پر چلا گیا۔ مقصد بہرحال یہی تھا کہ اپنی دونوں بیگمات کو محل میں خواتین سے متعارف کروا کے راہ و رسم بڑھائی جائے۔

میر جعفر کا یہ حربہ کامیاب رہا۔ مرزا محمد نے بیگمات کو کسی بھی بے تکلفی سے منع کررکھا تھا۔ اس نے بہو کا سامنا بھی خاصی بے نیازی سے کیا۔ اسے بہو کی شادی سے کوئی فرق نہیں پڑا تھا۔ بہو کے دل پر ایک اور چرکہ میں اضافہ ہوگیا۔ اس مختصر لیکن کربناک ملاقات کے بعد بہو کے قلب و روح میں لگے زخم مزید ٹیسیں دینے لگے۔

☆☆☆

میر جعفر کے حرم کا حصہ بننے کے بعد بہو نے کنیزوں اور خواجہ سراؤں سے معلومات کے حصول میں مزید تیزی پیدا کردی۔ اسے مرشد آباد کی لمحہ بہ لمحہ بدلتی صورت حال سے مکمل آگہی ملتی رہی۔ علی وردی خاں کی زندگی کا چراغ گل ہوگیا تھا۔ اس نے وفات سے پہلے مرزا محمد کو انگریزوں پر قطعی بھروسا نہ کرنے کی وصیت و نصائح کیے اور اسے جانشینی کے ساتھ سراج الدولہ کا خطاب سونپا اور اپنے آخری سفر پر روانہ ہوگیا۔

مہر النساء نے اس کا اقتدار بالکل تسلیم نہ کیا اور اپنی پہلے سے جمع کردہ فوج کے ہمراہ اس کے چچا زاد بھائی 'شوکت جنگ' کی حمایت کا اعلان کردیا۔ شوکت جنگ بنگال کی صوبے داری کا دعوے دار تھا۔ دہلی حکومت نے اس موقع پر ایک مضحکہ خیز فیصلہ صادر کرتے ہوئے شوکت جنگ اور سراج الدولہ دونوں کو ہی بنگال کا صوبے دار مقرر کردیا۔ یہ نسل پرکفر توڑتے دنوں کے ساتھ کسی جنگ کا پیش خیمہ ثابت ہوتی دکھائی دے رہی تھی۔

اسی دوران بہو کو علم ہوا کہ مہر النساء نے اپنی فطرت سے مجبور ہوکر 'میر نذیر علی' نامی ایک افسر سے مراسم قائم کرلیے ہیں۔ بہو کے ہونٹوں پر ایک تلخ مسکراہٹ رینگ گئی۔ اسے مرزا محمد کی جانب سے طوائف اور شریف زادی کا موازنہ یاد آگیا تھا۔

پھر خبر ملی کہ مہر النساء نے سراج الدولہ کی والدہ آمنہ بیگم سے منت سماجت کے بعد نذیر علی کے لیے 'پروانہ راہ داری' کا اجراء کروا دیا اور اسے دہلی روانہ کردیا۔ اس کے بعد مہر النساء موتی جھیل کا قلعہ خالی کرنے پر مجبور ہوگئی۔ سراج الدولہ نے اسے حراست میں لے کر اس کا مال و دولت بحق صوبے دار ضبط کرلیا۔ مہر النساء مکمل طور پر چوٹ کھائی ہوئی ناگن بن چکی تھی۔ ان حالات میں بہو کے دل میں اس سے ملاقات کی خواہش مچلنے لگی اور پھر جلد ہی بہو کو یہ نادر موقع میسر آگیا۔

مہر النساء سے ملاقات ہوئی تو انکشافات کا ایک نیا سلسلہ ثابت ہوا۔ اسے کچھ ہی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ مہر النساء سراج الدولہ کے خلاف شدید بغض دبائے بیٹھی ہے۔ اس نے میر جعفر کو بے لفظوں میں انگریزوں سے راہ و رسم بڑھاتے رہنے کی تجویز بھی دی۔ سراج الدولہ کے متعلق مہر النساء کی نفرت اور جذبہ انتقام دیکھ کر بہو کے لیے اپنا کرب ضبط کرنا دشوار ہونے لگا۔ اس نے موقع ملتے ہی سراج الدولہ کو ایک خط ارسال کردیا۔

"شہزادہ حضور! ہوشیار رہیے۔ یہاں آپ کے خلاف بہت سی سازشیں تیار ہورہی ہیں۔ آپ کی خالہ نے انگریزوں سے گٹھ جوڑ کرلیا ہے۔ ان دونوں فریقین میں خفیہ خط و کتابت بھی جاری ہے۔ اس فتنہ سے نمٹنا اب آپ کی ذمہ داری ہے۔ مخلص، ناتمام"

خط کے آخر میں یہ الفاظ درج کرتے اس کے دل سے کئی بار ہوک برآمد ہوئی تھی۔ اسے قوی امید تھی کہ سراج الدولہ موجودہ صورت حال سے نمٹنے کے لیے کوئی نہ کوئی راہ ضرور نکال لے گا۔ دوسری جانب مہر النساء کے بد عزائم سے آگاہ ہوتے رہنے کے لیے بہو نے اس سے راہ و رسم میں اضافہ کردیا۔ وہ منی کے ہمراہ اکثر اس سے ملاقات کے لیے چلی جایا کرتی۔ اسے اتنا اندازہ ہوگیا تھا کہ سراج الدولہ میر جعفر پر براہ راست کوئی پابندی عائد نہیں کرسکتا۔ اس کی پہلی وجہ اس کے مزاج میں مروت و لحاظ کے تناسب کا غلبہ تھا جو کسی بھی حکمران کے لیے مہلک حد تک خطرناک ثابت ہوا کرتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ شوکت جنگ سے اختلافات اور چند امراء کے راستہ بدل لینے کے بعد وہ میر جعفر جیسے اہل عہدیدار کو اپنے خلاف نہیں کرنا چاہتا تھا۔

حالات تیزی سے تبدیل ہورہے تھے۔ شوکت جنگ نے خانہ جنگی کی تیاری کرلی۔ اسے مہر النساء اور انگریزوں کا مکمل تعاون حاصل تھا۔ سراج الدولہ مختلف محاذوں پر بے طرح مصروف تھا۔ اس نے انگریزوں کے خلاف اپنے دشمنوں کی پشت پناہی کرنے کی پاداش میں پہلے قاسم بازار پر چڑھائی کردی۔ یہ بازار مرشد آباد کے جنوب میں قدرے فاصلے پر واقع تھا۔ برطانوی تجارتی کمپنی کی فیکٹری ایک شاندار قلعے کے اندر واقع تھی۔

سراج الدولہ کی یہ یلغار کامیاب رہی۔ اس نے قاسم بازار پر قبضہ کرلیا۔ اس کے بعد وہ انہیں ہنکاتا ہوا کلکتہ تک لے گیا اور وہاں بھی ایک کامیاب معرکے کے بعد انہیں پسپا

ہونے پر مجبور کردیا۔ شوکت جنگ سے لڑائی میں بھی اسی کا پلہ بھاری رہا۔ میر جعفر تک یہ خبریں تسلسل سے پہنچ رہی تھیں۔ بہو بھی ان حالات سے بے خبر نہیں تھی۔ وہ سراج الدولہ کی خیریت اور کامیابیوں کے بارے میں ہمیشہ دعا گو رہتی۔ اس کا ذاتی ارتکاز صرف اسی کی جانب مبذول رہتا۔ دوسری جانب وہ میر جعفر کو بھی نہایت ہوشیاری سے اپنے دام میں الجھائے ہوئے تھی۔

ایک دوپہر میر جعفر قدرے پژمردگی میں اس کے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"آج ہم تمہارا رقص دیکھنا چاہتے ہیں بہو! آج ہمیں بالکل تازہ دم کردو۔ مرشد آباد اور کلکتہ سے آنے والی خبروں نے ہمیں بہت الجھایا ہوا ہے۔"

"حضور! میری جان بھی آپ پر قربان" وہ بھرپور ملاحت سے بولی۔ "لیکن ابھی میں پوجا کے لیے مندر جا رہی ہوں۔ میں نے آپ کی سلامتی اور کامیابی کے لیے برت (روزہ) رکھا ہوا ہے۔ اس میں پوجا کرنی بہت ضروری ہے۔"

بہو کے بتانے پر میر جعفر کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ اس نے بڑی محبت سے بہو کا ہاتھ تھاما اور اسے اپنی آغوش میں سمیٹ لیا۔

"اتنی فکر کرتی ہو تم ہماری؟" وہ اس کی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولا۔

"آپ ہی تو میرے پتی پرمیشور (مجازی خدا) ہیں۔ آپ کے لیے یہ سب نہ کروں تو اور کس کے لیے کروں گی؟" وہ شیریں لہجے سے کہنے لگی۔ "اچھا! مجھے پوجا کے لیے ذرا دیر ہورہی ہے۔ اس کے بعد میں اپنے فن رقص سے آپ کی یہ تھکاوٹ دور کردوں گی۔"

میر جعفر بہو کی اس ادا پر نہال ہوگیا۔ بہو نے اپنے مزاج کے بکھرنے پر کامیابی سے قابو پایا اور گل کے مخصوص جھے میں اپنے لیے بنائے گئے ایک مختصر مندر میں چلی گئی۔ مورتی کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بیٹھنے کے بعد اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے۔

"ہے بھگوان! تو دلوں کے راز جانتا ہے۔ میرے دل میں صرف مرزا محمد کا پریم بسا ہے۔ مجھے صرف اسی کی فکر ستاتی ہے۔ یہ برت اور پوجا صرف اسی کے لیے ہے۔ اسے محفوظ رکھنا وہ بہت بہادر ہے لیکن نادان بھی ہے۔ بہت سمجھدار ہے لیکن اعتبار کرنے میں غلطی بھی بہت جلد کرلیتا

ہے۔ اسے ہمیشہ کامیابی ہی دیتا۔ ان کی ہر مشکل آسان کرتا۔“

وہ مورتی کے آگے سر جھکائے بے آواز دعائیں مانگتی رہی۔ آنسو کسی آبشار کی مانند بہہ رہے تھے۔ چہرے پر شدید جذب کا عالم تھا۔

☆☆☆

سراج الدولہ کی کامیابیوں کا سفر جاری تھا۔ اس نے شوکت جنگ پر حملے کے بعد اسے شکست دی اور اسے ہلاک کر کے اس فتنے سے دائمی طور پر نجات حاصل کر لی۔ مہر النساء کی نگرانی میں سختی کر دی گئی۔ اسے کسی خاتون سے ملنے کی اجازت بھی نہ تھی۔

یہ معاملات ابھی مکمل حل ہونے نہ پائے تھے کہ برطانوی فوج کی مدراس سے روانگی کی اطلاعات ملنے لگیں۔ اس فوج کا قائد امیر البحر واٹسن تھا۔ اس کا نائب کلائیو بھی کافی پُرجوش اور پُرعزم سپاہی تھا۔ وہ امورِ حرب کے علاوہ مکاری و سازشوں میں بھی اپنی مثال آپ تھا۔ اس نے بے شمار پابندیوں میں گھری مہر النساء سے کسی نہ کسی طور رابطہ کیا اور اسے فوجی افسران سے سازباز کے لیے رضامند کر لیا۔

مہر النساء کی تو گویا مراد بر آئی۔ اس نے سراج الدولہ کی والدہ آمنہ بیگم کا جذباتی استحصال کیا اور میر جعفر سے ملاقات کی اجازت حاصل کر لی۔ میر جعفر کی رہائش گاہ میں اس کی ملاقات پہلے منی اور بہو سے ہوئی۔ مہر النساء نے بہو سے خاصی سرد مہری کا مظاہرہ کیا۔ اس کی مخصوص نسوانی حس بہو کی سراج الدولہ میں دلچسپی بھانپ گئی تھی۔

بہو کو موقع سے ہٹنے کے بعد مہر النساء نے میر جعفر کے سامنے کلائیو کی پیشکش رکھ دی۔ وہ اسے اپنی مدد کے عوض بنگال کا صوبے دار بنانا چاہتے تھے۔ میر جعفر نے کلائیو کے پاس اپنا نمائندہ بھیجنے کا فیصلہ کر لیا تاہم اسے یہ موقع مل ہی نہ سکا۔ بہو نے اس سے پہلے ہی سراج الدولہ تک مخصوص انداز میں اپنا خط پہنچا دیا۔

”آپ کی خالہ اور میر جعفر کسی صلاح مشورے میں مصروف رہنے لگے ہیں۔ وہ اپنی گفتگو میں مجھے شامل نہیں کرتے لیکن میں نے کئی بار انگریزوں اور کلائیو کا ذکر سنا ہے۔ حالات بہت بگڑ رہے ہیں۔ آپ کو ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ عشق ناتمام۔“

سراج الدولہ نے فوری طور پر جوابی کارروائی کرتے ہوئے میر جعفر کو سپہ سالاری کے عہدے سے سبکدوش کر کے یہ عہدہ میر مدن کے حوالے کر دیا۔ میر جعفر اور اس کے بیٹے میرن پر چوبدار مقرر کر دیے گئے۔

دونوں باپ بیٹا اس نظر بندی پر سخت مشتعل تھے تاہم ایک بات انہیں قدرے مطمئن کیے ہوئے تھی کہ فوجی سردار سراج الدولہ کے لیے کہیں نہ کہیں مشکلات کھڑی کرتے رہا کریں گے۔ اور ہوا بھی یہی۔ ان فوجی سرداروں کی غداری اور پیدا کیے گئے مسائل کے باعث سراج الدولہ کو چندر نگر میں کلائیو سے معاہدہ امن کرنا پڑا جس کی رو سے ایک انگریز سفیر مرشد آباد میں متعین ہو گیا۔

یہ معاہدہ سراج الدولہ کی زندگی کی بھیانک اور مہلک غلطی ثابت ہوا۔ اس انگریز سفیر نے مرشد آباد آتے ہی میر جعفر سے ملاقات کی۔ میر جعفر نے اسے یقین دلایا کہ وہ صوبے داری کا عہدہ حاصل کرتے ہی بنگال سے انگریزوں کے دشمن فرانسیسیوں کے کارخانے اور کوٹھیاں تباہ و برباد کر دے گا۔ کلکتہ اور قاسم بازار کے حملوں میں انگریزوں کے نقصان کا تاوان ادا کرنے کے بعد کلکتہ کے گرد و نواح میں انہیں زمینیں فراہم کرنے کا عندیہ بھی دیا۔ کلائیو نے خصوصی طور پر معاہدہ تیار کروایا اور میر جعفر سے قرآن پاک پر حلف لیا کہ وہ بہرصورت فرنگی مفادات کو تقویت دے گا۔

میر جعفر نے ایک ہاتھ قرآن پاک اور دوسرا ہاتھ اپنے بیٹے میرن کے سر پر رکھ کر قسم کھائی کہ وہ معاہدے کی ہر شق پر بھرپور دیانت داری سے عمل کرے گا۔ میر جعفر کے بعد کلائیو نے سراج الدولہ کے ایک معتمد کاروباری امیر ”امی چند“ سے بھی سازباز کر لی۔ ان کامیابیوں نے کلائیو کے مزاج میں فرعونیت سوار کر دی۔ اس نے کلکتہ سے مرشد آباد فوج کشی کا آغاز کر دیا اور اس پیش قدمی کا جواز یہ دیا کہ سراج الدولہ اور انگریزوں کے مابین اختلافات شدید ہوتے جا رہے ہیں لہٰذا ان کا متفقہ حل نکالنا بہت ضروری ہے۔

سراج الدولہ ایک بار پھر تذبذب میں مبتلا ہو گیا۔ اس پریشانی میں اسے اور کچھ نہ سوجھا تو میر جعفر کے پاس چل دیا۔ اسے بھی اس بات کا اندازہ تھا کہ انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لیے اسے میر جعفر جیسے تجربہ کار اور کھاگ سپہ سالار کی ضرورت ہوگی۔ وہ اپنی چاچی کو مدعو کرتے میر جعفر کی رہائش گاہ پر پہنچ گیا۔

☆☆☆



بہو اپنے بستر پر پژمردگی سے لیٹی تھی۔ اس کی آنکھوں میں تشویش اور خوف کے رنگ نمایاں تھے۔ بشرے سے بھی شدید اضطراب جھلک رہا تھا۔ وہ آنکھوں پر بازو رکھے کافی دیر تک ساکت لیٹی رہی۔ اسی اثناء میں میر جعفر کی آواز سماعت میں پڑی تو اس کے وجود میں ہلکی سی جنبش پیدا ہوئی۔

”کیا بات ہے ہماری بہورانی؟ اتنی اداس کیوں ہو؟“ میر جعفر نے پچکارا۔

”اتنے دنوں سے آپ سے ملاقات جو نہیں ہو پائی تھی۔ دل کہیں لگ ہی نہیں رہا تھا۔“ وہ نقاہت سے مسکرائی۔

میر جعفر اس ادا پر نہال دکھائی دینے لگا۔

”یہ تمہاری محبت اور دعائیں ہی تو ہیں جو ہمیں ایسی ناقابل یقین کامیابیاں دلوا رہی ہیں۔“ اس نے تفاخر سے مسکرا کر کہا۔

بہو سوالیہ نظروں سے اس کی جانب دیکھنے لگی۔ میر جعفر لمحاتی توقف کے بعد سلسلہ کلام کا آغاز کرتے ہوئے گویا ہوا۔ ”ہماری نظر بندی کا تو تمہیں علم ہو ہی گیا ہوگا۔“

”جی ہاں! اسی لیے تو جان پر بنی ہوئی تھی۔“ بہو نے مزید بے تابی جتائی۔

”نظر بندی کے دوران سراج الدولہ خود ہی ہمارے پاس چلا آیا۔ ہم جانتے ہیں کہ اس کے ذہن میں یہی خیال پنپ رہا تھا کہ ہمیں ناراض نہ کیا جائے کیونکہ انگریزوں سے جنگ کرنے کے لیے ہم جیسے تجربہ کار سپہ سالار کی ضرورت ہے۔“ اس نے فخریہ بتایا۔

”اوہ...... پھر...... پھر کیا ہوا؟“ بہو اپنے دلی اضطراب کے باوجود مصنوعی تجسس سے پوچھنے لگی۔

”سراج الدولہ کی حالت قابل دید تھی۔ اس کی فطری چستی اور طراری کہیں غائب ہی ہو چکی تھی۔ بہت سست اور مایوس دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں تنہائی کے علاوہ کوئی بھی رنگ نہ تھا۔ ہم نے پوچھا حضور کے لیے کوئی نیا حکم؟ تو بغلگیر ہو کر کہنے لگا آپ ہماری فوج کے سپہ سالار ہی نہیں ہمارے پھوپا بھی ہیں۔ خون کے اس رشتے کے ناتے برے وقت میں صرف آپ ہی ہمارا ساتھ دے سکتے ہیں۔“

”چ چ چ...... بے چارا۔“ بہو نے تمسخر اڑایا۔

میر جعفر مخصوص انداز میں مسکرایا اور کہنے لگا۔ ”ہم نے بھی جوابی طور پر بڑی گرم جوشی سے اس کی پشت تھپتھپائی اور کہا آپ جانے کیوں ہمیشہ ہماری جانب سے بدگمان ہی رہے ہیں؟ حالانکہ ان سفید فام فرنگیوں کی آپ کے سامنے کوئی بھی حیثیت نہیں ہے۔ آپ نے ہر مقام پر ہمارے ساتھ زیادتی کی۔ ہمیں سپہ سالاری سے سبکدوش کیا، نظر بند کر دیا۔ ہم نے بھی بس سب کچھ وقت پر چھوڑ دیا۔ اب دیکھیے وقت بہترین منصف ثابت ہوا ہے۔ جواب میں وہ کہنے لگا پرانی باتیں بھلا دیجیے پھوپا جان! ایک نئے سرے سے ان تعلقات کا آغاز کرتے ہیں۔“

مسرت سے ان لمحات کو دہراتے میر جعفر کے پردہ تصور پر وہ لمحات اجاگر ہو گئے جب سراج الدولہ نے کلام پاک طلب کر لیا تھا۔ اس نے قرآن پاک اپنے سر پر رکھا اور حلفیہ طور پر کہنے لگا۔ ”ہم صوبیدار بنگال مرزا محمد سراج الدولہ یہ عہد کرتے ہیں کہ ہمیشہ اپنے پھوپا میر جعفر کے وفادار رہیں گے اور زندگی کے آخری لمحات تک ان کا ساتھ نبھائیں گے۔“

اس کے بعد میر جعفر نے بھی قرآن پاک دونوں ہاتھوں سے اٹھایا اور حلف اٹھا کر کہا۔ ”ہم میر جعفر عہد کرتے ہیں کہ ہمیشہ سراج الدولہ کے وفادار رہیں گے۔ اس وفاداری میں اپنے خون کا آخری قطرہ تک بہا دیں گے۔ اس عہد میں بے وفائی پر خدا ہمیں کسی عذاب میں مبتلا کر دے۔“

بہو بڑی کامیابی سے خوشی و جوش کا اظہار کرنے لگی۔ میر جعفر کچھ دیر مزید قیام کے بعد وہاں سے رخصت ہو گیا۔ بہو کی پریشانی اور تڑپ سوا تھی۔ اسے سراج الدولہ کی جانب سے بھی شدید تشویش لاحق تھی لیکن وہ دعائیں، گڑگڑانے اور آہ و زاری کے سوا کر بھی کیا سکتی تھی؟ وہ چشم تصور میں سراج الدولہ کی کامیابی اور فتح کے مناظر دیکھتی رہی لیکن میدان جنگ کے حالات یکسر مختلف تھے۔

دو طرفہ گولا باری میں سراج الدولہ کے وفادار ترین سپہ سالار میر مدن کی ٹانگ زخمی ہوئی اور وہ داغ مفارقت دے گیا۔ سراج الدولہ شدید شکستگی محسوس کرنے لگا۔ کچھ ہی دیر بعد موسلا دھار بارش کا آغاز ہو گیا۔ میدان جنگ میں بکھری بارود بھیگ کر ناکارہ ہو گئی۔ دوسری جانب کلائیو نے اپنے بارودی ذخائر بارش کی دست برد سے محفوظ کر لیے تھے۔ سراج الدولہ نے شکستگی کے عالم میں میر جعفر کے قدموں میں دستار رکھ کر مدد طلب کی۔ میر جعفر نے اسے بھرپور اعانت کی یقین دہانی کروا کر رخصت کر دیا لیکن

سراج الدولہ ہر جانب سے مصائب میں گرفتار ہو چکا تھا۔ اس کے اردگرد بھی معتمدین اپنی وفاداریوں کا رخ تبدیل کر چکے تھے۔ انہوں نے سراج الدولہ کو ہر اعتبار سے یہی باور کروایا کہ وہ عملی طور پر جنگ ہار چکے ہیں۔ اب بقاء کی واحد صورت حال یہی ہے کہ وہ مرشد آباد میں واپس جا کر فوج منظم کرے اور پٹنہ سے بھی مدد طلب کرے۔ اس کی واپسی تک وہ یہاں محاذ سنبھالے رکھیں گے۔

سراج الدولہ نے ان کا مشورہ تسلیم کر لیا اور پلاسی کے میدان سے پہلے مرشد آباد اور پھر لطف النساء کے ہمراہ پٹنہ روانہ ہو گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی میر جعفر اپنے بیٹے میرن کے ہمراہ ہاتھی پر سوار ہو کر کلائیو کے کیمپ روانہ ہو گیا۔ انگریزوں نے انہیں مخصوص اعزاز میں سلامی دی اور بنگال، بہار، اڑیسہ کی حکمرانی سونپ کر اسے فوری طور پر مرشد آباد پہنچ کر سراج الدولہ کے خزانے پر قابض ہونے کا مشورہ دے دیا۔ میر جعفر دو سو انگریزوں اور تین سو ہندوستانی سپاہ کے ہمراہ مرشد آباد میں داخل ہوا اور سراج الدولہ کی املاک پر تسلط جما لیا۔ مہر النساء کا جذبہ انتقام شدید تسکین محسوس کر رہا تھا۔ وہ مکمل جوش و خروش سے نئے صوبے دار کی پیشوائی اور مبارک باد کے لیے آگے بڑھی تھی کہ میرن نے کینہ توز نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے دو طمانچے رسید کر دیے۔ مہر النساء پھٹی ہوئی آنکھوں سے میرن اور میر جعفر کو دیکھنے لگی۔ میرن نے ایک سپاہی کو اسے قید میں ڈالنے کا حکم دے دیا۔ ہو کے سوختہ دل میں اطمینان کی پہلی چھینٹ پڑتی محسوس ہوئی۔

”ہے بھگوان! مرزا احمد کی رکھشا (حفاظت) کرنا۔ وہ جہاں کہیں بھی ہے اسے محفوظ رکھنا۔ اسے میرا جیون اور میری ہر خوشی دان کر دینا۔“

تقدیر اس کی بھی دعاؤں اور بے چینی پر خندہ زن تھی کیونکہ تقدیر ہر لحاظ سے سراج الدولہ کے ناموافق تھی۔ سراج الدولہ کو اس کی دانستہ نادانستہ غلطیوں کی سزا ملنے کا وقت بھر پور تاوان لیے بغیر ٹلنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

سراج الدولہ کی کشتی تین روز بعد بھگوان گولا کے ویران ساحل پر رکی تو وہ دونوں میاں بیوی بھوک پیاس اور تھکاوٹ سے بے حال ہو چکے تھے۔ قسمت انہیں کسی بھی طور کوئی سکون فراہم کرنے کے لیے تیار نہ تھی۔ سراج الدولہ اور لطف النساء نے جس ویران کٹیا میں پناہ لی اس کے مالک نے ماضی قریب میں کسی جرم کی پاداش میں سراج الدولہ سے اپنا کان کٹوا دیے جانے کی سزا پائی تھی۔ اس بغض اور کینہ پروری میں دانا شاہ نے میر جعفر کے داماد میر قاسم تک سراج الدولہ کی وہاں موجودگی کی خبر پہنچا دی۔ میر جعفر نے فوری طور پر اپنی سپاہ ان کی گرفتاری کے لیے روانہ کر دی۔

☆☆☆

ہو کے شب و روز نہایت اذیت ناک ہو چکے تھے۔ اسے سراج الدولہ کے متعلق ملنے والی خبروں نے ایک عجیب سوختگی میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اپنا وجود، زندگی کی ہر شے سے عاری محسوس ہوتا۔ میر جعفر کی خوشی و سرشاری اس کی سوختگی پر تیزاب کے چھینٹوں کی پھوار بنی ہوئی تھی۔

مرشد آباد کی مبارک منزل کے عظیم الشان باغ میں ایک شاندار اجتماع ہوا اور میر جعفر کو مسند اقتدار سونپ دی گئی۔ اسی شب سراج الدولہ کو زنجیروں میں جکڑ کر میر جعفر کے سامنے پیش کیا گیا۔ میر جعفر نے اس کی حیرت زدہ نظروں سے محظوظ ہوتے اسے میرن کے حوالے کر دیا جس نے اسے بے رحمی سے ٹھوکروں کی زد میں رکھ لیا۔ کچھ دیر بعد اسے ایک کوٹھری میں پہنچا دیا گیا جہاں محمد بیگ نامی ایک پہریدار نے خنجر زنی سے اس کے جسم کا ہر ایک حصہ لہولہان کر دیا۔

انتقال کے بعد اس کی لاش ہاتھی پر ڈال کر مرشد آباد کی سڑکوں پر پھرائی گئی۔ عوام اس کے ایسے انجام پر سخت آزردہ تھے۔ محل کے جھروکے سے یہ منظر دیکھنے والی آمنہ بیگم دیوانہ وار سڑک پر چلی آئی اور بیٹے کے لیے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ میرن کے حکم پر چند ملازم آگے بڑھے اور اسے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے لے گئے۔ کچھ روز بعد آمنہ بیگم اور مہر النساء کو جہانگیر نگر (ڈھاکا) روانہ کر دیا۔ میرن کے جذبہ انتقام کو تسکین مل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے کسی بہانے سے ان دونوں کو مرشد آباد واپس بلایا اور جمعدار کو ان کے پاؤں میں بھاری پتھر باندھ کر انہیں دریا برد کرنے کا حکم دے دیا۔ جمعدار نے ایسا ہی کیا۔ دونوں خواتین نے جب کشتی پر دوبارہ سوار ہونے کی کوشش کی تو اس کے سروں اور گردنوں پر لاٹھی کی ضربات لگا کر انہیں دوبارہ پانی میں دھکیل دیا گیا۔ ان کی مزاحمت ترک نہ ہوئی تو کچھ سپاہیوں نے ان کے ہاتھ ہی کلائی سے کاٹ دیے۔ آمنہ بیگم نے ڈوبتی ہوئی نگاہوں سے آسمان کی جانب دیکھا اور دردناک انداز میں کہنے لگی۔ ”خدایا! مجھے یقین ہے کہ تو ظالم میرن کو معاف نہیں کرے گا اور انتقام تو خود لے گا۔“

☆☆☆

ہو اپنے بستر پر لیٹی خالی نظروں سے چھت کو گھور رہی تھی۔ اس کا چہرہ سرسوں سے بھی زیادہ زرد ہو چکا تھا۔ رخساروں کی شادابیت ماند، آنکھیں بے رونق اور ہونٹ بے طرح پپڑی زدہ تھے۔ ریشمی بال الجھے ہوئے اور لباس سخت مسلا ہوا تھا۔ اس خالی الذہنی کے عالم میں اسے اپنے پاس ایک آہٹ نے چونکا دیا۔ اس نے بحالت مجبوری اپنی نگاہ اس جانب دوڑائی اور اپنی دیرینہ کنیز کو سامنے پا کر مزید تناؤ کا شکار ہو گئی۔ دل میں مرزا احمد کی یاد نے شدید چٹکی بھری تھی۔

”ہے بھگوان! اب اور کیا اذیت دیکھنا اور سننا باقی رہ گیا ہے؟“ اس نے اذیت سے سوچا۔

”میرن کا انتقال ہو گیا ہے ہو بیگم! اس کے خیمے پر بجلی ایک خوفناک کڑک کے ساتھ گری۔ اس بجلی نے میرن کے سر میں چھید شگاف کر دیے۔ اس کے سرہانے رکھی تلوار پگھل کر رہ گئی یہاں تک کہ وہ چارپائی بھی جل کر خاک ہو گئی جس پر وہ لیٹا ہوا تھا۔“ کنیز نے بتایا۔

”وہ قاتل تھا اسی قاتل۔ اس نے بھی کم انیائے نہیں کیا۔ آمنہ بیگم اور مہر النساء کے ساتھ جو ہوا اس پر تو آسمان بھی رو دیا ہو گا۔“ وہ کرب سے بولی۔

”یقین ہی نہیں آتا کہ حالات کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔“

کنیز کے ملال پر ہو نے اذیت سے آنکھیں بھینچ لیں۔ اس کے دل سے بے اختیار صدا برآمد ہوئی۔ ”ہے بھگوان! مرزا احمد کا یہ خون بھی رائیگاں نہ جانے دینا۔ مجھے زندہ رکھنا جب تک کہ میں مرزا احمد کے ہر مجرم کو اپنے انجام تک پہنچتے نہ دیکھ لوں۔ بس اتنا سا جیون دان کر دینا کہ دھرتی پر ہی نیائے ہوتا دیکھ سکوں۔“

ہو کی یہ خواہش پوری ہونے میں آٹھ سال کا عرصہ بیت گیا۔ ان آٹھ سالوں کا ہر شب و روز نہایت کرب ناک تھا۔ ناتمام عشق کی اذیت رگوں میں انگارے بھرے رکھتی پھر وہ لمحہ بھی چلا آیا جس کے لیے اس نے صدیوں کی مسافت لیے وہ برس کاٹے تھے۔ دو بار مرشد آباد پر مسند رہنے کے بعد میر جعفر کی بیماری نے عبرت ناک صورت اختیار کر لی۔ جو بہتر سالہ وہ شخص محل کے ایک کونے میں تنہا بیٹھا رہتا۔ ہنی نہایت کراہت سے اس کے پاس جایا کرتی۔ اس کے کان ناک اور انگلیاں گل سڑ کر شدید متعفن ہو چکی تھیں۔ وہ جذام کے مرض میں مبتلا ہو چکا تھا۔ خدمت گار بھی اس کے پاس جانے سے گھن کھاتے تھے۔ ہو ایک روز اپنی نقاہت کے باوجود اس سے ملاقات کے لیے چلی گئی۔

”ہو آ، ہو! مجھے علم تھا کہ تم ہم سے ملنے ضرور آؤ گی۔ تم ہمیں بھی تنہا نہیں چھوڑو گی۔ تمہیں تو ہم سے بہت محبت تھی۔ تم بھلا ہمیں تنہا کیسے چھوڑ سکتی تھیں۔“ میر جعفر بلک کر رونے لگا۔

”محبت..... تم سے..... ایک پل کے لیے بھی نہیں۔“ وہ حقارت سے بولی۔

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو؟“ میر جعفر ششدر رہ گیا۔ اس کا بھرم بے طرح شکستہ ہوا تھا۔

”سچ..... آج صرف سچ بولوں گی۔ محبت تو میں نے اس نادان سے کی تھی جس کا سب سے بڑا جرم ”اعتماد“ تھا۔ وہ طاقت ور ہونے کے باوجود تم جیسے سانپ آستین میں پال کر بیٹھا اور انہی سانپوں نے اسے ڈس لیا۔“ ہو نے تنفر سے اسے دیکھا۔

میر جعفر کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اپنی زوجیت میں بندھی اس عورت کی زبان سے کسی اور کے لیے اظہار محبت سننا اذیت کی ایک اور انتہا تھی۔

”نہیں..... جھوٹ ہے۔ تم تو مرزا احمد سے نفرت کرتی تھیں۔“ میر جعفر نے تڑپ کر کہا۔ جذباتی تلاطم سے وہ یکدم شدید کھانسی میں مبتلا ہو گیا۔

ہو آگے بڑھی اور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی۔ ”بس یہی سوچ سوچ کر ہر پل مرتے رہو۔“

میر جعفر کی کھانسی شدید تر ہو گئی۔ وہ تڑپتے ہوئے پانی پلانے کی التجائیں کرنے لگا۔ ہو نے پانی کا کٹورا اٹھایا اور اس کے ہونٹوں تک لے جا کر یکدم سارا پانی گردن اور سینے پر گرا دیا۔

”اس دھرتی پر رہ کر ہی نرک میں جلتے رہو تو اب میر جعفر! تمہیں کبھی آسان موت نصیب نہ ہو۔“

وہ نفرت سے اس پر تھوک کر چلی گئی۔ میر جعفر کو سراج الدولہ کا لہو اگلتا وجود ہر جانب قہقہے لگاتا دکھائی دینے لگا۔ ایک عشق ناتمام کی دی گئی یہ شکست کسی بھی اذیت سے دو چند تھی۔ میر جعفر کے سینے میں سانس گھٹنے لگی۔ اس اذیت کا کہیں کوئی درماں نہ تھا۔

++

شمارہ اکتوبر 2022ء سے شروع ہونے والا یہ سلسلہ آپ کو بہت زیادہ پسند آئے گا

## پانچواں حصہ

# بقلم خود

منظر امام

ایک ایسا سلسلہ جو خود میں منفرد ہے۔ آپ جن قلمکاروں کی تحریریں پڑھتے ہیں ان کے قلم سے انہی کی سرگزشت۔ ایسے واقعات، سانحات جو آپ کو تحیر میں ڈال دیں۔ زندگی کے پیچ وخم کا تذکرہ، وہ باتیں جو عام طور سے بتائی نہیں جاتیں، جو آپ جاننا چاہتے ہیں۔ اور ایسی تحریریں صرف "سرگزشت" میں ہی شائع ہوسکتی ہیں۔ جسے آپ مجلد کراکر رکھنے پر مجبور ہوجائیں گے۔

معروف کہانی کار، ادارا کار منظر امام کی زندگی کے مخفی گوشے ملاحظہ کریں

میں سلیم بھائی کا خط لے کر آغا طالش سے بھی ملا۔ وہ بہت محبت سے پیش آئے لیکن وہ تو فلم نگری ہے وہاں بات نہ بن سکی۔

وہاں میری ملاقات مشہور فلم اسٹار لہری صاحب سے ہوئی۔ کیا ہنستے بولتے، اسمارٹ سے انسان تھے۔ غلام محی الدین سے کراچی ہی میں جان پہچان تھی۔ ایوب خاور لاہور جا کر سیٹل ہو چکے تھے۔ ایک گمی بھائی زندگی تھی جو ادبی ماحول میں پروان چڑھ رہی تھی۔

میں نے وہاں بہت پریشانیاں بھی اٹھائیں اور خوش بھی رہا۔ پاک ٹی ہاؤس سے جب ہم اٹھتے تو میں، سراج اور طارق زیدی انار کلی سے گزرتے ہوئے شاہ عالمی کی طرف آجاتے۔ یہاں سے میں کن آباد کی راہ لیتا اور سراج اپنے گھر چلے جاتے۔ طارق زیدی کا قیام پاک ٹی ہاؤس کے بالکل سامنے تھا۔

سراج کے گھر والے بھی میرا بہت خیال کرتے۔ خاص طور پر ان کے والد صاحب۔ مولانا عبدالمجید ہاشمی۔ جو ایک ممتاز اسکالر تھے۔ ان کے چھوٹے بھائی بلال۔ یہ وہ عہد تھا جب سراج نے ہر طرح میرا ساتھ دیا۔ مجھے لاہور میں ایڈجسٹ کرنے کی بہت کوشش کی۔ میں وہاں گزارے ہوئے لمحات بھی بھلا نہیں سکتا۔

وہ سراج کے ساتھ مال روڈ کی سیر، ادبی نشستیں، لکھنے لکھانے کے تخلیقی مواقع، یہ سب اس کے بعد نصیب نہیں ہو سکے۔ سراج عام طور پر یہ کیا کرتے کہ ریڈیو یا ٹی وی وغیرہ سے ملنے والے چیک میرے حوالے کر دیا کرتے تھے۔ میں نے وہاں حلقہ ارباب ذوق میں کئی افسانے بھی پیش کیے جن پر سراج نے گفتگو کی اور ان کی گفتگو کے بعد پھر

کس کی مجال ہو سکتی تھی کہ کوئی کچھ بول سکتا۔
میں اکثر یہ سوچا کرتا کہ پاک ٹی ہاؤس کی طرح کراچی میں ایسا کوئی مرکز کیوں نہیں ہے، جہاں سب مل بیٹھے ہوں۔ انتظار حسین، یونس جاوید، سعادت سعید، کبھی کبھی قاسمی صاحب اور نہ جانے کتنے لوگ، کتنے نام، کتنے چہرے۔ سب پاک ٹی ہاؤس کی زینت ہوا کرتے تھے اور آج بھی ہیں۔ بس کچھ لوگ مس ہو گئے ہیں۔ وقت نے انہیں کم کر دیا ہے۔ وہ دور دیس چلے گئے ہیں۔ جیسے سراج منیر۔ زندگی کا کاروبار تو اسی طرح چلتا رہتا ہے لیکن کبھی کبھی کچھ لوگوں کی یادیں پھانس بن کر ہمیشہ کے لیے دل میں اتر جاتی ہیں۔

کراچی کے خطوط بھی میں پاک ٹی ہاؤس کے پتے پر منگوایا کرتا تھا۔ وہیں علی اکبر عباس سے ملاقاتیں رہیں۔ یونس جاوید ساتھ رہے۔ فیض بخش تھے۔ ایک ایسا بے لوث شخص جسے سوائے بھلائی کے اور کچھ نہیں آتا۔

لاہور میں قیام کے دوران دلچسپ واقعات ہوتے رہے۔ مگر وہاں روزگار کا حصول ایک مسئلہ بن کر رہ گیا تھا۔ پھر نہ جانے کس طرح مجھے دو بچوں کی ٹیوشن مل گئی۔ یہ ٹیوشنیں رنگ محل کے علاقے میں تھیں۔ اور جب میں رنگ محل کے علاقے میں داخل ہوا تو بچپن ایک بار پھر میری نگاہوں کے سامنے آ گیا۔ وہی تنگ گلیاں سے سرانجر ہو جانے کا عمل۔ طرح طرح کے سامان فروخت کرنے والے۔ دودھ کی دکانیں۔ اندرون شہر کی خوبصورت لڑکیاں جن کے چہرے تمتماتے ہوئے اور میں ایک مسافر ان کے درمیان سے گزرتا چلا جاتا تھا۔

ٹیوشنیں ایسی نہیں تھیں جن کے طفیل میں خوش حالی آ سکے۔ بہرحال گزارا ہو رہا تھا۔ دوسری طرف سراج منیر تھے جو ساتھ دے رہے تھے۔ پھر اخبار العرب نامی ایک اخبار میں ملازمت مل گئی۔ لطف یہ تھا کہ یہ اخبار عربی میں نکلا کرتا تھا اور میں عربی کا ایک لفظ نہیں جانتا تھا لیکن مترجم حضرات تھے جو میرے لکھے ہوئے مضامین کا ترجمہ کر دیا کرتے۔ اس طرح عزت سادات بحال رہتی تھی۔

لاہور ہی میں انیس الزماں سے ملاقات ہوئی۔ پتا چلا کہ یہ موصوف بھی وہیں کے ہیں جہاں کے ہم ہیں۔ انیس الزماں کا ادب وغیرہ سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا لیکن اس کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ دوستوں کا دوست تھا اور آج وہ لاہور کے خوشحال تاجروں میں ہے۔ جب کراچی آتا ہے تو میرے پاس ضرور آتا ہے۔ اس کے فون آتے رہتے ہیں۔ خط کتابت رہتی ہے۔

انیس الزماں کو لطیفے سنانے کی بہت عادت تھی اور اس کے لطیفے ایسے ہوتے تھے جنہیں سن کر بجائے ہنسی کے افسوس ہوا کرتا تھا۔ سراج نے اس کا نام بھائی لطیفہ گو رکھ دیا تھا۔ انیس مجھ سے ملنے کے لیے پاک ٹی ہاؤس کے چکر لگایا کرتا تھا۔

میں نے جن صاحب کے یہاں قیام کیا تھا۔ وہ بہت مخلص اور ہمدرد لوگ تھے لیکن ایک دشواری یہ تھی کہ وہ بزرگ بہت بولتے تھے اور اتنا بولتے تھے کہ وحشت ہونے لگتی تھی۔ دل چاہتا تھا کہ کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جاؤں یا اپنا سوٹ کیس اٹھاؤں اور اس گھر کو خدا حافظ کہہ دوں۔

میری ان سے ملاقات رات ہی کو ہوا کرتی۔ ذرا تصور کریں۔ سردیوں کی راتیں، لحاف میں دبکے ہوئے، کمرے میں جلتا ہوا ہیٹر۔ اس وقت میٹھی میٹھی سی نیند آ رہی ہوتی لیکن جب وہ بولنا شروع کرتے۔ شومئی قسمت میں ان کے ہی کمرے میں سویا کرتا تھا اس لیے مجھ پر لازم تھا کہ میں ان کی باتیں سنتا رہوں اور یہ بھی ضروری تھا کہ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہوں ہاں بھی کرتا رہوں۔ ورنہ وہ خود ہی دریافت کر لیتے تھے۔ ”ہاں تو بھئی۔ میں کیا کہہ رہا تھا۔“

داتا گنج بخش کا عرس قریب آ رہا تھا۔ ایک رات میں نے ان سے یوں ہی دریافت کر لیا۔ ”آپ عرس میں تو شریک ہوتے ہوں گے۔“

”ہرگز نہیں۔ کیونکہ وہاں رش بہت ہوتا ہے۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔“ میں چل کر بولا۔ ”پھر تو آپ زندگی بھر حج بھی نہیں کر سکتے کیونکہ وہاں تو اور بھی رش ہوتا ہے۔“

میری یہ بات سن کر وہ بزرگوار بہت ناراض ہو گئے تھے۔

لاہور کی ایک بات جو مجھے پسند آئی تھی وہ یہ تھی کہ تقریباً سارے ثقافتی مراکز دو چار میل کے دائرے میں تھے۔ ٹاؤن ہال۔ لائبریری۔ ٹی وی اسٹیشن۔ ریڈیو اور پاک ٹی ہاؤس وغیرہ۔ شاید اسی لیے ادیبوں کی وہاں ایک دوسرے سے ملاقات ہو جایا کرتی ہے۔

ایوب خاور کی پوسٹنگ اسلام آباد ٹی وی میں تھی۔ اس نے مجھے پیغام بھیجا کہ میں اس سے ملنے کے لیے اسلام آباد آ جاؤں۔ میرا کیا تھا۔ میں نے اپنا بیگ سنبھالا اور اسلام آباد روانہ ہو گیا۔ جیب میں صرف ایک طرف کا کرایہ تھا۔



سخت سردی پڑ رہی تھی۔ اسلام آباد پہنچا تو رات ہو چکی تھی۔ سردی نے اعصاب تک منجمد کر دیے تھے۔ زیرو پوائنٹ پر واقع ایک فلیٹ میں ایوب خاور کی وہاں رہائش تھی۔ اور جب رات کے دس بجے وہاں پہنچا ہوں تو پتا چلا کہ وہ موصوف فیصل آباد گئے ہوئے ہیں۔ ان کے گھر میں تالا تھا اور یہ اطلاع پڑوسیوں نے دی تھی۔ خود اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ جیب میں ایک پیسا بھی نہیں۔ سخت سردی۔ رات کا وقت۔ اور ایک ایسا شہر جہاں مجھے کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہر طرف سناٹا چھایا ہوا۔ آج کا حال مجھے نہیں معلوم لیکن اس وقت ان شہروں میں ویرانیاں بہت جلد اتر آتی تھیں۔

بہرحال ایک ہی خیال ذہن میں آیا کہ کیوں نہ ٹی وی اسٹیشن پہنچ جاؤں۔ ٹی وی کے حوالے سے کچھ لوگ مجھے جانتے تھے۔ خیال تھا کہ شاید ان میں سے کوئی اس نازک وقت میں میری مدد کرے۔ اس وقت ٹی وی اسٹیشن چکلالہ میں ہوا کرتا تھا۔ میں کسی نہ کسی طرح وہاں پہنچ گیا۔ یہ اتفاق تھا کہ ٹرانسمیشن جاری تھی اور ایک اناؤنسر وہاں موجود تھی۔ اس بچاری نے میری بہت مدد کی۔ وہ مجھے اپنے گھر لے گئی۔ اسے بھی شاعری کا بہت شوق تھا۔ ہم ساری رات ایک دوسرے کو اشعار سناتے رہے۔

صبح پُرتکلف ناشتے کے بعد اس نے مجھے سو روپے دیے اور میں لوٹ کر لاہور آ گیا۔ اس لڑکی کی ملاقات سے مجھے اس شعر کی صداقت پر یقین آ گیا۔ ”سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے۔ ہزار ہا شجر سایہ دار راہ میں ہے۔“

ایک اور واقعہ سناتا چلوں۔ میں اپنے معاشی حالات سے بہت تنگ تھا۔ میں نے داتا دربار پر جا کر ایک شکایت نامہ عرض کر دیا۔ جس کا مطلع تھا۔ ”اس نگری میں آئے داتا بیت گیا ایک سال۔ کہیں پہ کوئی پھول نہ مہکا بیت گیا ایک سال۔“

یہ شکایت نامہ عرض کرنے کے بعد میں پاک ٹی ہاؤس چلا آیا۔ یہاں علی اکبر عباس میرے انتظار میں تھے۔
”ارے بھئی۔ میں تمہیں بہت دیر سے تلاش کر رہا ہوں۔“
”خیریت تو ہے۔“
”ہاں خیریت ہے۔ پرسوں سے داتا صاحب کا عرس شروع ہو رہا ہے اور تمہیں داتا صاحب کے عرس کا پروگرام لکھنا ہے۔“ علی اکبر عباس نے کہا۔
میری آنکھوں میں عقیدت کے آنسو آ گئے۔ کسی

## فاطمہ رضی اللہ عنہا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بیٹی تھیں۔ ان سے آنحضرت کو بہت الفت تھی۔ ان کی پیدائش بقول ابن جوزی نبوت سے پانچ برس پہلے ہوئی اور نکاح پندرہ برس پانچ مہینے کی عمر میں حضرت علیؓ سے غزوہ احد کے بعد ہوا۔ امام حسن و حسین آپ ہی کے بطن سے ہیں۔
مرسلہ: نعمان فردوس، کراچی

---

آنحضرت ﷺ نے ابوسعید بن المعلیٰؓ سے فرمایا: کیا نہ سکھلاؤں میں تجھ کو ایسی سورت جو قرآن میں (از روئے فضائل) سب سورتوں سے بڑی ہے۔ پھر فرمایا وہ سورۃ الحمدللہ رب العالمین ہے۔ وہ سات آیات ہیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں اور قرآن ہے بڑا کہ دیا گیا ہے مجھ کو۔ اس حدیث کے آخری کلمات میں اس آیت کی طرف اشارہ ہے: ولقد اتینک سبعا من المثانی والقرآن العظیم (اے پیغمبر) ہم نے تم کو سات آیتیں کہ مکرر پڑھی جاتی ہیں نماز میں یا ثنا کی گئی ہے۔ ان کی فصاحت و اعجاز کے متعلق۔ اور دیا ہم نے تم کو قرآن عظیم۔ اس سے مراد فاتحہ ہے چونکہ یہ قرآن کا جزو اعظم ہے اس لیے اس کو قرآن عظیم سے تعبیر فرمایا۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلو پیڈیا
مرسلہ: احسن فاروق، کوٹ ادو

شکایت کی اتنی جلدی تلافی ہوتے ہوئے میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ اس پروگرام کو لکھنے میں سراج نے میری بہت مدد کی تھی۔ میں نے اس کے کہنے پر کچھ کتابوں پر تبصرے بھی کیے۔ جن کا معقول معاوضہ مل رہا تھا۔ سراج کی یہ خواہش رہی کہ میں لاہور کا ہو کر رہ جاؤں۔ لاہور سے واپس نہ جاؤں اور جہاں تک میرا اپنا تعلق ہے تو میں خود بھی اس شہر کو بہت پسند کرتا ہوں۔ اس شہر کی اپنی تہذیب اور ثقافتی آب و ہوا ہے۔ اس شہر میں بکھری ہوئی عمارتیں مجھے ماضی میں لے جاتی ہیں اور میں یہ عرض کر چکا ہوں کہ میں اپنی سرشت میں ماضی ہی کا انسان ہوں۔ لیکن کراچی میں رشتے پیروں کی زنجیر بنے رہتے ہیں۔ اس وقت بھی تھے اور آج بھی ہیں۔ آج بھی پھوٹتے خون کے ہیں اور کچھ دل کے۔
ایک رات میں نے محسوس کیا کہ جہاں میرا قیام ہے

وہاں شاید میں گراں گزر رہا ہوں۔ بہرحال اس احساس کے ساتھ ہی دوسرے دن میں وہاں سے رخصت ہو گیا۔ ویسے ان لوگوں کا یہ احسان ہے کہ انہوں نے بہت دنوں تک میری پذیرائی کی۔ مجھے اپنے گھر میں ٹھہرائے رکھا۔ ورنہ اس دور میں تو ایک رات بھی بھاری ہو جاتی ہے۔

اب سوال یہ تھا کہ میں کہاں جاؤں۔ اس وقت انیس الرحمان نے میری مدد کی۔ اس نے مجھے کرائے پر ایک کمرا دلوا دیا تھا۔ زندگی میں پہلی بار اس کمرے میں کچھ چیزیں میری اپنی تھیں۔ جیسے بستر، چارپائی، مٹی کے تیل کا چولہا، کچھ برتن وغیرہ۔

اخبار العرب میں ملازمت اور ٹیوشن کا سلسلہ جاری تھا۔ ادبی صورت حال بہت بہتر تھی۔ ایک شام پاک ٹی ہاؤس پہنچا تو پتا چلا کہ وہاں بابا رضوی زرقی بیٹھے ہوئے ہیں۔ بس کچھ نہ پوچھیں۔ ان دونوں کو دیکھ کر کیسی تقویت ہوئی تھی۔ بابا رضوی اپنے مریدوں کی دعوت پر روحانی دورے پر آئے ہوئے تھے۔ ممتاز بھی ساتھ ہو لیا تھا کہ مسافرت کی زندگی تھی۔ بابا رضوی کے لاہور آنے کے بعد ہمارے معاشی حالات بہتر ہو گئے تھے۔ بابا رضوی اپنے عقیدت مندوں سے جو کچھ حاصل کرتے۔ اس کا ایک حصہ ہم لوگوں پر خرچ کر دیا کرتے اور وہ ایک حصہ بھی بہت ہوتا تھا۔

بابا رضوی کے حوالے سے ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ لگے ہاتھوں اسے بھی سناتا چلوں۔ حالانکہ یہ واقعہ میری کہانی کے تسلسل سے ہٹا ہوا ہے لیکن یاد آ گیا ہے۔ اس لیے تحریر کر رہا ہوں۔ میں نے اس زمانے میں ناظم آباد میں رہائش اختیار کر لی تھی۔ حیدری کے پاس (اور آج تک وہیں ہوں) گھر کے پاس ہی مشہور سیاسی شخصیت تمیس صدیقی بھی رہا کرتے تھے۔ ایک بڑا سا مکان۔ جس کا لان ہی بہت بڑا تھا اور اس لان کے وسط میں بنے ہوئے دو چار کمروں کے مکان۔

تمیس صاحب اور ان کی بیگم شاہدہ تمیس اس زمانے میں ایک میگزین نکالا کرتے تھے۔ میں نے بھی وہ میگزین جوائن کر لیا اور میری شام کی بیٹھک تمیس صاحب کے ہاں ہونے لگی۔ ایک خوبصورت انسان۔ سلجھی ہوئی گفتگو کرنے والے۔ مشہور صحافی، ادیب اور کالم نویس جناب نصر اللہ خان بھی روزانہ شام کو وہیں آ جایا کرتے تھے اور گھنٹوں محفل جمی رہتی تھی۔ نصر اللہ صاحب بھی حیدری میں میرے پڑوسی تھے۔ وہ جب اپنی زندگی کی کہانیاں بیان کرتے تو لطف آجاتا تھا۔

جب وہ مشہور افسانہ نگار منٹو سے اپنی دوستی کا حال بتاتے تو میں بہت دھیان سے سنا کرتا۔ سب بڑے لوگ تھے اور بڑے لوگ ہیں۔ کچھ لوگوں سے تعلق اس طرح بھی استوار ہوا ہے۔

مشہور افسانہ نگار شوکت صدیقی صاحب سے بھی ملاقات دوسرے انداز سے ہوئی تھی۔ میری رہائش طیر میں تھی اور میں ان کے بچوں کو ٹیوشن پڑھانے ناظم آباد آیا کرتا تھا۔ بہرحال ایک دن میں نے تمیس صدیقی سے بابا رضوی کا تذکرہ کیا۔ کہنے لگے۔ ”ایک دن ان کو لے آئیے۔ میگزین کے لیے ایک فیچر تیار کر لیں گے۔“

میں بابا رضوی کو اپنے ساتھ تمیس صاحب کے یہاں لے آیا۔ بابا رضوی نے اس دن حیرت انگیز کمالات دکھائے۔ اپنے دل کی دھڑکنیں روک لیں۔ نبض کی رفتار روک لی اور اس موقع کی تصویریں اس میگزین میں شائع ہوئیں۔ میں نے اس میگزین کے لیے بہت دلچسپ فیچر اور مضامین وغیرہ تحریر کیے تھے۔ پھر تمیس صدیقی نارتھ سے شفٹ کر گئے۔ نصر اللہ خان صاحب سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

لاہور میں بابا رضوی نے ایک دن طارق زیدی کے یہاں روحانیت کی ایک محفل بھی منعقد کی۔ اس میں ممتاز رفیق اور سراج منیر بھی تھے۔ بابا نے روحوں کو بلانے کا مظاہرہ کیا تھا۔ میں یہ نہیں بتا سکتا کہ روحیں آئیں بھی یا نہیں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ مظاہرہ بہت حیران اور مرعوب کر دینے والا تھا۔

اس گھر سے نکل کر سراج نے مجھ سے کہا۔ ”میرے عزیز۔ یہ سب کیا تھا؟“

”پتا نہیں بھئی۔ خود میری سمجھ میں نہیں آسکا ہے کہ یہ سب کیا تھا۔“

ایک بار ایک اور دلچسپ واقعہ ہوا۔ میں پاک ٹی ہاؤس میں بیٹھا تھا کہ کچھ نوجوان وہاں داخل ہوئے۔ (اب تو یادداشت میں ان کے نام بھی محفوظ نہیں رہے) انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا اور مجھے پہچان کر میرے پاس آ گئے۔

”آپ منظر امام صاحب ہیں نا۔“ ایک نے دریافت کیا۔

”ہاں۔“ میں نے اپنی گردن ہلا دی۔

”ہم مقامی کالجوں کے طالب علم ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”اور آپ سے ایک ضروری بات کرنے کے لیے آئے ہیں، لیکن یہ بات یہاں نہیں ہوگی۔ برابر والے کافی ہاؤس میں چلتے ہیں۔“

خیر میں ان کے ساتھ برابر والے کافی ہاؤس میں چلا گیا۔ وہ میرے ارد گرد بیٹھ گئے، پھر ان میں سے ایک نے گفتگو شروع کی۔ ”دیکھیں منظر صاحب۔ بات یہ ہے کہ ہم آپ کو کوئی اطلاع دینے نہیں آئے۔ یا آپ سے کسی قسم کا مشورہ بھی نہیں چاہیے۔ کہانی کچھ یوں ہے کہ ہم سب مقامی کالجوں سے تعلق رکھتے ہیں اور اس معاشرے کی صورت حال پر افسوس کرتے رہتے ہیں۔ یہاں جو کچھ ہو رہا ہے۔ وہ ناقابل برداشت ہے۔ چاہے وہ کوئی بھی شعبہ ہو۔ سیاست کا، تجارت کا، تعلیم کا۔ ہر جگہ اتنی غلاظت ہے کہ باہر اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔“

”جی ہاں۔ یہ بات تو ہے۔“ میں نے اس کی تائید کی۔

”اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کو تبدیل کیسے کیا جائے۔ تو اس کے دو طریقے ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ بزور طاقت جبر کے ذریعے ایسے لوگوں کو سیدھی راہ پر لایا جائے اور دوسرا طریقہ یہی ہے کہ قوم میں شعور پیدا کیا جائے۔ سمجھایا جائے لیکن گزشتہ کئی برسوں سے اس ملک میں یہی سب ہو رہا ہے۔ سمجھانے والے بول بول کر تھک چکے ہیں۔ ادیب، شاعر اور صحافی حضرات کاغذ پہ کاغذ سیاہ کیے جا رہے ہیں لیکن ابھی تک کچھ بھی نہیں ہوا اور آئندہ بھی کچھ نہیں ہوگا۔ یہ قوم بے حس ہو چکی ہے۔“

”آپ ٹھیک کہتے ہیں۔ پوری قوم ہی بے حس ہو چکی ہے۔“ میں نے کہا۔

”بس تو ہم قوم کو احساس دلانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ ابھی جو کچھ ہو رہا ہے۔ قوم اچھی طرح جانتی ہے لیکن اس نے لاشعوری طور پر اس بگاڑ کو قبول کر لیا ہے۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ایک دفعہ دھماکا کر دیا جائے۔ پوری قوم چیخ اٹھے۔ اخبارات متوجہ ہو جائیں۔ انٹرنیشنل میڈیا ہمارے حالات بیان کرنے لگے تو ہو سکتا ہے کہ اس وقت بہتری کی صورت نکل آئے۔ ایسے لوگوں کا محاسبہ ہو جنہوں نے قوم کو اس حال تک پہنچا دیا ہے۔“

”میرے بھائی۔ ایسا زوردار بلاسٹ آخر کیسے ہوگا؟“

”ہم پوری پلاننگ کر کے آپ کے پاس آئے ہیں۔ ہم سات بندے ہیں اور ہم ساتھ ہی باری باری ایک مقصد کے لیے خودکشی کریں گے۔“

”کیا؟“ میں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“

”ہاں جناب۔ ہم سبھوں نے یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ یہ مان لیا ہے کہ خودکشی بہت بڑا گناہ ہے۔ خدا کے یہاں اس کی معافی نہیں ہے لیکن ہم ایک عظیم مقصد کے لیے ایسا کر رہے ہیں۔ لاکھوں کروڑوں کی بھلائی کے لیے ہو سکتا ہے کہ خدا ہمیں معاف کر دے۔“

”لیکن آپ لوگ یہ سب کس طرح کریں گے۔“ میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

وہ لوگ پوری منصوبہ بندی کے ساتھ آئے تھے۔ ان میں سے ہر ایک کو ایک مقصد کے لیے جان دینی تھی۔ مثال کے طور پر ارشد کو محکمہ صحت کی خرابیوں کے لیے مرنا تھا۔ انور کو محکمہ تعلیم کے لیے۔ اس طرح باری باری سب مر جاتے اور انہوں نے خودسوزی کا طریقہ سوچ رکھا تھا۔ یعنی اپنے آپ کو جلا کر۔ کسی بھی چوراہے پر کھڑے ہو کر کوئی اپنے بدن میں آگ لگا لیتا۔

اس پورے قصے میں میری شمولیت کچھ یوں ہوئی تھی کہ انہیں یہ معلوم تھا کہ میں افسانہ نگار ہوں۔ لکھتا لکھاتا رہتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ انہوں نے مقامی ادیبوں سے اپنی حمایت کی درخواست کی ہو، لیکن مقامی ادیبوں نے ان کی طرف توجہ نہ دی ہو اس لیے ان کا دھیان میری طرف ہو گیا ہو کہ میں ان کے حق میں لکھنے کا سلسلہ شروع کر دوں۔ ان کی خودکشی کو دنیا کی عظیم موت قرار دوں۔ لوگوں کو احساس دلاؤں کہ ان نوجوانوں نے جو کچھ کیا ہے وہ ان ہی کی بھلائی کے لیے کیا ہے اور ان کی یادگاریں وغیرہ تعمیر کی جائیں۔

میں خواہ مخواہ اس چکر میں ملوث ہونے لگا تھا۔ میرا دل جانتا ہے کہ میں نے کس طرح ان لوگوں کو اس ارادے سے باز رکھا ہوگا۔ کتنی دیر تک ان کے سامنے تقریر کی ہوگی۔ شاید میں نے ان سے یہی کہا ہوگا کہ وہ کیوں اپنی جانیں گنوا رہے ہیں۔ کیونکہ یہ قوم مکمل بے حس ہو چکی ہے۔ ان کے جل مرنے کے باوجود اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگے گی۔ لہٰذا ان کی اس عظیم قربانیوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا اس لیے وہ اپنے ارادے سے باز آ جائیں اور اپنے آپ کو بجانے سنوارنے کی کوشش کریں۔ قوم کو اس کے حال پر چھوڑ دیں۔ وغیرہ وغیرہ۔

وہ لوگ شاید مجھ سے بھی مایوس ہوکر چلے گئے تھے لیکن میں نے یہ نہیں سنا کہ ان میں سے کسی نے خودکشی کرلی ہو۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ کوئی عام واقعہ نہیں ہے۔ بلکہ بہت خاص بات ہے۔ نوجوانوں کی فرسٹریشن۔ کچھ لوگ ہر دور میں بے حد حساس رہے ہیں۔ وہ پورے سیٹ اپ کو بدلنا چاہتے ہیں۔ لیکن یہ سیٹ اپ کیسے بدلے؟

"میرے عزیز۔ یہ سب باتیں تمہارے بس کی نہیں ہیں۔" سراج منیر کہا کرتے ہیں۔ "یہ سب قضا وقدر کا معاملہ ہے۔"

سراج منیر بہت اچھے ستارہ شناس اور پامسٹ بھی تھے۔ اپنا ایک واقعہ بہت مزے سے سناتے تھے۔ "میرے عزیز۔ ان دنوں میں کراچی میں نیا نیا آیا تھا۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیا کروں۔ پھر میں ناظم آباد چورنگی کے ایک ہوٹل میں جاکر بیٹھ گیا اور لوگوں کے ہاتھ دیکھنے شروع کردیے۔ ذرا سے دنوں میں دھوم مچ گئی۔ ایک دن محترم جون ایلیا بھی اپنا ہاتھ دکھانے میرے پاس چلے آئے۔ بس پھر کیا تھا۔ میں نے انہیں گھیر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جون ایلیا نے مجھے عالمی ڈائجسٹ میں بلالیا۔"

سراج بہت دنوں تک عالمی ڈائجسٹ میں لکھتے بھی رہے تھے۔

میں لاہور کے شب وروز کے بارے میں بتا رہا تھا۔ ممتاز رفیق اور بابا رضوی لاہور آچکے تھے۔ ہم روزانہ ایک دوسرے سے ملا کرتے۔ لاہور کی سیر ہوتی۔ ایک دفعہ لاہور کے ایک دوست نے مجھ سے کہا۔ "یار۔ تم کرائے کے ایک معمولی سے کمرے میں پڑے ہوئے ہو۔ چلو میں تمہیں اپنے ایک دوست کے پاس لے چلتا ہوں۔ اس بندے کے پاس دو تین کمرے ہیں اور اکیلا رہتا ہے۔ تمہیں وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"

میں نے اور ممتاز رفیق نے یہ سوچا کہ کرائے والے کمرے کو فی الحال خالی نہ کیا جائے۔ اور یوں ہی آزمائش کے طور پر دو چار دن ان صاحب کے پاس رہ کر دیکھ لیا جائے۔ اگر بات بن گئی تو پھر مستقل وہیں آجائیں گے۔

ہم اس کے خلوص سے بہت متاثر ہوئے تھے۔ رات دس بجے وہ شخص ہمارے کمرے میں آکر بیٹھ گیا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے بعد اس نے اپنے گاؤں کے حالات بیان کرنے شروع کردیے۔ یہ چونکہ کچھ نیا موضوع تھا۔ اس لیے ہم کچھ دلچسپی سے سنتے رہے۔ اس کے بعد بوریت ہونی شروع ہوگئی۔ خدا کی پناہ۔ اس شخص نے پورے گاؤں کی سیر کرادی تھی۔ ایک ایک آدمی کا حال۔ اس کی عادتیں۔ اس کا خاندانی پس منظر۔ وہاں کی فصلیں۔ گھروں میں کیا کیا ہوتا ہے۔ کس نے کیا کیا۔ کون کس مزاج کا ہے۔ کس کے ساتھ وہ کہاں گیا اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ شخص تین بجے رات تک مسلسل بولتا رہا تھا اور ہمارا یہ حال تھا کہ نیند اور تھکن سے ہماری حالت غیر ہورہی تھی۔ دل چاہ رہا تھا کہ اس کے آگے ہاتھ جوڑ لیں کہ خدا کے بندے ہمیں معاف کردے لیکن اس سے کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے۔ لہٰذا تین بجے رات تک اسے برداشت کرتے رہے اور جب وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا تو ہم نیم بے ہوش ہوگئے تھے۔

ہم زیادہ دیر تک سو نہیں سکے تھے۔ کیونکہ صبح اٹھ کر ہمیں ادھر ادھر جانا ہوتا تھا۔ صبح آٹھ بجے اٹھ کر وہاں سے روانہ ہوگئے اور دوسری رات پھر وہی ہوا۔ اس رات وہ اپنے عشق کی داستان سنا رہا تھا۔ تیسری رات ہم نے اس کی مہمان نوازی کا شکریہ ادا کیا اور کرائے کے کمرے میں واپس آگئے۔ کسی اور کے یہاں رہنے کا تجربہ بہت تلخ ہوا تھا۔

ہم اچھے جملوں سے لطف لیا کرتے تھے۔ لاہور میں تو جگت بازی باقاعدہ ایک فن کا درجہ رکھتی ہے۔ ایک سے ایک جگت باز وہاں موجود ہیں۔ سراج اور میں آپس میں بہت زبردست فقرے بازی کیا کرتے تھے۔ میری فقرے بازی کا اعتراف دوست بھی کیا کرتے تھے لیکن نہ جانے کیوں اب میں ایک اچھا جملہ بھی نہیں بول سکتا۔ کوئی مجھ پر فقرہ لگاتا ہے تو جواب نہیں دے پاتا۔ پتا نہیں کیا بات ہے۔ ورنہ مجال نہیں تھا کہ کوئی مجھ پر فقرے چسپاں کرسکتا۔

شاید یہ وقت کی جگت بازی ہے۔ جو انسان کو چت کردیتی ہے۔ وقت سے بڑا فقرہ لگانے والا اور کون ہوسکتا ہے۔ جس کے سامنے زبانیں خاموش ہوجاتی ہیں۔ جاوید بھی اس فن میں کسی سے کم نہیں تھے۔ بلکہ دو ہاتھ آگے ہی تھے۔ ابھی بھی اپنے تمام تر حالات کے باوجود ایک آدھ فقرہ لگا ہی جاتے ہیں۔

ہمارے حلقہ احباب میں مرحوم جمال احسانی بہت زبردست فقرے باز تھے۔ قمر جمیل صاحب بھی جب بولنے پر آجاتے تو کمال کے فقرے چسپاں کردیتے تھے۔

ایک دن سراج مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ "آؤ یار۔ تمہیں تمہارے کچھ دشمنوں سے ملواتے ہیں۔"



میرا خیال ہے کہ وہ داتا دربار کے پاس کوئی ہوٹل تھا۔ جہاں سراج اپنے ساتھ لے آئے تھے اور اس ہوٹل میں جاوید اور شگفتہ آئے ہوئے تھے۔

"ارے... تم دونوں یہاں کہاں؟" میں حیرت اور خوشی سے بوکھلا گیا تھا۔

"بس۔ ہم لوگ بھی لاہور کی خاک چھاننے کے لیے آپ کی طرح یہاں چلے آئے ہیں۔" شگفتہ نے جواب دیا۔

ان دونوں کے لاہور آجانے کے بعد لاہور بھی کراچی جیسا محسوس ہونے لگا۔ بابا رضوی کراچی واپس چلے گئے تھے لیکن ممتاز رفیق، احمد جاوید، شگفتہ، سراج منیر سب کے سب وہیں موجود تھے۔ شگفتہ اپنے فراخ دلانہ مزاج کے ساتھ لاہور آئی تھی۔ وہی خرچ کا انداز جو کراچی میں تھا وہ لاہور میں بھی رہا تھا۔

کئی دنوں تک ہم لاہور کو سمجھنے اور اس کی روح میں اترنے کی کوشش کرتے رہے۔ پھر شاید شگفتہ کراچی واپس ہوگئی۔ جاوید بھی اس کے ساتھ تھے۔ ممتاز بھی چلے گئے۔ صرف میں رہ گیا تھا اور لاہور کے شب وروز۔ جہاں اگر سراج کی محبت اور توجہ حاصل نہ ہوتی تو میں اب رہ نہیں سکتا تھا۔ کراچی کے لوگ یاد آرہے تھے۔

دراصل ہم لوگوں کے ساتھ صورت حال یہ رہی ہے کہ معاشی پریشانیاں ایک جال کی طرح اپنی گرفت میں لے لیتی ہیں۔ وہ اپنے دائرے سے نکلنے نہیں دیتیں۔ لاکھ کوششوں کے باوجود۔ ارادہ اور خواہش تو یہی تھی کہ کچھ دن کراچی رہ کر لاہور چلا جاؤں گا۔ سراج نے وہاں اچھی خاصی پوزیشن حاصل کرلی تھی۔ اس کی ذہانت اور علمیت نے اس کو بہت معتبر اور معزز کردیا تھا لیکن یہ نہیں ہوسکا۔ یعنی میں کراچی سے اپنے آپ کو چھڑا نہیں سکا۔ یہ شہر کسی آکٹوپس کی طرح مجھ سے چمٹ کر رہ گیا تھا۔

سراج مرحوم کی بہت خواہش تھی کہ میں لاہور آجاؤں۔ ایک بار لاہور سے فیض بخش بھی مجھے بلانے کے لیے آئے۔ بلکہ سراج نے باقاعدہ میرا کرایہ وغیرہ دے کر انہیں روانہ کیا تھا کہ کسی بھی حال میں ہو اس بندے کو لاہور لے آؤ۔ لیکن مجبوریاں آکٹوپس۔ ایک کے بعد دوسرا مسئلہ۔ ایک الجھن کے بعد دوسری الجھن۔ جس نے مجھے کہیں کا بھی نہیں رکھا۔

جاوید اور شگفتہ کے شاید انچولی والے مکان میں وہ

واقعہ رونما ہوا۔ جس سے متاثر ہو کر شاید آسمان تک دیوار بھی سیریل بھی گئی۔ ہوا یہ کہ شگفتہ نے ایک بچے کو جنم دیا جو اتنا کمزور اور لاغر تھا کہ وہ جانبر نہیں ہو سکا۔ بس اتنی سی بات تھی اور اس قسم کے سینکڑوں لاکھوں واقعات ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن مجبوریوں کو تماشا بنا دیا گیا۔ داستانیں گڑھ لی گئیں کہ صاحب جاوید اس وقت بھی گھر سے باہر ہوتے۔ دوستوں کے درمیان۔ انہیں پروا ہی نہیں تھی کہ ان کی بیوی اس لمحے جس کرب سے گزر رہی ہے۔ گھر میں بچے کی لاش پڑی ہے اور اسے پیسے بھی نہیں کہ اس کی آخری رسومات وغیرہ ادا کی جائیں۔

دراصل یہی وہ مجبوری تھی۔ جس نے جاوید کو اس وقت گھر سے دور کر دیا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ٹارگٹ بہت آسان دکھائی دیتا ہے کہ بس اس کے پاس گئے اور اس سے پیسے لے کر آ بھی آگئے لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے۔ جب دشواریاں ہونے والی ہوتی ہیں۔ جب کہانیاں اپنے تخلیق کے مرحلے میں ہوتی ہیں۔ جب وقت کسی حادثے کی پرورش کا فیصلہ کر لیتا ہے تو وہ آسان ٹارگٹ بھی انتہائی دشوار ہو جاتا ہے۔ آپ جس کو نگاہ میں رکھ کر اس کے پاس جاتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ کچھ دیر پہلے وہ گھر سے کہیں چلا گیا ہے اور یہ بھی نہیں معلوم کہ اس وقت وہ کہاں ہوگا۔ آپ سوچتے رہ جاتے ہیں کہ اب کیا کیا جائے پھر آپ کسی دوسرے کے پاس جاتے ہیں۔ وہاں بھی کچھ ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر صورت حال یہ ہوتی ہے کہ آدمی بے زار ہو جاتا ہے۔ جہنم میں جائے۔ وہ سوچتا ہے۔ جب کچھ ہونا نہیں ہے تو پھر میں کیوں اپنے آپ کو ہلکان کروں۔

میں اس موقع پر موجود نہیں تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ جاوید کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا ہوگا۔ وہ بے چین ہو کر چاروں طرف گھوم رہا ہوگا۔ پھر تھک ہار کر ایک طرف بیٹھ گیا لیکن شگفتہ کا بیان کچھ اور تھا۔ "منظر بھائی۔ اس نے دھیان ہی نہیں دیا۔ مڑ کر بھی نہیں دیکھا۔ اسے پروا ہی نہیں تھی کہ مجھ پر کیا گزر رہی ہے۔"

میں یہ بات اپنے تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں کہہ سکتا ہوں کہ جاوید ایک ذمے دار اور محبت کرنے والا شوہر تھا کیونکہ اس کی محبت کا ایک تماشا میں نے خود دیکھا ہے۔

ان کا مکان حیدر آباد کالونی میں تھا۔ کرائے کا یہ مکان مرحوم سید ساجد نے دلوایا تھا۔ ان کے مکان کے بالکل پیچھے تھا۔ ایک شام وہاں پہنچا تو مجھے بہت تیز بخار ہو رہا تھا۔ جاوید نے کہا۔ "آؤ۔ تمہیں ڈاکٹر کے پاس لے چلوں۔"

اس وقت شگفتہ نے مخالفت کی۔ "جاوید آپ آرام کریں۔ منظر بھائی کو میں لے جاتی ہوں۔"

ہم دونوں پیدل ہی چل دیے۔ راستے میں شگفتہ نے کہا۔ "منظر بھائی۔ کیوں نا کسی ہوٹل میں بیٹھ کر ایک کپ چائے پی جائے۔ اس کے بعد ڈاکٹر کے پاس چلیں گے۔"

مجھے کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ہو لیا۔ ہم گرومندر کے ایک ہوٹل میں آکر بیٹھ گئے۔ میں نے محسوس کیا کہ شگفتہ اس شام کچھ پریشان اور بے چین تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن شاید کچھ سوچ کر رک جاتی تھی۔

"کیا بات ہے۔ خیریت تو ہے۔" میں نے پوچھا۔

"تم کچھ کہنا چاہتی ہو؟"

"ہاں۔ ایک بہت ضروری بات جو میں صرف آپ سے کہہ سکتی ہوں۔" اس نے کہا۔

"بتاؤ۔ میں وہ بات سننے کے لیے پوری طرح تیار ہوں۔"

وہ پھر ہچکچانے لگی۔ جہاں تک میں سمجھتا ہوں۔ بات کچھ اور تھی۔ وہ مجھ سے کچھ اور کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ یا کوئی اور مسئلہ تھا۔ بہرحال بہت دیر کی ہچکچاہٹ کے بعد اس نے جو بات بتائی وہ بہت خوفناک تھی۔

اس کے بیان کے مطابق کوئی بڑا غنڈہ اس کے پیچھے پڑا ہوا تھا اور اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ گھر آکر اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔ یہ سب کچھ بتاتے ہوئے اس نے درخواست کی۔ "دیکھیں۔ یہ باتیں آپ جاوید سے نہیں کہیں گے۔"

"یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ معاملہ اس کے گھر کا ہے۔ اس کا اپنا ہے۔ اس کی بیوی کا ہے اور اس کو بے خبر رکھا جائے۔ خدانخواستہ کچھ ہو گیا تو مجھ پر بھی الزام آ سکتا ہے کہ جب یہ بات معلوم ہو گئی تھی تو پھر بتایا کیوں نہیں۔"

"ٹھیک ہے تو پھر بتا دیجیے گا۔" وہ بڑے آرام اور اطمینان سے بولی۔

ایک حیرت انگیز بات جو میں نے محسوس کی وہ یہ تھی کہ وہ اب بالکل پُرسکون ہو گئی تھی۔ جیسے اس کی ساری پریشانی اچانک ہی ختم ہو گئی ہو۔ وہ ہمیشہ کی طرح ہنس رہی تھی۔ اپنی کہانی سنا رہی تھی۔ جاوید کے دوستوں کے بارے میں بتا رہی تھی۔ ان کی تحلیل نفسی کر رہی تھی۔ [illegible] نے کہا



بھید تھا۔

بہرحال ہوٹل سے نکل کر ہم ڈاکٹر کے پاس گئے اور گھر واپس آگئے۔ جاوید گھر ہی پر تھے۔ میں نے محتاط الفاظ میں جاوید کو ممکنہ حادثے کے بارے میں آگاہ کر دیا اور میں اس وقت کا شاہد ہوں۔ میں نے اس کی جو حالت دیکھی وہ آج تک میرے ذہن پر نقش ہے۔ وہ انتہائی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کی ساری پریشانی صرف اس لیے تھی کہ شگفتہ کو کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔

ہم دونوں سر جوڑ کر بیٹھ گئے کہ اس مسئلے سے کیسے نمٹا جائے۔ جاوید تو صرف شاعری، ادب اور تصوف کا آدمی تھا۔ اس قسم کی غنڈہ گردی سے نمٹنا اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ وہ مار پیٹ وغیرہ کی باتوں میں دلچسپی لیتا تھا لیکن صرف زبانی۔ اسے بدمعاشوں اور داداؤں کی صرف کہانیاں یاد تھیں۔ ان سے کبھی سابقہ نہیں پڑا تھا۔

میں اس کی پریشانی دیکھ دیکھ کر پریشان ہو رہا تھا۔ میں بھی ایک کمزور سا آدمی تھا۔ اس قسم کی جسمانی غنڈہ گردی کا مقابلہ کرنے کی ہمت نہیں تھی لیکن معاملہ جاوید کا تھا اور چاہے کچھ بھی ہو جائے مجھے اس کا ساتھ دینا تھا۔

ہم دونوں اس غنڈے کے خلاف مدد حاصل کرنے کے لیے کئی دوستوں کے پاس گئے لیکن سب کے سب شاعر اور ادیب تھے۔ قلم کی جنگ ہوتی تو وہ دل و جان سے ہمارے ساتھ ہو جاتے لیکن یہ معاملہ ہاتھ پیروں کا تھا اسی لیے عملی طور پر کوئی بھی آگے نہیں آ رہا تھا اور اس مایوسی کے عالم میں اچانک ہمیں ایک روشنی مل گئی۔ یہ روشنی ہمیں ایک غنڈے ہی سے ملی تھی۔ جاوید ہی اس شخص کا پتا تلاش کر کے لایا تھا اور اس شخص کی باتوں نے ہماری آنکھیں کھول دیں۔ اس نے عزت اور وقار کا سارا فلسفہ جلا کر رکھ دیا تھا۔

اس نے کہا۔ "میں تمہیں ایک پستول دیتا ہوں تم اس غنڈے کے سینے میں گولیاں اتار دو۔ اس کے بعد میرے پاس آ جانا۔"

"جی؟" ہم دونوں نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا۔ "یہ آپ کیسا مشورہ دے رہے ہیں۔"

"یہی بات سب سے مناسب ہے۔" اس نے کہا۔ "بھلا یہ کیا بات ہوئی کہ عزت کسی کی اور اسے بچانے کے لیے کوئی اور جائے۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ معاملہ تمہارا ہے اس لیے تم ہی اسے بہتر طور پر نمٹ سکتے ہو۔ فرض کرو اس وقت میں تم [illegible] جاؤں گا۔ مجھے دیکھ کر وہ شخص بھاگ جائے گا لیکن اس سے کیا ہوگا۔ کیا تمہیں زندگی بھر کا تحفظ حاصل ہو جائے گا۔ خود سوچو۔ میں کب تک تمہارے ساتھ رہ سکوں گا۔"

اس کی باتوں نے ہم میں ایک نئی ہمت پیدا کر دی۔ ہم حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ خاص کر جاوید، لیکن یہ معاملہ حیرت انگیز طور پر ختم بھی ہو گیا۔ نہ جانے کس طرح میرے ذہن میں شہزاد رضا کا خیال آ گیا (مشہور ٹی وی اداکار) میں فوراً اس کے پاس پہنچ گیا۔ شہزاد سے میری پرانی دوستی تھی۔ میں نے جب اس آدمی کے بارے میں بتایا تو شہزاد نے کہا کہ یہ تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔ وہ اس آدمی کو بہت اچھی طرح جانتا ہے اور وہ مقررہ وقت پر جاوید کے گھر پہنچ جائے گا۔

یہی ہوا۔ شہزاد جاوید کے گھر پہنچ گیا اور کمال دیکھیں کہ وہ آدمی بھی چوراہے پر نظر آ گیا جس نے دھمکی دی تھی۔ شہزاد نے ہم دونوں کو گھر ہی میں رہنے کے لیے کہا اور خود اس آدمی کے پاس پہنچ گیا۔ کچھ دیر بعد وہ واپس آیا تو بہت حیران ہو رہا تھا۔ وہ مجھے ایک طرف بلا کر لے گیا اور کہنے لگا۔ "منظر بھائی۔ یہ تو عجیب کہانی ہے۔"

"کیوں کیا بات ہو گئی؟" میں نے پوچھا۔

"وہ بندہ تو شگفتہ کو جانتا ہی نہیں۔ وہ خود حیران ہو رہا ہے کہ اس کی طرف سے یہ بات کس طرح منسوب کر دی گئی۔"

بہرحال وہ کہانی تو اسی وقت ختم ہو گئی، لیکن یہ راز ابھی تک میری سمجھ میں نہیں آیا کہ شگفتہ کو یہ سب کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کیا بھید تھا؟ اور اس دن جو میں نے جاوید کی بے قراری اور پریشانی دیکھی اس سے یہ اندازہ ہو گیا کہ وہ شخص اپنی بیوی سے کتنی محبت کرتا ہے۔ تو ایسا شخص غیر ذمے دار اور بے پروا نہیں ہو سکتا۔

سفر اسی طرح ہوتا رہتا ہے۔ پہلے ہمارا مزاج کچھ اور ہوتا ہے پھر کچھ اور ہو جاتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے پروائیاں اور غیر ذمے داریاں ختم ہونے لگتی ہیں۔ مزاج میں ایک ٹھہراؤ آ جاتا ہے اور مزاج کا یہ ٹھہراؤ اور حیرت انگیز تبدیلی بلاشبہ میں نے صرف جاوید کے یہاں دیکھی۔

ایسا شاید اس لیے ہوا ہے کہ وہ جس راہ کا مسافر ہو گیا ہے۔ اس راہ میں ہم بہت پیچھے ہیں اسی لیے جب اس سے ملتا ہوں۔ اس سے بات کرتا ہوں تو ایک لمحے کے لیے ایسا

لگتا ہے جیسے کوئی معزز اور محترم اجنبی سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ جس کا احترام واجب ہو، لیکن اس کے اندر دوستوں کے لیے ابھی تک پرانا پن ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ میں کراچی چھوڑ کر اس کے پاس لاہور چلا جاؤں۔

اس نے گزشتہ دنوں مجھ سے یہ بات کہی تھی۔ "وہاں لاہور میں میرا احترام کرنے والے بہت ہیں۔ خدا نے بہت عزت دی ہے لیکن کوئی ایسا نہیں ہے کہ جو مجھے تم کہہ کر مخاطب کر سکے۔ اس لیے وہاں تمہاری ضرورت محسوس ہوتی ہے۔"

یہ اس کے اندر کے انسان کی آواز ہے۔ اس کا بچپن ہے۔ اس کی معصوم خواہش ہے۔ ہم میں سے ہر ایک اپنے گزرے ہوئے کل کی تلاش میں بھٹک رہا ہے اور یہ گزرا ہوا کل کبھی ہاتھ نہیں آتا۔ شگفتہ کی زندگی کا حیرت انگیز پہلو یہ بھی تھا کہ وہ بڑی بے باکی اور جرأت سے ہر قسم کے معاملات پر باتیں کر لیا کرتی تھی۔

ایک دن یہ خبر ملی کہ اس نے شاعری شروع کر دی ہے اور وہ بھی اچانک۔ یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے کوئی سویا ہوا آتش فشاں ہو۔ باہر سے بالکل پرسکون۔ اندازہ ہی نہ ہو کہ اس کے سینے میں کتنا لاوا چھپا ہوا ہے اور پھر وہ پھٹ پڑے اور وہ بھی اتنی شدت سے کہ اس کا لاوا آس پاس کی تمام بستیوں کو جلا کر خاکستر کر دے اور لوگ حیران ہی رہ جائیں کہ ایسی چنگاری بھی بار بار اپنے خاکستر میں تھی۔

شگفتہ کے ساتھ کچھ ایسا ہی ہوا۔ اس نے جو شاعری شروع کی تو ڈھیر لگا دیے۔ حالانکہ وہ نثری نظمیں کہا کرتی جو مجھے کبھی پسند نہیں آئی۔ میں ان کے فارم کو سمجھنے سے ہمیشہ قاصر رہا ہوں (یہ میری ذاتی رائے ہے۔ آپ کو اس سے اختلاف بھی ہو سکتا ہے) لیکن شگفتہ کے یہاں اظہار کی قوت حیرت انگیز تھی۔ وہ ایسی ایسی لائنیں لکھ جاتی کہ سننے والے مبہوت ہو کر رہ جاتے تھے۔ کیا احمد بخش، کیا قمر جمیل، کیا مبارک احمد۔ یہ سب کے سب اس کی قوت بیان کے معترف تھے۔ نہ جانے یہ کس طرح ہوا تھا۔ ایک رات میں اسے اتنی بلاغت کہاں سے حاصل ہو گئی تھی۔

میں جب بھی جاوید کے یہاں جاتا۔ اس کی ڈھیروں نظمیں سنا کرتا اور تعریف کرتا رہتا۔ اس وقت تک جاوید کے مزاج میں بچپنا چھپا ہوا تھا۔

ایک بار مجھے ایک لڑکی کی جو پی ٹی وی میں کام کرنے کی [illegible]

میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں پی ٹی وی کے جنرل منیجر سے ملواتا ہوں۔"

وہ خوشی خوشی میرے ساتھ چل پڑی۔ میں سیدھے اسے جاوید کے پاس لے آیا اور میں نے جاوید کی طرف اشارہ کیا۔ "دیکھو۔ یہ ہیں پی ٹی وی کے جنرل منیجر۔"

جاوید دنگ رہ گئے تھے لیکن مزاج تو شرارتی تھا۔ لہٰذا انہوں نے بھی سنجیدگی اختیار کر لی اور میری بات سمجھ گئے۔ ذرا سی دیر میں وہ لڑکی بے تکلف ہو کر ان سے باتیں کرنے لگی۔ ابھی کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ شگفتہ آ دھمکی۔ وہ اس وقت کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اس نے آتے ہی ایک ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ یہ ہنگامہ اس بات کی دلیل تھا کہ وہ اپنی محبت میں کسی اور کی شراکت برداشت نہیں کر سکتی۔ چاہے وہ مذاق ہی کیوں نہ ہو۔

یہ محبت میں شراکت کا مسئلہ بھی بہت عجیب ہوتا ہے۔ اپنے آپ پر قابو نہیں رہتا۔ انسان بچوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے۔ جس کا من پسند کھلونا کسی اور کے حوالے کر دیا گیا ہو۔ ایک بار شہناز اور میرے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ میں نے اتفاقاً اسے بس اسٹاپ پر ایک نوجوان کے ساتھ دیکھ لیا جو اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا۔ خاصا اسمارٹ آدمی تھا۔ بس پھر کیا تھا۔ میرے سینے پر جیسے سانپ لوٹنے لگے۔ میں اس رات صرف کروٹیں ہی بدلتا رہا تھا۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ نوجوان شہناز کا سگا ماموں ہے جس سے میری ملاقات اس لیے نہیں ہو سکی تھی کہ وہ کہیں اور رہتا تھا اور وہ شہناز کے یہاں آیا ہوا تھا۔

یہ ایک چھوٹی سی مثال ہے لیکن میں نے کچھ ایسے لوگ بھی دیکھے ہیں جو اس معاملے میں بھی شراکت برداشت کر لیتے ہیں۔ اپنے سینے پر پتھر رکھ لیتے ہیں یا تو ان کی بے حسی ہوتی ہے یا محبت کی مجبوری۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں جو زندگی کا بڑے سے بڑا فلسفہ اتنی آسانی سے سمجھا دیتے ہیں کہ ہم سوچتے ہی رہ جاتے ہیں کہ یہ بات ہمارے ذہن میں کیوں نہیں آئی۔ میں ایسے ہی غنڈے کا ذکر کر چکا ہوں جس کے پاس میں اور جاوید مدد مانگنے گئے تھے۔ اسی طرح ایک اور شخص نے ایک بات بتائی اور وہ بات ابھی تک میرے ذہن پر نقش ہے۔

میں نے علیم انٹرنیشنل نام کے ایک ادارے میں ملازمت کی تھی۔ (اس کی دلچسپ روداد بعد میں بیان [illegible]



سونے بھی بات بیان کر رہا ہوں) اس ادارے میں نیاز نام کے ایک صاحب ہوا کرتے تھے۔ انتہائی تیم تحیم۔ ورزش کے شوقین۔ سیاہ رنگ۔ چہرے پر فرنچ کٹ داڑھی۔ وہ کسی طرح پاکستانی معلوم ہی نہیں ہوتے تھے بلکہ ایسا لگتا تھا جیسے افریقا کا کوئی باشندہ سامنے آ کر کھڑا ہو گیا ہو۔

میں نے نیاز کی طرح پیدل چلنے کا شوقین بہت کم ہی دیکھا ہوگا۔ آپ اس شخص کو دس میل دور بھی کسی کام کے لیے بھیج دیں وہ بندہ ٹہلتا ہوا چلا جائے گا۔ خیر تو ایک دن وہ نہ جانے کس موڈ میں تھا کہ مجھ سے کہنے لگا کہ منظر صاحب۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ لوگ خدا سے دنیا کیوں مانگتے ہیں۔ آخرت کیوں نہیں مانگتے۔ جبکہ آخرت گاڑی ہے اور دنیا اس گاڑی کا گوبر۔ ارے بھائی۔ جب آپ کو پوری گاڑی مل رہی ہے تو گوبر تو اس کے ساتھ ہی آئے گا۔ یہ تو بالکل سامنے کی بات ہے۔

سبحان اللہ۔ اس شخص نے اپنے الفاظ میں دنیا اور آخرت کے طلب کرنے کا کتنا بڑا مسئلہ آسانی سے بیان کر دیا تھا۔ حالانکہ اس شخص کی زیادہ تعلیم نہیں ہے لیکن بقول حضرت علیؓ علم اور عقل کی باتیں جہاں سے بھی ملے حاصل کر لو۔ یہ مت دیکھو کون کہہ رہا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ کیا کہہ رہا ہے۔

میں اپنے دوست رمضان صدیقی مرحوم کا ذکر کر چکا ہوں۔ ملیر میں وہ ایک موچی کے پاس بیٹھا کرتے تھے۔ خود بہت پڑھے لکھے انسان تھے بلکہ ادب پر گفتگو کا سلسلہ میں نے ان کے ساتھ ہی شروع کیا تھا۔ وہ کرشن چندر اور راجندر سنگھ بیدی کے بہت بڑے مداح تھے۔

ایک دن میں نے ان سے کہا۔ "رمضان صاحب۔ آپ اتنے پڑھے لکھے انسان ہیں۔ آپ کیا ایک موچی کے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ یہ آپ کی حیثیت کے خلاف ہے۔"

اس پر رمضان صدیقی مسکرا دیے۔ "میرے بھائی۔ تم بھی ذرا تھوڑی دیر کے لیے اس موچی کے پاس بیٹھ جاؤ۔ اس کے بعد تم سے بات کروں گا۔"

ان کے کہنے کے مطابق میں بھی کچھ دیر کے لیے اس موچی کے پاس بیٹھ گیا اور اسی دن پتا چلا کہ وہ کتنا پڑھا لکھا شخص تھا۔ اسلامی تاریخ اور فقہ پر اس کی بہت گہری نظر تھی۔ تو کہنے کا مقصد یہ ہے کہ اچھی اور خوبصورت باتیں ہم کسی سے بھی سن سکتے ہیں۔

[illegible]

اس کا مطالعہ وغیرہ تو نہیں تھا لیکن اس نے زندگی کے تجربات بہت حاصل کر رکھے تھے اور ان ہی تجربات نے اس میں مطالعے کی کمی پوری کر دی تھی بلکہ وہ اور بھی شارپ ہو گئی تھی۔

جاوید کے گھر اب زیادہ لوگ آنے لگے تھے کیونکہ اب شگفتہ نے بھی شاعری شروع کر دی تھی۔ اس کے احباب کا بھی ایک دائرہ تھا۔ کچن میں برتن شور کرتے رہتے۔ قہقہے گونجتے اور شاعری پر گفتگو ہوتی رہتی۔

جمال احسانی بھی پڑوس میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ لہٰذا شام کے وقت جمال بھی آ جاتے۔ تھوڑی ہی فاصلے پر فراست رضوی کا گھر تھا۔ یہیں میری ملاقات ان کے بڑے بھائی امانت بھائی سے ہوئی۔ میرا خیال ہے کہ میں نے ان جیسا مجلسی انسان آج تک نہیں دیکھا۔ ان کی باتیں ایسی ہوتی تھیں کہ بس وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ اتنی دلچسپ کہ ان کی باتوں سے متاثر ہو کر میں نے ریڈیو کے لیے ہنگامہ نام کا ایک سلسلہ بھی شروع کر دیا تھا۔

امانت بھائی ایک دوسری دنیا کے انسان تھے۔ لکھنؤ کی گلیاں، وہاں کے بازار کے کنکوے۔ تیکھے باز۔ کشتی کے فن میں ماہر۔ تفریح۔ ماتمی مجلسیں۔ چوری چھپے برپا ہونے والا عشق۔ ڈیوڑھیاں۔ محلے در محلے۔ مسجدوں کے مینار۔ امام بارگاہیں۔ یہ سب کے سب اپنی روایتی شان کے ساتھ ان کی باتوں میں موجود ہوتے اس لیے ان کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں۔ وہ قدیم قصہ گو کی طرح ایک سماں باندھ کر رکھ دیتے تھے۔ میں نے ایسی دلچسپ باتیں پھر کہیں نہیں سنیں۔

ان کی دلچسپ باتوں میں ایک عنصر اور بھی تھا۔ جسے آپ مبالغہ بھی کہہ سکتے ہیں لیکن اس مبالغے میں بھی وہ لطف ہوا کرتا جو بیان سے باہر ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایک بار پتنگ بازی کے ایک مقابلے میں حصہ لیا تھا۔ وہ خود تو لکھنؤ میں تھے لیکن پتنگ بازی کان پور میں تھی۔ سبحان اللہ۔ یہ الگ بات ہے جو آپ کا کوئی نقصان نہیں کرتی لیکن یہ تصور ہی آپ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لے آتا ہے۔ میں تو یہ کہتا ہوں کہ امانت بھائی کراچی جیسے کمرشل شہر کے آدمی ہی نہیں تھے بلکہ ہم میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ ہماری روحیں کہیں اور ہیں۔ کہاں۔ شاید اس کا کوئی سراغ نہ مل سکے۔

آپ کسی کٹی ہوئی پتنگ کو لوٹ کر چاروں طرف دیکھنا شروع کر دیں کہ یہ کہاں سے کٹ کر آئی ہے تو یہ اندازہ لگانا [illegible]

ہیں کہیں سے۔ لیکن اتنا ضرور ہے کہ ہم کمرشل معاشرے کے کمرشل لوگ نہیں ہیں۔

ایک بار امریکا سے آئی ہوئی ایک امریکن لڑکی سے ملاقات ہوئی۔ اس کا نام شاید ایلسا تھا۔ نوجوان تھی اور بہت اچھی اردو بول لیتی تھی بلکہ وہ افسانوں پر ریسرچ ہی کرنے آئی تھی۔ انتہائی بے تکلف مزاج کی۔ مجھے یاد نہیں آرہا کہ میری اس سے کیسے ملاقات ہوئی لیکن ہم دونوں کے درمیان دوستی ضرور ہوگئی تھی۔ میں اسے اپنے ساتھ کئی دفعہ ملیر بھی لے گیا۔ وہ پاکستانی لباس پہن کر کھانا کھانے کے لیے زمین پر ہی آلتی پالتی مار کر بیٹھ جاتی۔

ایک بار اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”یار یہ بتاؤ۔ کیا تمہارے یہاں سیکس پر بہت پابندی ہے؟“

”یہ تم کیوں پوچھ رہی ہو؟“

”اس لیے کہ ہر شخص مجھے اس طرح دیکھتا ہے جیسے پہلی دفعہ کسی لڑکی کو دیکھ رہا ہے۔ گھور گھور کر۔ آنکھوں میں سیکس کی چنگاریاں روشن ہوتی ہیں۔“

اب میں اسے کیا بتاتا کہ یہ ہمارا مزاج بن چکا ہے۔ ہم اچھے چہروں کو دیکھ کر لاحول پڑھتے ہیں پھر دوبارہ لاحول پڑھنے کے لیے ایک بار پھر اس چہرے کو دیکھ لیتے ہیں اسی لیے ہمارے گناہ اور ثواب کا بیلنس برابر رہتا ہے۔

ایک بار میں ایلسا کو عقاب کے دفتر میں لے گیا تھا۔ جہاں طارق محمود میاں نے شاید اس کا انٹرویو بھی کیا تھا۔ یہ اس لڑکی کا ذکر اس طرح نکل آیا کہ وہ بھی کسی اور دنیا کی لڑکی تھی۔ امریکا میں پیدا ہونے اور خالص امریکی ہونے کے باوجود اس کی روح کہیں اور کی تھی۔ ایک بے چین روح جو اسے امریکا سے پاکستان لے آئی تھی پھر پاکستان سے ہندوستان چلی گئی۔ اس کے بعد اس کی کوئی خبر نہیں مل سکی۔

اب کچھ اور باتیں بھی یاد آرہی ہیں۔ پتا نہیں کس حوالے سے۔ لیکن یاد آنے لگی ہیں تو بہتر بھی ہے کہ بیان ہی کردیا جائے کیونکہ میں خود بھی اپنے آپ کو سمجھنا چاہتا ہوں۔ مجھے یاد نہیں کہ میری کمرشل رائٹنگ کا آغاز کہاں سے ہوا۔ لیکن کب سے ڈائجسٹوں کے لیے لکھنا شروع کیا۔

البتہ اتنا ضرور یاد ہے کہ ڈائجسٹوں سے بہت پرانی دلچسپی رہی ہے۔ سب رنگ، عالمی وغیرہ۔ بلکہ جاوید کو بھی تھی۔ جاوید نے شاہ فیصل کالونی میں ریلوے لائن کے پاس جو کمرا لیا تھا وہاں ڈائجسٹ بھرے رہتے تھے اور ہم انہیں پڑھا کرتے۔ ان کی کہانیوں پر تبصرے کیے جاتے۔

شاید اظہر کلیم مرحوم یا اقبال پارکھ۔ ان دونوں میں سے کوئی ایک پہلے ملا تھا اور ڈائجسٹوں میں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اظہر کلیم نیا رخ اور نئے افق میں ہوا کرتے تھے۔ میں نے ان کے لیے بے شمار تراجم کیے۔ اور جنگل کہانیاں بھی لکھیں۔

لیکن ٹھہریں۔ مجھے اس سے بھی پہلے کی ایک بات یاد آرہی ہے۔ ملیر میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے جو کمرشل ناول لکھا کرتے۔ کمرشل ناول سے میری مراد وہ ناول ہیں جو خواتین کی دلچسپی کے لیے ہوا کرتے ہیں۔ خواتین کے لیے لکھنا ایک دوسرا فن ہے۔ ان کا ایک مخصوص دائرہ ہوتا ہے۔ بہرحال تو وہ صاحب بہت کامیاب کمرشل رائٹر تھے۔

ایک خاتون رائٹر کا بہت شہرہ تھا۔ بینا ناز۔ میں نے بھی ایک آدھ ناول پڑھ رکھا تھا۔ ایک دن ایک صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”چلو۔ آج میں تمہاری ملاقات بینا ناز سے کرواتا ہوں۔“

میں تو یہ سن کر بہت خوش ہوگیا تھا کہ چلو آج ایک خاتون رائٹر سے ملاقات کا شرف حاصل ہوگا لیکن جب وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ بینا ناز کوئی خاتون نہیں بلکہ اچھے خاصے صاحب تھے۔ بہت کوفت ہوئی۔ بعد میں ان سے دوستی بھی ہوگئی اور وہ میرے گھر آتے جاتے تھے۔

میں بھی آہستہ آہستہ ڈائجسٹ رائٹنگ کی تکنیک سے واقف ہوتا جارہا تھا اور احساس ہورہا تھا کہ یہ کوئی آسان کام نہیں ہے۔ بلکہ خاصہ مشکل ہے۔ اس میں ذہنی جمناسٹک کرنی پڑتی ہے۔ کہانی بیان کرنے کا ایسا انداز ہو جو پڑھنے والوں کو پوری طرح اپنی گرفت میں رکھے۔ انہیں ادھر ادھر بھاگنے کی اجازت نہ دے۔

میں نہیں جانتا کہ شگفتہ نے بات کہنے کا ڈھنگ کہاں سے سیکھا تھا۔ اس نے اپنی کتاب ”آنکھیں“ میں اپنے بارے میں جس انداز سے لکھا تھا وہ یقیناً بے مثال ہے۔ ایک خاص انداز سے وار کرتی ہوئی تحریر۔ جیسے دو دھاری تلوار چل رہی ہو۔

نہ جانے میں کہاں سے کہاں جا نکلتا ہوں لیکن پھر وہی یادوں کی بے ترتیب ہجوم۔ جہاں جو بات یاد آگئی وہ بیان کردی۔ بہرحال ڈائجسٹوں نے مجھے کمرشل بنادیا اور اس کے بعد یہ ہوا کہ میں افسانے لکھنا بھول ہی گیا۔ بس کہانیاں لکھتا رہا اور آج تک لکھتا چلا آرہا ہوں۔ میرے ایک جاننے والے مجھے بہت بجا اور باحوصلہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اس معاشرے میں صرف قلم کے سہارے سکون کے ساتھ زندہ رہنا بہت بڑا کارنامہ ہے۔

میں زندہ تو ہوں لیکن سکون کہاں ہے اور یہ بات میں کسی کو بتا نہیں سکتا۔ شرم آتی ہے۔ اتنے برسوں کی قلمی جدوجہد کے بعد مجھے کیا ملا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ میں شاید واحد انسان ہوں گا جس کے پاس بینک بیلنس نام کی کوئی چیز نہیں ہے۔ کبھی کبھی جب یہ سوچتا ہوں کہ میرے بعد گھر والوں کا کیا ہوگا تو کانپ کر رہ جاتا ہوں لیکن پھر اس کا خیال ڈھارس بندھا دیتا ہے جس نے ہماری تخلیق کی ہے اس سے زیادہ خیال کرنے والا اور کون ہوسکتا ہے۔ اتنا تو یقین ہے کہ وہ میرے گھر والوں کو بھوکا سونے نہیں دے گا۔

اقبال پارکھ شاید انداز ڈائجسٹ نکالا کرتے تھے۔ میں ان کے ساتھ بھی بہت دنوں تک کام کرتا رہا ہوں۔ جاوید مجھ سے کہا کرتے ہیں۔ ”مظہر تم اس قسم کی تحریریں لکھنی چھوڑ دو کیونکہ یہ تمہیں گھن کی طرح کھا رہی ہیں“ لیکن سوال یہ ہے کہ میں اور کیا کروں۔

ڈائجسٹوں میں باقاعدگی سے لکھنے کی ابتدا ریاض فرشوری مرحوم کے ڈائجسٹ سے ہوئی تھی۔ وہ بھی بہت مزے کے آدمی تھے۔ ریاض صاحب کے پاس مجھے سلیم احمد ہی نے بھیجا تھا۔ ایک سفارشی خط کے ساتھ کہ یہ بہت اچھا لکھتے ہیں۔ انہیں ڈائجسٹ میں ایڈجسٹ کردیں اور میں ان کے ڈائجسٹ میں کام کرنے لگا۔ اس وقت وہ ناظم آباد میں رہا کرتے تھے۔ بہت ہی دلچسپ دن گزارے ہیں جن کا ذکر میں بعد میں کروں گا۔ میری کہانی میں ترتیب کے لحاظ سے پہلے جاوید اور شگفتہ آرہے ہیں۔ لہٰذا ان کے بارے میں بتاتا چلوں۔

شگفتہ نے کمرشل رائٹنگ شروع کردی تھی۔ جاوید کے ابا اسے پسند نہیں کرتے تھے۔ وہ جاوید کو ڈانٹتے رہتے اور جاوید فرمانبرداری سے گردن جھکائے ان کی باتیں سنتا رہا۔ میری مصیبت یہ تھی کہ میں ان تینوں کے درمیان ایک میڈیم کی حیثیت رکھتا تھا۔ تینوں ہی اپنے اپنے دل کی بھڑاس میرے سامنے نکالتے اور مجھے ہر ایک کے سامنے اپنی گردن ہلانی پڑتی۔

شگفتہ کو جب کوئی بہت اہم بات کہنی ہوتی تو وہ مجھے اپنے ساتھ حسن اسکوائر کے بڑی بی ریسٹوران میں لے جاتی (جواب بند ہوچکا ہے) اور وہاں سب کچھ کہہ دیتی۔ جاوید سے علیحدگی کے بعد بھی اس کا یہی وتیرہ رہا تھا۔

وہ اپنی کتاب کی اشاعت کے لیے بہت بے چین تھی۔ وہ کہا کرتی کہ اس کتاب میں اس کا اصل روپ ہے۔ لوگ اس کتاب کے ذریعے مجھے سمجھیں گے۔

ہمارے دوستوں میں زیادہ تر اپنے ٹھکانے لگ چکے تھے یعنی سب کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ ممتاز رفیق کی۔ جاوید کی۔ ثروت کی۔ جمال احسان کی۔ میرا خیال ہے کہ سید ساجد کی شادی بہت بعد میں ہوئی تھی۔ جاوید کے یہاں دوستوں کی آمدورفت اسی طرح جاری تھی۔

ایک دن شگفتہ نے مجھ سے کہا۔ ''منظر بھائی۔ ایک صاحب مجھ سے عشق فرمانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''تو پھر تم نے کیا کہا؟''

''میں نے انہیں بری طرح ڈانٹ دیا۔''

میں نے پھر اس بات کو نظر انداز کر دیا۔ جب اس نے ڈانٹ ہی دیا تھا تو پھر اس بات کو آگے بڑھانے سے کیا فائدہ تھا۔ میں یہ بتا چکا ہوں کہ شگفتہ ایسی نہیں تھی کہ کوئی اسے بے وقوف سمجھ کر اس سے فائدہ اٹھا جاتا بلکہ وہ بے وقوف اسی وقت بنتی تھی جب خود اس کی خواہش ہوتی۔

پھر نہ جانے کیا ہوا کہ اچانک خود شگفتہ کہ وہ بے وقوف بن گئی۔ اس کی زندگی نے ایک نئی کروٹ لی جس کا مجھے بھی اندازہ نہیں ہو سکا تھا۔ افضال سید کا جاوید کے یہاں آنا جانا تھا پھر وہ سب کچھ ہوا جو شاید نہیں ہونا چاہیے تھا (میں اس بارے میں لکھنا نہیں چاہتا... کیونکہ میں اپنی کہانی بیان کر رہا ہوں۔ اپنے آپ کو دہرا رہا ہوں۔ شگفتہ یا سائرہ کا تذکرہ صرف اسی حد تک ہے۔ جہاں تک میرا اس سے تعلق رہا ہے)

بہر حال جاوید اس طلاق کے بعد بکھر کر رہ گئے۔ مجھے جاوید کی حالت دیکھ کر افسوس ہوا کرتا تھا۔ ایک ایسا شخص جو ہماری زندگی نکھار رہا تھا پھر کچھ عرصے کے لیے اس کی زندگی میں ایک سناٹا بھی آیا۔ اس کے بعد پھر نکھر کر رہ گیا لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ قدرت نے اسی طرح جاوید کی راہ سے کانٹے ہٹا دیے تھے۔ اس راہ سے جس راہ کا اسے مسافر بننا تھا اور اب تک جو کچھ بھی ہوا وہ اس کی تیاری کا مرحلہ تھا۔ اس کو تیار کیا جا رہا تھا۔

جاوید کو شروع سے مذہب سے لگاؤ رہا ہے۔ ذہنی طور پر وہ ہمیشہ سے ایک مومن تھا اس لیے مذہبی مناظرے بھی ہوا کرتے۔ جنہیں ہم مذہبی چلا کہتے تھے۔ ملیر میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے۔ جو بہت اچھے آرٹسٹ تھے۔ یعنی تصویریں بنایا کرتے۔ ان کا مسلک کچھ عجیب تھا۔ ان کا تعلق فرقہ جبریلیہ سے تھا۔ یعنی وہ حضرت جبریلؑ کو آخری پیغمبر خیال کرتے تھے۔

نہ جانے اس قسم کی کتنی تحریکیں ہمارے اردگرد پرورش پا رہی ہیں۔ نہ جانے کتنے نظریے ہیں جنہوں نے اپنی اپنی شاخیں بنائی ہوں گی۔ ایک دفعہ شوکت عابد نے مجھ سے کہا۔ ''بھائی۔ آپ کو معلوم ہی نہیں ہے کہ یورپ سے کتنا بڑا آدمی آیا ہوا ہے۔ جو ہر ایک میں سکون تقسیم کرتا پھر رہا ہے۔''

''اچھا کون ہے وہ؟''

پھر شوکت نے ان صاحب کے بارے میں بتایا۔ وہ یورپ سے آئے تھے اور شاید ماڈل کالونی ہی میں ان کی رہائش تھی۔ وہ ایک خاص انداز سے مراقبہ کروایا کرتے تھے اور مراقبے کی باقاعدہ کلاس ہوا کرتی تھی۔ شوکت نے بھی ان محفلوں میں شرکت کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے ساتھ سلیم وہاب ہوا کرتے تھے جو بعد میں سلیم فاروقی کہلائے۔ وہ بھی بہت جوش و خروش سے اس آدمی کے بارے میں بتایا کرتے پھر نہ جانے کیا ہوا کہ وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔

میں جانتا ہوں کہ مراقبہ وغیرہ بہت اچھی چیز ہے۔ کم از کم اتنا تو ہوتا ہے کہ آدمی اپنے اندر جھانک کر دیکھ لیتا ہے لیکن اس کے لیے باقاعدہ کلاس کا ہونا مجھ میں نہیں آتا۔ جیسے یوگا کی کلاس یا ڈرس کی کلاس۔ ایک دو تین کہا اور اپنے وجود میں اترنا شروع کر دیا۔

شوکت کا ذکر آ گیا ہے تو پھر ثروت یاد آ رہے ہیں۔ شوکت اور ثروت بھائی ہونے کے علاوہ ایک دوسرے کے دوست بھی تھے اور اپنی اپنی واردات قلبی سے ایک دوسرے کو آگاہ بھی کرتے رہتے تھے۔ دونوں ہی شاعر تھے اور الجھن یہ تھی کہ دونوں میں سے کس کو زیادہ داد دی جائے لیکن یہ بات ہے کہ دونوں ایک دوسرے کی تعریف میں بخل سے کام نہیں لیتے تھے۔ خاص طور پر شوکت۔ ''بھائی نے جو مصرعہ لکھا ہے۔ وہ دل کو چھو لینے کے علاوہ کہیں جا سکتا یا آج تو بھائی نے بڑے بڑوں کو باؤلا کر دیا۔''

اور بلاشبہ ثروت بہت بڑا شاعر تھا۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے شاعری میں اپنا ایک ڈکشن بنایا تھا۔ نرم لہجہ۔ کول کول سی باتیں۔ اس کے یہاں دکھ کے مناظر بھی اس طرح نظر آتے جیسے رنگین شیشوں کی عینک لگا کر دیکھ رہے ہوں۔



میرا اس سے پہلے غائبانہ تعارف ہوا تھا۔ اس کی نعت کے ایک شعر کے ذریعے۔ سارے عالم کو جزیرہ ٹھہراؤں اور اک انساں کو سمندر لکھوں پھر جب اس سے ملاقات ہوئی تو اس کے اندر کا انسان واضح ہوتا چلا گیا۔ دوستی بڑھتی چلی گئی۔ میں، جاوید، ثروت، شوکت، انور سن رائے وغیرہ۔

ہمیں دیکھنا، شاعری کرنا، شرارتیں کرنی اور بھلا ہمیں کرنا کیا۔ مجھے یاد ہے ماڈل کالونی میں اس کے مکان سے آگے وہ مرکزی سڑک ہے۔ ملیر کینٹ کو ملیر ہالٹ سے ملاتی ہے۔ اس سڑک کے بعد دور تک پھیلا ہوا ویران میدان۔ جس کے بعد ائیرپورٹ کی حدود شروع ہو جاتی ہے۔ سڑک کے فوراً بعد وہاں چھوٹی چھوٹی پلیاں سی بنی ہوئی ہیں۔ میں اور ثروت شام کے وقت اس پلیا پر جا کر بیٹھ جاتے تھے پھر باتیں کرتے ہوئے ذہن پر ایک غنودگی سی طاری ہو جاتی۔ دور تک پھیلا ہوا میدان۔ سن سناتی ہوئی ہوائیں۔ نیلے آسمان کے پیش منظر میں کسی اداس چیل کی غمزدہ آواز (مجھے نہیں معلوم کہ چیلیں بھی اداس ہوتی ہیں یا نہیں لیکن اتنا ضرور ہے کہ ایسے اداس کر دینے والے پس منظر میں ان کی آوازیں اور بھی اداس کر دیا کرتی ہیں)

ثروت نے انور سن رائے کے گھر پر ایک کارٹون بھی بنایا تھا۔ میں آلتی پالتی مارے بیٹھا ہوں۔ آنکھوں پر عینک ہے اور سامنے کتابیں رکھی ہوئی ہیں۔ ثروت اور شوکت کے ایک بڑے بھائی بھی ہیں۔ بھائی فرحت، جو اس وقت بھی اتنے ہی فرمانبردار ہوا کرتے تھے۔ انتہائی مخلص اور بے لوث انسان۔ شاید اس زمانہ میں یہ ان کی ڈیوٹی تھی کہ وہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کی شاعری سنیں اور تعریفیں کرتے رہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ پورا گھر ہی ادب نواز تھا۔

ثروت اور شوکت کے مکان سے چند قدم کے فاصلے پر پروفیسر اخلاق اختر حمیدی کا مکان تھا جو اس زمانے میں جامعہ ملیہ کالج کے پرنسپل ہوا کرتے تھے اور ان کے مکان سے آگے ایک اسکول ہوا کرتا تھا۔ ارمان اسکول۔ میں نے چند مہینے اس اسکول میں بھی گزارے ہیں۔

کچھ عجیب صورت حال رہی ہے۔ ملیر کے پاکستان پبلک اسکول۔ جامعہ ملیہ۔ ارمان اسکول۔ صدر کے بیری کلاسو۔ نہ جانے کہاں کہاں پرائمری اور سیکنڈری کی سطح پر تعلیم حاصل کرتا رہا یا اپنے آپ کو برباد کرتا رہا۔

ایک بار شگفتہ نے دریافت کیا۔ ''منظر بھائی۔ آپ نے بھی نشہ کیا ہے؟''

''ہاں، میں نگاہوں سے پیتا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''میں اس نشے کی بات نہیں کر رہی۔ حقیقی نشے کی بات ہو رہی ہے۔''

اس نے سگریٹ نوشی شروع کر دی تھی۔ شروع شروع میں تو بس یوں ہی لطف کا ایک آدھ سگریٹ۔ اس کے بعد یہ سلسلہ شدید ہو گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو مارنا چاہتی تھی۔ بہانہ چاہیے کوئی بھی ہو اور اس نے اپنے آپ کو مار ہی لیا۔ جاوید سے علیحدگی کے بعد اور افضال سید سے شادی کے بعد بھی وہ بہت بے چین تھی۔ مجھے اپنے ساتھ بزی لی لے جا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کیا کرتی تھی۔ وہ کئی بار ناظم آباد کے اس فلیٹ میں بھی آئی جہاں میں نے شادی کے بعد رہائش اختیار کر لی تھی۔

پھر میں نے یہ سنا کہ وہ افضال سید سے بھی علیحدہ ہو گئی ہے۔ کہیں اور چلی گئی ہے پھر کہیں اور، پھر موت کی خبر ملی۔ وحشت ناک موت۔ ریل سے کچل کر۔ کہانی ختم ہو گئی۔ ہاں۔ اپنی کتاب کی اشاعت کے بعد وہ ہندوستان بھی گئی تھی جہاں شاید اس نے امرتا پریتم کے یہاں قیام کیا تھا۔ اس کی کتاب میں امرتا پریتم کا مضمون بھی شامل ہے جو اس کے لیے لکھا گیا ہے۔ اس نے اپنی ایک تصویر بھی دکھائی تھی۔ ہندوستان کے دورے کے وقت مسز اندرا گاندھی سے بھی اس کی ملاقات ہوئی تھی۔ ایک اخبار میں ان کی وہ تصویر بھی شائع ہوئی تھی۔

کول سے شاعر ثروت حسین کے ساتھ بھی تو یہی سب کچھ ہوا تھا۔ ریل کی زد میں آ کر اس کی دونوں ٹانگیں کٹ گئی تھیں۔ صرف دھڑ باقی رہ گیا تھا۔ وہ تو شاید اسی دن مر چکا تھا۔ اتنا خوبصورت شاعر، اتنا اچھا دوست، اور اتنا نازک سا انسان پھر اس کے بارے میں طرح طرح کی خبریں ملتی رہیں۔ وہ اندرون سندھ چلا گیا تھا۔ یہ خبریں وہیں کی تھیں۔ وہ بہک گیا ہے۔ اس کا ذہنی توازن درست نہیں رہا۔ نہ جانے کیسی کیسی باتیں کرنے لگا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ وہ جس خمیر کا انسان تھا اس کے لیے ایسی ہی باتیں مناسب تھیں۔ اس انداز کے انسان کو جب پوری توجہ اور پذیرائی نہ ملے تو اس کے اندر کا انا گویا تو ہونٹوں پر چپ کی مہر لگا دیتا ہے یا پھر اسے بولنے پر مجبور کر دیتا ہے اور وہ ثروت کی طرح بولنے لگتا ہے۔

پھر وہ کراچی آ گیا۔ کراچی میں آنے کے بعد ایک دو بار اس کے گھر گیا۔ وہی حوصلے والی باتیں۔ وہ سعود آباد کے کسی کالج میں پڑھانے لگا تھا۔ ہم بہت دیر تک گپ شپ کرتے رہے پھر ایک دن اس کی موت کی خبر مل گئی اور موت بھی کیسی اس ٹرین کے نیچے آ کر۔ وہ حادثہ جو پہلے ادھورا رہ گیا تھا، اس کی موت کے بعد مکمل ہو گیا۔

اب یہاں پر میں اپنی کوتاہی یا بے حسی کا اعتراف کرتا چلوں۔ نہ جانے کیوں۔ مجھے وحشت سی ہوتی ہے۔ جب میں کسی دوست کے مرنے کی خبر سنتا ہوں تو اپنی خواہش کے باوجود اس کے یہاں جانے کی ہمت نہیں ہوتی۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ جس انسان کو میں باتیں کرتا ہوا، چہکتا ہوا، شعر سناتا ہوا، شرارتیں کرتا ہوا دیکھ چکا ہوں۔ اس کو مردہ حالت میں کس طرح دیکھ سکوں گا۔ جب رمضان صدیقی کا انتقال ہوا تو میں نہیں گیا۔ میں نے ثروت کی خبر سنی۔ جمال احسانی چلا گیا اور بھی کچھ لوگ بچھڑ گئے لیکن میں کہیں نہیں گیا۔ بس اپنے کمرے میں بند ہو کر ان لمحوں کو یاد کرتا رہ گیا جو میں نے ان پیارے پیارے لوگوں کے ساتھ گزارے تھے۔

میں اس وقت تک کرشن رائٹر بن چکا تھا۔ ریاض فرشوری صاحب کے یہاں گزرنے والے شب و روز بہت دلچسپ تھے۔ ان کے یہاں کی سب سے اچھی بات یہ ہوتی تھی کہ دوپہر کا کھانا بہت مزیدار ہوتا تھا۔ دسترخوان بچھ جاتا اور ہم سب کھانے پر ٹوٹ پڑتے۔ ڈائجسٹ تو خیر زیادہ نہیں چلتا تھا لیکن ریاض فرشوری صاحب کی دلچسپ باتیں چلتی رہتی تھیں۔ ہم وہاں پر کچھ اس انداز سے کام کر رہے تھے کہ وقت پر پیسے بہت مشکل سے ملا کرتے۔ کبھی کبھی بہت جھلاہٹ بھی ہونے لگتی۔ ہم آخر کیوں اپنا وقت برباد کر رہے ہیں۔ بس بہت ہو چکی۔ اب ریاض صاحب سے اس موضوع پر صاف صاف بات کرنی چاہیے لیکن ریاض صاحب سے بات کرنے جاتے تو ان کی باتوں میں کھو کر رہ جاتے۔

ایک بار میں نے ایک ترکیب سوچی۔ اپنی عینک اتار کر جیب میں رکھی اور ریاض صاحب کے سامنے معصوم سی صورت بنا کر بیٹھ گیا۔

"ہاں بھئی خیریت تو ہے؟" ریاض صاحب نے پوچھا۔

"ریاض صاحب۔ ایک بہت بڑی مصیبت ہو گئی ہے۔" میں نے کہا۔ "میرا چشمہ ٹوٹ گیا ہے اور چشمے کے بغیر کام نہیں ہوتا۔ چشمہ بنانے کے لیے پیسے چاہئیں۔"

"اوہو۔ یہ تو واقعی بہت برا ہوا۔" ریاض صاحب نے افسوس ظاہر کیا۔ "خیر، میں تمہیں اپنا ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک بار میں اٹلی گیا۔ وہاں کا پیسا ٹاور تم جانتے ہی ہو کتنا بلند ہے۔ میں پیسا ٹاور پر چڑھا ہوا نیچے دیکھ رہا تھا کہ اچانک میری عینک نیچے گر پڑی اور ٹکڑے ہو گئی۔ اب کیا بتاؤں۔ کتنی پریشانی ہوئی ہے۔ پورے روم میں مجھے اپنی پسند کا فریم نہیں مل سکا پھر جب میں لندن گیا تو میں نے وہاں سے اپنی عینک بنوائی۔ اب تم سمجھ گئے نا۔"

"جی نہیں۔ میں نہیں سمجھا۔ اس کہانی سے میرا کیا تعلق ہے؟"

"تمہارا تعلق یہ ہے بھائی کہ جب میں بغیر عینک کے پندرہ بیس دن گزار سکتا ہوں تو تم بھی گزار سکتے ہو۔" ریاض صاحب مسکرا کر بولے۔

میں ایک گہری سانس لے کر رہ گیا پھر میں نے ان ہی کے سامنے اپنی جیب سے اپنا چشمہ نکال کر پہن لیا اور ریاض صاحب بہت دیر تک زور زور سے ہنستے رہے تھے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ریاض صاحب غیر معمولی طور پر دلچسپ انسان تھے۔ ان کی باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوتا تھا۔

سلیم احمد مرحوم جب مجھ سے دریافت کرتے۔ "ہاں بھئی۔ کیسی گزر رہی ہے ریاض کے یہاں۔"

اور جب میں انہیں وہاں گزرنے والے واقعات بتاتا تو ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہو جاتی۔

ریاض صاحب بلاشبہ ایک زبردست لکھاری تھے۔ ایک بار انہوں نے اسی ڈائجسٹ کے لیے "ہرمن ہیز" کے ایک ناول کا ترجمہ کیا تھا۔ وہ ناول میں پہلے ہی پڑھ چکا تھا۔ جب ان کا ترجمہ پڑھا تو میرے لیے یہ اندازہ لگانا دشوار ہو گیا کہ دونوں میں سے کون بہتر ہے۔ ریاض صاحب کا ترجمہ یا اوریجنل ناول۔ وہ ایک کمال کے آدمی تھے اور اب ایسے لوگ ملنے بند ہو گئے ہیں۔ اب خدا ایسے لوگوں کی تخلیق نہیں کرتا یا کر رہا ہو تو میرے دائرہ علم میں نہیں ہیں۔

ان کے صاحبزادے سب جوان ہو کر برسر روزگار ہو چکے ہیں۔ صحافی ہو گئے ہیں لیکن شاید ان میں سے کسی میں باپ جیسے قلم کار کی اہلیت نہیں ہے۔

بہت دنوں پہلے ملیر میں ایک صاحب ہوا کرتے تھے۔ وہ بھی اپنی [illegible] میں یکتا تھے، وہ گپ ہانکتے تھے۔ عباسی نام تھا ان کا اور ان کی [illegible] ہوا کرتی تھیں



کہ آج بھی یاد آتی ہیں تو دل خوش ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر انہوں نے ایک بار فرمایا۔ "میاں، کچھ دن ہوئے ہمارے یہاں چینی ماہرین آئے ہوئے تھے۔ چھوٹے چھوٹے میزائل لے کر۔ وہ میزائل ایک ایک ہاتھ کے برابر تھے۔ ایک چینی ماہر نے ہم سبھوں کو جمع کر کے کہا۔ "میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ میں سے ایک آدمی سامنے آئے تاکہ اس کو میزائل چلانے کی ٹریننگ دی جائے۔"

اتنا سننا تھا کہ میں آگے آیا اور میں نے عرض کیا۔ "جناب، اگر برا نہ مانیں تو اپنا یہ میزائل آدھے گھنٹے کے لیے مجھے دے دیں۔"

"کیا کہا یہ میزائل آپ کو دے دوں؟" چینی ماہر نے حیرت سے پوچھا۔

"جی جناب، آپ مجھے دے دیں اور مجھ سے کوئی سی بھی گارنٹی لے لیں۔ اگر اسے نقصان پہنچا تو پوری ذمے داری مجھ پر ہوگی۔"

بہرحال بہت دشواریوں کے بعد چینی ماہرین نے ایک میزائل میرے حوالے کر دیا۔ میں اس میزائل کو لے کر چلا گیا۔ آدھے گھنٹے بعد واپس آیا تو میرے ہاتھوں میں دو میزائل تھے۔ میں نے ان چینی ماہرین سے کہا۔ "جناب، ذرا پہچانیں تو سہی آپ کا میزائل کون سا ہے۔"

پتا چلا کہ ٹیکنالوجی کو پہچانا نا پہچانا تو بہت چھوٹی سی بات تھی۔ عباسی صاحب آدھے گھنٹے میں ویسا ہی میزائل تیار کر کے لے آئے تھے۔ جس کارنامے کو انجام دینے میں چینیوں نے کئی برس صرف کیے ہوں گے۔ عباسی صاحب نے وہ کارنامہ صرف آدھے گھنٹے میں انجام دے دیا تھا۔

تو بتائیں اب کہاں ہیں ایسے لوگ۔ اب تو اچھے جملے سننے کو نہیں ملتے۔ اچھے جملوں میں عزیز بھائی یاد آ گئے۔ عزیز ہاشمی۔ سلیم بھائی کے بہنوئی ہوا کرتے تھے۔ خدا کی پناہ۔ کیا زبردست آدمی تھے۔ انتہائی معصوم بچے، مہذب، پڑھے لکھے اور بلا کے فقرہ باز۔ دھان پان سے انسان جن کے پاس بیٹھ جائیں تو گھنٹوں اٹھنے کو دل نہیں چاہتا۔ عزیز بھائی فقرہ لگانے میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ آج بھی اس شہر کے لوگوں کو عزیز بھائی کی بذلہ سنجی یاد ہوگی۔

سلیم بھائی کے یہاں رات کو دیر تک بیٹھک ہوا کرتی۔ کبھی کبھی عزیز بھائی بھی آ جاتے تھے۔ ہاتھ میں ایک چھڑی لیے ہوئے اور جب بیٹھک ختم ہوتی تو وہ مجھے اور جاوید کو مخاطب کرتے۔ "آؤ یار۔ ذرا گھر تک ٹہلتے ہیں۔"

ہم دونوں ان کے ساتھ ہو لیتے۔ ان کا گھر کچھ فاصلے پر تھا۔ راستے بھر گپ شپ ہوتی رہتی۔ عزیز بھائی کے فقرے۔ ان کے لطیفے۔ راستے بھر جاری رہتے۔ ایک دن انہوں نے بڑی معصومیت سے بتایا۔ "بھائیو۔ بات صرف اتنی ہے کہ مجھے کتوں سے بہت ڈر لگتا ہے اس لیے تم لوگوں کو اپنے ساتھ لے آتا ہوں۔"

ایک بار عزیز بھائی نے ایک عجیب واقعہ سنایا تھا۔ یاد رہے کہ یہ واقعہ سترہ اٹھارہ برس پہلے سنایا گیا تھا لیکن اس کی تصدیق گزشتہ دنوں ہوئی۔ وہ واقعہ کچھ یوں ہے۔ "ایک بار میں اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ رات کے وقت ساحل پر بیٹھا تھا (یاد رہے کہ ساحل اس زمانے میں اتنا آباد نہیں تھا۔ جتنا آج کل ہے) چاندنی تھی۔ اچانک ہم نے سمندر کی طرف سے کچھ سفید سفید پروں والے انسانوں کو پرواز کرتے ہوئے دیکھا۔ وہ لوگ بہت آہستہ آہستہ پرواز کر رہے تھے اور جب وہ غول قریب آیا تو ہم نے دیکھا کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنا سر اپنے دائیں بازو پر جھکا رکھا تھا۔ ان کے دونوں ہاتھ آگے کی طرف پھیلے ہوئے تھے اور وہ غول پرواز کرتے ہوئے ہمارے سروں کے اوپر سے گزر گیا۔"

یہ تھا واقعہ اور عزیز بھائی کی اس بات پر ہمیں یقین بھی آ گیا تھا کیونکہ وہ ایک سچے اور معصوم انسان تھے۔ اس واقعے کی تصدیق کچھ یوں ہوئی کہ گزشتہ دنوں ایک کتاب آئی ہے جس میں ان لوگوں کے انٹرویو ہیں جو موت کے منہ سے واپس آ رہے ہیں۔ وہ لوگ جن کے دلوں کی دھڑکنیں کسی وجہ سے رک گئی تھیں۔ یہ لوگ دنیا کے مختلف ممالک کے ہیں۔ یعنی ان کا ایک دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہے لیکن ان سبھوں نے جو اپنے تجربات بیان کیے ہیں۔ ان میں ایک مشترک بات ہے اور وہ یہ ہے کہ ان سبھوں کو فضا میں پرواز کرتے ہوئے بالکل اسی پوزیشن میں ایسے لوگ دکھائی دیے ہیں جن کا ذکر عزیز بھائی بہت پہلے کر چکے تھے۔ خدا جانے یہ کیا بھید ہے۔ کون ہیں وہ لوگ۔ میں سمجھتا ہوں کہ عزیز بھائی ایک معصوم اور نیک انسان تھے اسی لیے ان کی اجلی روح نے ایسا ایک منظر دیکھ لیا۔

فرمایا میرے ایک عزیز دوست کے والد نے کہ انسان اگر نشہ کرے تو اس کو بھی ایسے مناظر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ خاص طور پر بھنگ کا نشہ۔ جو عالم بالا کی سیر کرا دیتا ہے۔ میرے دوست کے والد بہت دلچسپ انسان تھے۔ ہم

جب ان کے پاس جاتے تو وہ اسی بے تکلفی سے گفتگو کرتے جیسے ہم ان کے بیٹے نہیں بلکہ ان ہی کے دوست ہیں۔

ہم ایک بار ان کے پاس گئے تو وہ کمرے میں کچھ گھوٹ رہے تھے۔ وہ ہمیں دیکھ کر ایک خاص انداز سے مسکرا دیے۔ "چلو اچھا ہوا۔ تم لوگ آگئے ہو۔ میں نے ٹھنڈائی بنائی ہے۔ وہ ضرور استعمال کرو۔"

"یہ کیا چیز ہے جناب؟" میں نے پوچھا۔

"اس سے اندر کی گرمی ختم ہوتی ہے۔" انہوں نے بتایا۔ "دل اور دماغ کو تقویت ملتی ہے۔"

پھر انہوں نے دل اور دماغ کو تقویت دینے والا وہ شربت ہمیں پلا دیا جو در اصل بھنگ تھا اور جس کو پی کر ہمارے چودہ طبق روشن ہو گئے تھے اور ہمیں کوئی حور وغیرہ تو نظر نہیں آیا لیکن بھنگ نے ہماری حالت ضرور خراب کر دی تھی۔

ہاں۔ ایک دفعہ رمضان صدیقی کے ساتھ شراب کی دو چار چسکیاں ضرور لی تھیں۔ جانے یہ سب لکھنا کس حد تک درست ہے کیونکہ ہمارا عقیدہ ہے کہ جو ہم میں نہیں رہا اس کے عیب چھپا لو۔ یہ بہت بری بات ہے کہ اس کی بری عادتوں کا ذکر کیا جائے لیکن مجھے منٹو کی ایک بات یاد آرہی ہے۔ اس نے ایک جگہ لکھا ہے کہ یہ ہمارے یہاں کی منافقت ہے کہ لوگ کسی بندے کو اس کی موت کے بعد رحمت اللہ کی کھونٹی پر لٹکا دیتے ہیں۔ ارے بھائی جو جیسا ہے اس کو ویسا ہی بیان کرو۔ آخر وہ بھی انسان ہی تھا اور انسان تو یہ سب کچھ کرتا ہی رہتا ہے۔

میرے ایک دوست کا فلسفہ ہے کہ اچھا انسان وہی ہے جس میں دو چار برائیاں ہوں۔ مکمل فرشتہ یا مکمل شیطان سے ہماری دوستی نہیں ہو سکتی۔ کچھ نہ کچھ عیب ضرور ہونا چاہیے۔ چاہے سگریٹ پیتا ہو۔ جوا کھیلتا ہو۔ شراب نوشی کرتا ہو۔ عشق کرتا ہو۔ کچھ نہیں تو گندے لطیفے ہی سناتا ہو۔ تب جا کر اس سے ایک ذہنی ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے اور آپ اس کی محبت میں بیٹھ سکتے ہیں۔ مکمل فرشتہ ہو تو اس کے پاس وقت گزارنا مشکل ہو جائے۔ آخر آپ اس سے کس موضوع پر بات کریں گے۔

میں نے بہت برے انسانوں میں بھی جمالیاتی قدریں دیکھی ہیں۔ شاہ فیصل کالونی میں ایک غنڈہ ہوا کرتا تھا۔ بہت بدنام۔ لوگ اس کے نام سے گھبرایا کرتے لیکن وہ بہت اچھی تصویریں بناتا تھا۔ یہ اس کے مزاج کا دوسرا روپ تھا۔ نہ جانے برش ہاتھ میں لیتے ہی اس کی ساری خوں خواری کہاں چلی جاتی تھی اور وہ کینوس پر رنگوں کے پھول کھلانے لگتا تھا۔

اور کچھ لوگ ایسے بھی ملے جن کے کردار نے حیران کر دیا۔ ایک صاحب ملے جن کی صاحبزادی اس وقت تیرہ چودہ برس کی تھی۔ اس کا نام عاشی فرض کر لیں۔ بہت پیاری خوبصورت سی بچی تھی۔ وہ صاحب یہ چاہتے تھے کہ وہ کسی طرح ٹی وی پر آجائیں۔ میں نے اتفاق سے اسی بچی کو ٹی وی پر چانس دلوا دیا۔ اس نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ اسے دوسرا اور تیسرا بھی مل گیا۔ وہ بہت اچھی رقاصہ بھی تھی۔ وہ صاحب میرے بہت شکر گزار تھے۔ بات بات پر میرا شکریہ ادا کرتے۔

ایک خاص عمر ہوتی ہے جب انسان واہموں میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ اپنی زندگی کے لیے عظیم الشان خواب دیکھتا ہے اور جب ان خوابوں کی تعبیر نہ ملتی ہو تو وہ ٹوٹکوں، جادو ٹونے اور تعویذ گنڈوں کے چکر میں پڑتا ہے۔ خاص طور پر کسی محبوب کو اپنی جانب راغب کرنے کے لیے۔

میں بابا رضوی کے آستانے پر اس قسم کے تماشے دیکھا کرتا تھا۔ آنے والا ہر شخص اپنے حالات سے پریشان نظر آتا تھا۔ اس کی خواہش ہوتی تھی کہ راتوں رات اس کی تقدیر بدل جائے۔ نہ جانے کس قسم کے جال ہمارے چاروں طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ علم جفر، پامسٹوں، ہندسوں سے تقدیر، تاریخ پیدائش، ٹیلی پیتھی یہ سب کیا ہے۔ انسان اتنا ترقی یافتہ اور خود مختار ہونے کے باوجود اتنا مجبور کیوں ہو جاتا ہے۔

میں یہ بتا رہا تھا کہ انسان کیا ہوتا ہے۔ کتنا مخلص اور کتنا منافق۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ آگے کے لمحے اس کا کیا رویہ ہو جائے گا۔ اس طرح ہم بھی اپنے جذبوں اور اپنے تعلق کی عینک سے لوگوں کو دیکھتے ہیں۔ یا تو اسے فراموش کر دیتے ہیں۔ یا ہمیشہ یاد رکھتے ہیں۔ یاد تو سب ہی کو رکھتے ہیں۔ ان کو بھی جنہوں نے ہمارے ساتھ حسن سلوک کیا اور انہیں بھی جو ہم سے محبت کرتے رہے یہ اور بات ہے کہ یاد رکھنے کے انداز مختلف ہوا کرتے ہیں۔

ہمارے خاندان میں نانی جان کے بعد ایک دوسری خاتون ایسی تھیں جنہیں ہم کبھی بھلا نہیں سکتے۔ اتنی شفیق اتنی محبت کرنے والی ہستی کم ہی ہوا کرتی ہے۔ کراچی آنے کے بعد ایک طرح سے انہوں نے ہماری پرورش ہی کی ہے۔

وہ میری والدہ کی پھوپی زاد بہن [illegible]



کا۔ لیکن سب انہیں بوبو کہتے تھے۔ ہم بھی بوبو کہنے لگے۔ ان کے دو صاحبزادے ظفر احمد اور اشرف احمد۔ ظفر احمد ہمارے بھی خالو ہیں۔ یعنی میری خالہ عزیزہ خاتون کے شوہر اور اشرف احمد میرے سب سے چھوٹے بھائی شکیل کے سسر ہیں۔ ہماری چھوٹی خالہ کے صاحبزادے محبوب، ایوب، سعید، شارق، کاشف، انیل اور بیٹی صدف۔ یہ میں اس لیے لکھ رہا ہوں تاکہ بوبو کے مزاج کو سمجھنے میں آسانی رہے۔

ہماری رہائش کچھ دنوں تک بہار کالونی میں بھی رہی ہے۔ جہاں یہ لوگ پہلے سے آکر آباد ہو گئے تھے۔ ہم ان ہی کے یہاں آئے۔ ہر ایک کے ساتھ شفقت اور محبت۔ انہوں نے سب کو سمیٹ کر رکھ لیا۔ ہم ان سے اسی طرح ضد کیا کرتے جس طرح اپنی نانی جان سے کرتے تھے اور وہ ہماری ضد پوری کر دیتیں۔

انسان اپنی فطرت میں گونا گوں واقع ہوا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کے مزاج میں تبدیلی آتی جاتی ہے۔ ایسے بھی بزرگ دیکھے ہیں جو چڑچڑے اور تنہائی پسند ہو جاتے ہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے ہیں اور ایسے بھی جو مجسم شفقت بن جاتے ہیں۔ خاص طور پر بچوں کے لیے۔

مجھے بھی نہ جانے کیوں بچوں سے بہت پیار ہے۔ بہت اچھے لگتے ہیں۔ ان سے دوستی کرنا، ان کی باتیں سننا بہت اچھا محسوس ہوتا ہے۔ وہ منافق نہیں ہوتے اسی لیے ان کے وجود کی خوشبو پورے ماحول کو معطر رکھتی ہے۔

دوسری طرف وہ اگر کسی بات پر اڑ جائیں تو انہیں سمجھانا بہت مشکل ہو جاتا ہے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ جاوید نے جس وقت شگفتہ سے شادی کی۔ اس وقت شگفتہ مطلقہ تھی اور اس کے دو بچے بھی تھے۔ ایک بار وہ دونوں بچے ماں سے ملنے کراچی آئے۔ اس وقت جاوید بہت عجیب الجھن میں گرفتار ہو گئے تھے۔ مجھ سے کہنے لگے۔ "بھئی۔ میں تو ان بچوں کی وجہ سے پریشان ہو گیا ہوں۔"

"وہ کیوں۔ بچے تو بہت پیارے ہیں۔"

"ہاں۔ پیارے تو ہیں لیکن وہ شگفتہ سے بات بھی نہیں کرنے دیتے۔ نہ جانے مجھے کیا سمجھتے ہیں؟ میں شگفتہ کی طرف دیکھتا بھی ہوں تو وہ ناراض ہو جاتے ہیں۔"

یہ واقعی ایک دلچسپ اور پریشان کن صورت حال تھی۔ شگفتہ خود بھی [illegible] دیکھ کر مسکراتی رہتی تھی۔

مجھے وہ لوگ بہت برے لگتے ہیں جو اپنے بچوں کے ساتھ برا سلوک کرتے ہیں۔ میں نے ایسے بھی لوگ دیکھے ہیں جو بہت بے رحمی سے بچوں کو مارتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے مجھے گھن محسوس ہوتی ہے۔ وہ شاید انسان ہی نہیں ہوتے۔ خدا مجھے معاف کرے۔ خاص طور پر وہ لوگ جو بہت زیادہ مذہبی ہونے کے غرور میں مبتلا ہوتے ہیں۔ ان کا رویہ بچوں کے ساتھ بہت برا ہوتا ہے۔ وہ انتہائی سخت ہو جاتے ہیں۔

اور ایک طرف وہ لوگ ہیں جو اوروں کے بچوں کو بھی اپنے پیار اور اپنی توجہ کے دائرے میں رکھتے ہیں۔ بوبو بھی ایسی ہی تھیں۔ شاید یہ اپنے ظرف کی بات ہوتی ہے۔

میرا خیال ہے کہ وقت اور حالات بدلنے کے ساتھ ساتھ بچوں کو تربیت دینے کے انداز بھی بدل گئے ہیں۔ اب اس بات پر زور دیا جاتا ہے کہ باپ اور بیٹے کے درمیان ایک دوستی کی فضا ہو۔ بے تکلفی ہو اور کبھی کبھی یہ بے تکلفی حد سے بھی سوا ہو جاتی ہے۔

میں نے خود اپنی آنکھوں سے اپنے ایک دوست کے گھر کا حال دیکھا ہے۔ موصوف کا نام آپ جواد فرض کر لیں (خوف فساد خلق کی وجہ سے ان کا نام چھپانا ضروری ہے) تو شام کا وقت ہے۔ میں جواد کے ساتھ اس کے گھر میں بیٹھا ہوں۔

کچھ دیر بعد جواد کے والد صاحب کہیں باہر سے آگئے۔ انہوں نے ایک بہت خوبصورت قمیص پہن رکھی تھی۔ جو ان کی باوقار شخصیت سے بہت میچ کر رہی تھی۔

"واہ بابا۔ قمیص تو بہت زوردار پہن رکھی ہے۔" جواد نے آواز لگائی۔

"ہاں بھئی۔ پچھلے ہفتے خریدی تھی۔"

"سودا کریں بابا۔ پچاس روپے دوں گا۔" جواد نے کہا۔

"نہیں بھئی۔ پچاس میں نہیں۔ کم از کم ستر لوں گا۔"

بہرحال ساٹھ میں سودا ہو گیا۔ جواد نے اپنی جیب سے ساٹھ روپے نکال کر اپنے والد کے حوالے کیے اور والد نے قمیص اتار کر اس کی طرف بڑھا دی اور یہ سب کچھ مذاق میں نہیں ہو رہا تھا۔ بلکہ انتہائی سنجیدگی کے ساتھ ہوا تھا بلکہ اور بھی بہت کچھ۔

میں نے ایک ایسے باپ بیٹے دیکھے جو ایک ہی وقت میں ایک ہی لڑکی سے عشق کر رہے تھے۔

تو ہم یہاں تک آگئے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ بچوں کی پرورش کے سلسلے میں کیا رویہ اپنایا جائے۔ سختی کا یا نرمی

کا۔ انہیں تباہ ہونا ہو تو دونوں ہی صورتوں میں تباہ ہو جاتے ہیں۔ ویسے یہ بات تو ہے کہ خدائی عظیم ترین نعمتوں سے ایک اولاد بھی ہے بلکہ سب سے بڑی نعمت یہی ہے۔

میں نے ایک بار ایک کہانی لکھی تھی کہ میں ٹائم مشین کے ذریعے اپنے بچپن میں پہنچ جاتا ہوں۔ وہ دن جو بہت خوبصورت تھے۔ جب میں گلیوں اور چھتوں پر چہکتا پھرتا تھا۔ جب پتنگیں اڑاتا۔ جب میرے چاروں طرف محبت کرنے والے لوگ موجود تھے اور ان کے درمیان بہت تحفظ کا احساس ہوتا تھا۔ اس کے باوجود کسی چیز کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ماضی میں آنے کے بعد کس چیز کی کمی واقع ہو گئی ہے۔ جبکہ ساری خوشیاں میرے پاس تھیں۔ وہ دن لوٹ آئے تھے۔ جن کو میں نے ہمیشہ یاد کیا۔ جن کے لیے ٹھنڈی آہیں بھرتا رہا تو پھر آخر کون سی بات ہو گئی تھی۔ جس نے مجھے بے چین کر رکھا تھا۔

پھر یاد آیا۔ اوہو۔ اس بے چینی کا سبب کیا ہے۔ میری بیٹی نے مجھے پیار سے پکارا نہیں تھا۔ اس نے میرے گلے میں اپنی ننھی باہیں نہیں ڈالی تھیں۔ میرے بیٹے نے مجھے آواز نہیں دی تھی۔ بس یہی میری بے چینی تھی۔ میری کوفت کا سبب تھا۔ یہی بے سکونی تھی تو پتا چلا کہ زندگی دھیرے دھیرے اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھتی رہتی ہے اور جو بھی عہد ہوتا ہے وہ ہمارے لیے سب سے بہتر ہوتا ہے۔ جوانی میں بوڑھا بن جانا غیر فطری ہے۔ اس طرح بڑھاپے میں جوانی کی خواہش۔ پھر موت۔ جو سب سے زیادہ نیچرل ہے۔ تو ہم سب اپنے اپنے منطقی انجام کی طرف جا رہے ہیں اور نتیجہ صرف ایک ہی ہے کہ رہے نام سائیں کا۔

شادی کے بعد میری زندگی کا ایک اور سفر شروع ہوا۔ ایک نیا تجربہ۔ ایک نئی دنیا۔ ایک نیا احساس۔ تلخ بھی۔ شیریں بھی۔ برا بھی۔ بھلا بھی۔ پریشان کرنے والا بھی اور سکون دینے والا بھی۔ شادی کے اتنے دنوں بعد بھی یہ فیصلہ نہیں کر سکا ہوں کہ جو کچھ ہوا وہ اچھا ہوا یا ہونا نہیں چاہیے تھا۔

لڑکیوں کو دیکھنے دکھانے کے معاملے میں میرا مزاج کچھ اور رہا ہے (شادی کے سلسلے میں) میرا خیال ہے کہ جس لڑکی کو دیکھنے جاؤ۔ اسے اپنا لو۔ لڑکیاں نمائش میں سجی ہوئی چیزیں نہیں ہوتیں کہ جن کو دیکھا۔ پسند آ گئیں تو خرید لیا ورنہ چھوڑ کر چلی آئی۔ مجھے یہ سب بہت برا لگتا ہے۔

میں ایک لڑکی کو دیکھ چکا ہوں۔ میرے بڑے بھائی خواجہ اسرار (مرحوم) کے لیے گھر والے لڑکی دیکھنے گئے تھے۔ انہوں نے بہت زبردست دعوت کا اہتمام کیا تھا۔ خیر۔ تو جب میں نے اس لڑکی کو دیکھا تو مجھے دکھ سا ہونے لگا اس لیے نہیں کہ اس لڑکی میں کوئی خرابی تھی بلکہ صرف اس لیے کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں بے شمار سوالات تھے۔ کیا ہو گا؟ کیا لڑکے والے اسے پسند کر لیں گے؟ کیا میرا رشتہ ہو جائے گا؟ کیا میں نروس تو نہیں ہو رہی؟ کیا میرے ہاتھ پاؤں تو نہیں کانپ رہے؟

بس یہ سب کچھ مجھے بہت برا محسوس ہوتا ہے۔

بہرحال اس لڑکی سے تو بھائی صاحب کی شادی نہیں ہو سکی اور عائشہ بھابی بن کر آ گئیں۔ یہ بھی افسانے لکھا کرتی تھیں۔ بلکہ یونس شرر وغیرہ سے ان ہی کے ذریعے ملاقات ہوئی تھی۔ اس عورت میں بلا کی ہمت تھی اور آج بھی ہے۔ جس کی مثال میں آج تک دیا کرتا ہوں۔

شادی کے وقت یہ ایک اسکول میں پڑھایا کرتی تھیں۔ کراچی کے باشندے اس فاصلے کا صحیح تصور کر سکتے ہیں۔ ملیر سے وہ بس کے ذریعے ٹاور جاتی تھیں۔ ٹاور سے دوسری بس کے ذریعے کیماڑی اور کیماڑی سے لانچ پکڑ کر منوڑہ۔ جہاں ان کا اسکول تھا اور ٹھیک آٹھ بجے صبح اسکول پہنچنا ہوتا تھا۔

بہرحال تو اسرار بھائی کی دو اولادیں ہوئیں۔ شہاب اور ارم۔

خیر تو میں یہ بتا رہا تھا کہ میری شادی دور کے رشتے ہی میں طے پا گئی۔ اس وقت میرے مرحوم سسر پولیس آفیسر ہوا کرتے تھے۔ انتہائی نمازی اور پرہیزگار انسان۔ جبکہ میری خوش دامن بھی مذہبی رجحان کی خاتون تھیں۔ وہ رشتے میں میری باجی ہوتی تھیں اسی لیے میں انہیں باجی ہی کہتا رہا۔ زندگی میں شادی کی صورت میں ایک حیرت انگیز تبدیلی رونما ہونے لگی تھی۔

میری بیوی نگار ایک گھریلو لڑکی تھی۔ بے شمار شکایتیں بھی ہیں اور کچھ ایسی خوبیاں بھی ہیں جو دوسری میں شاید بہت کم ہوں۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ مجھ جیسے لاابالی شخص کو بہ حیثیت شوہر کے قبول اور برداشت کرنا بھی ایک بڑا ہنر ہے۔ شادی کے وقت میں ملیر میں رہا کرتا تھا۔ عجیب زندگی تھی۔ خوب خوب مزے تھے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ......

منظر امام کی خودنوشت ابھی جاری ہے

بقیہ واقعات آئندہ ماہ ملاحظہ کریں

# ہدف

عمران قریشی

**شکاریات کے قصے آپ نے بہت پڑھے ہوں گے لیکن یہ ایک بالکل الگ انداز کی شکار کہانی ہے جسے آپ ذوق و شوق سے اختتام تک پہنچنے کے لیے صفحات پر صفحات پڑھتے چلے جائیں گے۔**

**شکار کہانی پڑھنے والوں کے لیے تحفہ خاص**

شڑاپ شڑاپ کی آواز سے ماحول متاثر ہوا۔ وہ پانی پر آ گیا تھا۔ فاضل حسین کی رائفل پر ٹارچ لگی ہوئی تھی لیکن وہ اسے وقت سے پہلے روشن نہیں کرنا چاہتا تھا۔ آدم خور نے پانی پیا اور ٹھنڈی گھاس پر بیٹھ گیا۔ وہ اسے دکھائی نہیں دے رہا تھا لیکن تخیل کی نگاہ اور طاقتور حواس خمسہ اسے آدم خور کی ہر حرکت سے باخبر کر رہے تھے۔ مچان سے اس کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ وہ اس کے ہلکے ہلکے غرانے کی آواز کو صاف سن سکتا تھا۔ اب دیر کرنا مناسب نہیں تھا۔ اس نے ٹارچ آن کر دی۔ روشنی کا

دھاڑا اچھل کر آدم خور کے اردگرد اچھل گیا۔ اس نے گردن موڑ کر تفصیلی نگاہوں سے چٹان کی طرف دیکھا۔ وہ گھاس پر لمبائی کے رخ میں لیٹا ہوا تھا۔ اس کا یوں لیٹنا فاضل حسین کے حق میں بہتر تھا۔ اس نے سانس روکا اور شیر کی اگلی ٹانگ کے پاس متحرک جوڑ کا نشانہ لے کر فائر کر دیا۔ زوردار دھماکا ہوا۔ وہ اسپرنگ لگے کھلونے کی مانند اچھلا۔ اس کے چاروں پاؤں فضا میں حرکت کرتے دکھائی دیے پھر وہ زمین پر گر کر لوٹ پوٹ ہونے لگا۔ چیل، فاضل حسین کے قریب چٹان پر بت بنا بیٹھا تھا۔ آدم خور کے ساکت ہوتے ہی اس نے نیچے چھلانگ لگانے کی کوشش کی۔ فاضل حسین نے اسے روک دیا۔ آدم خور غیر معمولی طاقت کا حامل تھا۔ وہ ایک گولی سے ہلاک نہیں ہو سکتا تھا لیکن دوسری گولی چلا کر وہ اس کی کھال کو ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پانچ منٹ انتظار کرتے رہنے کے بعد وہ چٹان سے نیچے آ گیا۔ اب بھی اس نے آدم خور کے قریب جانے سے احتراز کیا اور چند پتھر اس کی جانب اچھال دیے۔ وہ ساکت رہا۔ چیل چھلانگ لگا کر اس کے قریب آ کھڑا ہوا۔ فاضل حسین نے رائفل اسے تھمائی اور خود آگے بڑھ کر لاش کا معائنہ کرنے لگا۔ حسب توقع وہ بوڑھا شیر تھا۔ اس کے دانت جھڑ گئے تھے۔ دم سے لے کر ناک تک لمبائی اندازاً آٹھ فٹ تھی۔ اس نے چیل کو ریسٹ ہاؤس میں جا کر نوکروں کو بلانے کے لیے کہا اور خود سگریٹ سلگا کر قریب پڑے ہوئے پتھر پر بیٹھ کر کش لگانے لگا۔ آخرکار گڑوے کا آدم خور اپنے انجام کو پہنچ ہی گیا تھا۔ فاضل حسین کی چلائی ہوئی گولی اس کے دل میں پیوست ہو گئی تھی۔

فاطمہ سے اکثر و بیشتر فون پر بات چیت ہو جایا کرتی تھی۔ گڑوے گاؤں سے کچھ دور بنے ہوئے ڈاکخانے میں فون کی سہولت موجود تھی۔ اور ہوشنگ آباد میں فاضل حسین کی رہائش گاہ کے قریب جوڑا کا ڈاکخانہ تھا۔ اس کا کلرک اس کا دوست تھا۔ وہ فون کر کے کلرک کے ذریعے فاطمہ کو بلا لیتا تھا اور یوں چند منٹوں کی بات چیت ہو جایا کرتی تھی۔ تاہم بچوں سے شاذ و نادر ہی بات ہوا کرتی تھی۔ اس نے دل میں تہیہ کیا کہ صبح ہوتے ہی فوراً بعد ہوشنگ آباد کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ ابھی رات کا کافی حصہ باقی تھا۔ اس دوران وہ آدم خور کی کھال کو محفوظ کر سکتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے بعد نوکر لالٹین کی طرف آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں مشعلیں تھیں اور وہ چاقو چھری سے لیس تھے۔ کھال اتارنے کے کام کا آغاز ہوا۔ یہ نہایت نازک مرحلہ ہوتا ہے۔ زور زبردستی یا جلد بازی کھال کو خراب کر سکتی [illegible] لیے نہایت احتیاط اور آرام و سکون کے ساتھ کھال اتاری جاتی ہے۔ اس عمل میں تقریباً دو گھنٹے لگ گئے۔

کھال اتارنے کے بعد نوکروں نے اسے اٹھایا اور جنگل سے نکل کر گڑوے کے قریب واقع ریسٹ ہاؤس میں آ گئے۔ ریسٹ ہاؤس کے پیچھے گاؤں کا متروک قبرستان واقع ہے۔ یہاں کی قبریں نہایت خستہ حال اور غار نما گڑھوں پر مشتمل تھیں۔ توہم پرست گاؤں والوں کا کہنا تھا کہ قبرستان آسیب زدہ ہے۔ رات کے اندھیرے میں یہاں سائے حرکت کرتے ہیں اس لیے انہوں نے اپنے مردے وہاں دفن کرنا چھوڑ دیے۔ گڑوے میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ ہندوؤں کے صرف چند گھرانے تھے اس لیے تدفین کے لیے گاؤں کے باہر کی زمین کو مختص کر دیا گیا۔

جب فاضل حسین اور نوکروں نے ریسٹ ہاؤس میں قدم رکھا تو رات کے تین بج رہے تھے۔ اس نے چیل کو جانے کے لیے کہا اور خود نہانے کے لیے غسل خانے میں آ گیا۔ ابھی وہ غسل سے فارغ بھی نہیں ہونے پایا تھا کہ ریسٹ ہاؤس کے گیٹ پر کسی نے اس کا نام پکارا۔ غسل خانے کا روشندان گیٹ کے پاس تھا اس لیے اس نے آواز کو بخوبی سنا۔ مخاطب کرنے والے کے لب و لہجے سے اندازہ لگانا مشکل نہیں تھا کہ وہ انگریز ہے لیکن گڑوے میں کوئی انگریز نہیں تھا۔ چیل نے گیٹ کھولا اور انگریز سے بات چیت کرنے لگا پھر اسے اندرونی کمرے کی طرف لے گیا۔

فاضل حسین نے جلدی جلدی غسل کیا اور کپڑے پہننے کے بعد رہائشی کمرے کی طرف آ گیا۔ وہاں ایک مرد اور عورت اس کے منتظر تھے۔ مرد کی تصویر اس نے اکثر و بیشتر اخبار میں دیکھی تھی۔ وہ ملک کا مایہ ناز شکاری تھا۔ اس کا نام جون ویز تھا۔ عرف عام میں اسے انکل جون کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا۔ گزشتہ سال وہ ریٹائر ہونے کے بعد انگلستان چلا گیا تھا۔ گڑوے میں اس کی موجودگی ناقابل فہم تھی۔ اس کے قریب اس کی پچیس سالہ خوبصورت بیوی فلورا بیٹھی تھی۔ اس کی نگاہیں اپنے پاؤں کی انگلیوں پر مرکوز تھیں اور وہ ماحول سے یکسر الگ تھلگ اور لاتعلق دکھائی دے رہی تھی۔ انکل جون اور فلورا کی عمروں کے درمیان پندرہ سال کا فرق تھا۔ اسے کمرے میں داخل ہوتا دیکھ کر انکل جون نے نہایت گرم جوشی کے ساتھ گڑوے کے آدم خور کی ہلاکت پر اسے مبارکباد دی۔ فاضل حسین حیرت زدہ رہ گیا۔ آدم خور کی خبر اتنی جلدی اس تک پہنچ گئی تھی۔ انکل جون نے اس کی دماغی کیفیت کا اندازہ لگاتے ہوئے بتایا۔ "میری رہائش گاہ [illegible] نے مجھے [illegible] کر دیا کہ آدم خور ہلاک ہو گیا ہے۔"

فاضل حسین نے پوچھا۔ "یہ بات میرے لیے قابل حیرت ہے کہ گڑوے میں رہائش پذیر ہونے کے باوجود بھی آپ نے آدم خور کو ہلاک کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کے پیچھے کوئی وجہ تو ضرور ہوگی۔"

"میں نے اسے شکار کرنے کی کوشش کی لیکن بری طرح ناکام ہوا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ میں ریٹائرمنٹ کے بعد انگلستان چلا گیا تھا۔ حکومت کے اصرار پر میں چند دنوں کے لیے ہندوستان آیا۔ فلورا میرے ساتھ تھی۔"

فاضل حسین نے فلورا کی طرف دیکھا۔ وہ پتھر کے مجسمے کی مانند کرسی پر ساکت و جامد بیٹھی تھی۔ اس نے اب تک بات چیت میں حصہ لینے کی کوشش نہیں کی تھی۔ فاضل حسین کے لیے یہ بات بھی حیرت کا باعث بن رہی تھی۔ وہ ایک باتونی عورت ہونے کے باوجود بھی صبر و تحمل کے ساتھ خاموش بیٹھی تھی۔

انکل جون نے بتایا۔ "یہاں آنے کے بعد فلورا کی طبیعت خراب ہو گئی اور مجھے ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد ریسٹ ہاؤس کو چھوڑنا پڑا۔"

فاضل حسین بولا۔ "ہار جیت شکار کا ایک حصہ ہے۔ ضروری نہیں کہ جیت ہمیشہ شکاری کی ہو۔ کبھی کبھی جانور بھی شکاری کو پچھاڑ دیتا ہے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں۔"

"لیکن میری ہار غیر معمولی ہے کیونکہ اس میں نااہلی اور قسمت کا عمل دخل نہیں۔ مجھے نہایت خوبصورتی کے ساتھ دھوکا دیا گیا۔ تم یقین کرو گے۔ گڑوے کا آدم خور میرے سامنے موجود تھا اور میری انگلی رائفل کے گھوڑے پر منجمد ہو کر رہ گئی۔ اگر گھوڑا دب جاتا تو آدم خور میرے نام سے منسوب ہو جاتا لیکن عین وقت پر میرے ساتھ وہ ہوا جسے میں کبھی بھی فراموش نہیں کر سکوں گا۔"

فاضل حسین نے بے زار لہجے میں کہا۔ "ایسا کیا ہو سکتا ہے۔ جسے فراموش نہ کیا جا سکے۔ آپ کی رائفل کا گھوڑا دبا نہیں ہوگا۔ یا پھر آپ کارتوس گھر میں بھول گئے ہوں گے۔ یہ بھی ہو سکتا ہے۔ جس درخت پر مچان بندھی ہوگی۔ اس کی شاخ ٹوٹ گئی ہوگی۔ اس کے علاوہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"

انکل جون نے جواب دیا۔ "تمہاری غلط فہمی ہے۔ اس رات میرے ساتھ وہ ہوا جو تمہارے وہم و گمان میں بھی نہیں آ سکتا۔ چلو ایسا کرتے ہیں۔ میں تمہیں اپنی آپ بیتی سناتا ہوں۔ تم اسے اخبار میں شائع کرو۔ میرا مقصد حل ہو جائے گا [illegible]

فاضل حسین کی شکاری آپ بیتی شہر کے مایہ ناز اخباروں میں شائع ہوتی تھی۔ انکل جون اس کی شہرت سے آگاہ تھے اور یہ بات فاضل حسین کے لیے قابل فخر تھی کہ اس کی آپ بیتی میں چند واقعات انکل جون کے بھی شائع ہو جاتے اس لیے اس نے چند لمحے سوچتے رہنے کے بعد اثبات میں سر ہلا دیا۔

انکل ہمکلام ہوئے۔ "چند ماہ قبل مجھے حکومت کی جانب سے خط ملا کہ میں ہندوستان آ کر اس موذی کا خاتمہ کروں۔ جس نے اس وقت تک پچاس سے زائد انسانوں کو لقمۂ اجل بنا لیا تھا۔ ان دنوں میں اپنے چھوٹے بھائی کی سالگرہ کا اہتمام کر رہا تھا۔ میں نے پروگرام ملتوی کیا اور ہندوستان آ گیا۔ گڑوے میں میرا قیام اسی ریسٹ ہاؤس میں تھا جس میں اس وقت تم رہائش پذیر ہو۔ گاؤں میں خوف و ہراس کا یہ عالم تھا کہ رہائشیوں نے رفع حاجت کے لیے بھی گھروں سے باہر نکلنا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھروں میں ہی قضائے حاجت کیا کرتے تھے۔ بدبو اور تعفن کی وجہ سے بیماریاں پھیلنے لگیں۔ میں نے اور فلورا نے گڑوے کے اردگرد پہاڑی علاقے کا تفصیلی جائزہ لیا۔ ان پہاڑوں میں کہیں آدم خور پوشیدہ تھا۔ فلورا بہت خوش تھی۔ اسے گڑوے کی خوبصورتی نے مسحور کر کے رکھ دیا تھا۔ میں پہلے بھی یہاں آ چکا تھا لیکن فلورا کا پہلا اتفاق تھا۔ دوسرے دن ہم نے رہائشیوں سے معلومات حاصل کیں۔ انہوں نے بتایا۔ آدم خور دن دیہاڑے گھروں میں داخل ہو کر مردوں کو اٹھا لے جاتا تھا۔" فاضل حسین بات درمیان میں کاٹتے ہوئے بولا۔ "لیکن میری معلومات کے مطابق وہ دن کو باہر نکلنے سے گریز کرتا تھا۔ تاہم بعض واقعات ایسے ہوئے جن کے دوران اس نے دن کے وقت اپنے ہدف کا تعین کیا لیکن کارروائی رات کو ہی کی۔"

انکل جون بولے۔ "تمہاری معلومات درست ہیں لیکن اس نے گزشتہ ماہ اپنے طریقۂ کار میں ردوبدل کر لی تھی۔ اس سے پہلے وہ دن کے وقت گھروں میں گھس کر مردوں کو اٹھا کر لے جاتا تھا۔ اس دوران گاؤں کے مردوں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے اسے ایک ایسے مکان میں قید کر دیا جس میں ایک چرواہا تنہا رہتا تھا۔ آدم خور چرواہے کو مار چکا تھا اس لیے اس چرواہے کی لاش کے ساتھ مکان میں قید کر دینے میں کوئی قباحت نہیں تھی لیکن گاؤں کے رہائشیوں نے اس کی طاقت کا اندازہ غلط لگایا۔ وہ دیوار کچی مٹی کی نہایت کمزور تھی جو آدم خور کے اچھل کود اور کئی بار کے دھکے کو سہہ نہ پائی اور اوپری حصہ ڈھ گیا۔ اس کے فرار کے لیے دیوار کا وہ ٹوٹا حصہ کافی تھا۔ اسی [illegible]

کے وقت شکار کرنے کے لیے باہر نکلنا ترک کر دیا۔ وہ اتنا چالاک درندہ تھا کہ شکار کرنے کے بعد بچ جانے والے گوشت پر دوبارہ نہیں آتا تھا۔ ہمارے یہاں رہنے کے دوران دو افراد کو شکار کیا۔ میں نے اور فلورا نے تمام رات مچان پر اس کا انتظار کیا لیکن وہ نہیں آیا۔ مجبوراً مجھے اپنا لائحہ عمل بدلنا پڑا۔ تم اچھی طرح جانتے ہو۔ گڑوے کے اردگرد پانی کے تین تالاب ہیں۔ دو پہاڑی چشمے بھی ہیں لیکن وہ آدم خور کے علاقے سے باہر ہیں۔ لامحالہ اسے پیاس بجھانے کے لیے انہی تالابوں میں سے کسی ایک پر آنا تھا۔ میں نے تالابوں کی گیلی زمین کا معائنہ کیا۔ تیسرے تالاب کی زمین پر مجھے اس کے پاؤں کے نشان مل گئے۔ یہ بہت پرانے تھے لیکن انہیں دیکھ کر یہ اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ وہاں آتا تھا۔ میں نے قریبی درخت پر مچان لگائی اور شام ہونے سے پہلے وہاں بیٹھ کر آدم خور کا انتظار کرنے لگا۔ پچھلی دو راتیں بے سود انتظار کے عالم میں گزر گئیں لیکن وہ تالاب پر نہیں آیا۔ تیسری رات فلورا کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اسے سردی لگنے سے بخار چڑھ گیا تھا۔ میں نے شکار کا پروگرام ملتوی کرنے کی کوشش کی لیکن فلورا نے انکار کر دیا۔ وہ بضد رہی کہ میں مچان پر ضرور جاؤں۔ مجبوراً میں تالاب کی طرف آگیا۔ تمام رات مچان پر جاگتے رہنے کے بعد جب صبح منہ اندھیرے میں نے ریسٹ ہاؤس کا رخ کیا تو فلورا کے کمرے کو باہر سے لاک پایا۔ مچان کی طرف جاتے ہوئے میں نے دروازہ کھلا چھوڑ دیا تھا اور مجھے اچھی طرح یاد تھا کہ جب میں نے گیسٹ ہاؤس سے باہر قدم رکھا تھا تب فلورا نے دروازہ بند کیا تھا۔ باہر سے بند کون کر سکتا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ میں نے کنڈی کو کھول کر دروازے کو دھکیلا تو وہ کھل گیا۔ اسے اندر سے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میری غیر موجودگی میں کوئی وہاں آیا تھا۔ میرے چھوٹے بھائی کی عادت تھی کہ وہ باہر جاتے ہوئے اکثر دروازے کو لاک کر جاتا تھا۔ ایک دفعہ ایسا ہوا تھا کہ وہ بے خیالی میں دروازے کو لاک کر کے کہیں چلا گیا۔ میں اور فلورا دو گھنٹے اندر بند رہے۔ بعد میں، میں نے جس مشکل سے روشندان کے ذریعے باہر نکل کر کنڈی کو کھولا میں اس کے متعلق تمہیں بتا نہیں سکتا۔ میرا چھوٹا بھائی شام کو واپس آیا اور پتا چلنے پر اپنے آپ کو ملامت کرنے لگا۔"

فاضل حسین نے پرتجسس لہجے میں پوچھا۔ "تو کیا وہ انگلستان سے گڑوے آیا تھا اور آپ کو اس کے متعلق معلوم نہیں تھا۔"

"ہاں مجھے کچھ معلوم نہیں تھا۔ میرے دماغ میں جو پہلا خیال آیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے ساتھ والے قبرستان کا تھا۔ وہاں کچھ قبریں ایسی بھی تھیں جو ریسٹ ہاؤس کی دیوار کے بالکل ساتھ بنی ہوئی تھیں۔ تم خود سوچ سکتے ہو کہ قبرستان میں گھومنے والے سائے دیوار کو پھلانگ کر بآسانی اندر آسکتے تھے۔"

فاضل حسین نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "کیا سائے ٹھوس اشیا کو پکڑنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ دروازہ بند کرنے کے لیے انہیں کنڈی کو تھامنا پڑتا اور میرے خیال میں وہ اتنی آسانی کے ساتھ یہ نہیں کر سکتے تھے۔ تمہیں اس کے متعلق فلورا سے پوچھنا چاہیے تھا۔"

"کمرے میں داخل ہونے کے بعد میں نے اس سے پوچھا لیکن اسے کچھ معلوم نہیں تھا۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مجھے باہر گیلی زمین پر قدموں کے نشان بھی نہیں ملے۔ تو پھر تم خود بتاؤ۔ میرا دھیان سایوں کی طرف کیوں نہیں جاتا۔ اگلی رات جب میں نے مچان کا رخ کیا تو میرا دماغ آدم خور کے بجائے ریسٹ ہاؤس میں وقوع پذیر ہونے والے واقعے کے متعلق سوچتا رہا۔" فاضل حسین نے فلورا کی طرف دیکھا۔ وہ اب بھی بے حس و حرکت بیٹھی تھی۔ انکل جون نے اس کی نگاہوں کے زاویے کو دیکھ کر دماغ میں ابھرنے والے خیال کا اندازہ لگالیا۔

"اس کی طبیعت ناساز ہے اس لیے بات چیت کرنے سے گریز کر رہی ہے۔ دراصل اسے گڑوے کا موسم راس نہیں آیا۔ وہ یہاں اس کے سحر میں گرفتار ہو کر عشق میں مبتلا ہوئی۔ وہاں اس کے موسم نے اسے بیزار بھی کر دیا۔ اسی لیے جلد واپس انگلستان جانا چاہتی ہے۔"

فاضل حسین نے پوچھا۔ "تو پھر کیا ان سایوں کی حقیقت معلوم ہوئی۔ یا پھر آدم خور کی تلاش میں پڑ کر تم نے اسے نظر انداز کر دیا۔"

وہ طویل سانس لیتے ہوئے بولا۔ "میں نے اس معاملے میں الجھ کر آدم خور کو نظر انداز کر دیا۔ وہ تالاب پر پانی پینے کے لیے نہیں آیا اور دن کے وقت میں نے اسے تلاش کرنے کی کوشش نہیں کی۔ اس بات کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے گڑوے کے ایک مکان میں گھس کر نا صرف واردات کی بلکہ وہاں کے رہائشیوں کو بھی زخمی کیا۔ وہ جس آدمی کو اٹھا کر جنگل کی طرف لے گیا تھا۔ اس کی لاش مجھے صبح دوسرے تالاب کے کنارے ملی۔ وہاں بیٹھ کر آدم خور نے نا صرف اپنا پیٹ بھرا تھا بلکہ جی بھر کر پانی بھی پیا تھا۔ میں نے مچان لاش کے قریب درخت پر منتقل کر دی اور اگلی رات اس کے انتظار میں وہاں بیٹھ



گیا۔ اس رات مطلع ابر آلود تھا۔ آسمان پر بادل گھرے تھے۔ میں برساتی اور گرم کپڑے اپنے ساتھ لایا تھا لیکن رات کو جب بارش شروع ہوئی تب سردی کی بدولت مجھے اپنے جسم کے رونگٹے کھڑے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے۔ میرے پاس اپنے جسم کو گرم کرنے کے لیے کوئی بھی سامان موجود نہیں تھا اور بارش تھی کہ تھمنے کا نام نہیں لے رہی تھی۔ مجبوراً رات کے دو بجے میں درخت سے نیچے اتر آیا۔ مجھے اپنی رائفل میں پانی جانے کا خدشہ بھی لاحق تھا اس لیے میں نے اسے برساتی کے اندر چھپا لیا۔ اب اگر آدم خور حملہ کرتا تو میں بآسانی اس کا نشانہ بن سکتا تھا لیکن میرے پاس اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا اس لیے احتیاط کو بالائے طاق رکھتے ہوئے ریسٹ ہاؤس کی طرف چل دیا۔ جنگل کی زمین دلدلی کیچڑ کی صورت اختیار کر چکی تھی۔ مجھے چلنے میں بہت دشواری پیش آرہی تھی۔ دو تین دفعہ میں منہ کے بل زمین پر گرتے گرتے بچا اور ایک دفعہ راستہ بھول کر ریسٹ ہاؤس کے مخالف طرف چلا گیا۔ سردی کا یہ عالم تھا کہ مجھے قدم اٹھانا بھی دشوار محسوس ہو رہا تھا۔ بارش لگاتار برس رہی تھی۔ آخر کار گرتے پڑتے میں ریسٹ ہاؤس پہنچ ہی گیا۔ ریسٹ ہاؤس کا گیٹ چوپٹ کھلا ہوا تھا اور ایک سایہ اسے بند کر رہا تھا۔ طوفانی بارش کے باعث وہ میرے قدموں کی آواز کو سن نہیں سکا اور میں نے اسے کمر کی طرف سے پکڑ لیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپا اور مجھے پیچھے کی طرف دھکیلتے ہوئے بھاگنے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے جسم میں اتنی طاقت نہیں تھی کہ میں اسے روک سکتا۔ مجھے بارش نے ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ اس لیے میں کیچڑ کے بل زمین پر گر گیا۔ وہ میرے قریب سے ہو کر آگے بڑھا تو میں نے اس کی داہنی ٹانگ پکڑ لی۔ اس نے زور سے جھٹکا دیا تو اس کا بوٹ میرے ہاتھوں میں آگیا اور وہ ترائی کی طرف بھاگتا چلا گیا۔ جب تک میں اٹھ کر کھڑا ہوا وہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ میں نے بوٹ کی طرف دیکھا۔ اس کے اوپر پلاسٹک کا لفافہ چڑھا ہوا تھا۔ لفافے کے اندر کپڑا بھی ٹھنسا تھا تاکہ زمین پر قدموں کے نشان نہ بننے پائیں۔ یہی وجہ تھی کہ مجھے اس کے نشان نہیں ملے تھے۔ میں ریسٹ ہاؤس کے اندر آگیا۔ لالٹین کی روشنی میں میں نے لفافے کا جائزہ لیا۔ وہ جوتا نہیں بلکہ دیسی ساخت کا کھسا تھا۔ جیسے عام دیہاتی استعمال کرتے تھے۔ میرے خیال میں گڑوے کا کوئی دیہاتی شرارت کر رہا تھا۔ میں نے کھسے کو چارپائی کے نیچے رکھ دیا اور خود کمرے میں آگیا۔ فلورا کمرے میں گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے اٹھانا مناسب خیال نہیں کیا اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد اس کے قریب سونے کے لیے لیٹ گیا۔

صبح آنکھ کچھ تاخیر سے کھلی۔ میرا جسم پانی میں بھیگنے کی وجہ سے ٹوٹ رہا تھا۔ سر میں بھی ہلکا درد ہو رہا تھا۔ میں نے ناشتے کے بعد گولی کھائی اور چارپائی کی طرف آگیا مگر......" انکل جون چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے۔ جیسے تجسس کو بڑھانے کے لیے جان بوجھ کر ایسا کر رہے ہوں۔

فاضل حسین نے بے قراری کے عالم میں پوچھا۔ "آپ خاموش کیوں ہو گئے ہیں کیا جوتا وہاں نہیں تھا؟"

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ہاں...... پلاسٹک والا لفافہ بھی غائب تھا۔ میں نے تمام ریسٹ ہاؤس چھان مارا گیٹ اندر سے لاک تھا۔ جو بھی وہاں آیا تھا وہ دیوار کو پھلانگ کر آیا تھا۔ میں نے قدموں کے نشان ڈھونڈے وہ وہاں نہیں تھے اور اگر تھے تو بارش کے پانی کی وجہ سے دھل گئے تھے۔ میں آگے چلتا ہوا اس جگہ تک آگیا جہاں میں نے فرار ہونے والے سائے کو پکڑنے کی ناکام کوشش کی تھی۔ یہاں کھینچا تانی کے معدوم ہوتے ہوئے نشان موجود تھے لیکن واضح نہیں تھے۔ میں آگے بڑھنے لگا۔ کیچڑ بہت زیادہ تھا۔ چلنے میں دشواری پیش آرہی تھی۔ ترائی میں اترتے ہوئے میں کئی دفعہ گرتے گرتے بچا لیکن میں نے ہمت نہیں ہاری اور نیچے اترتا گیا۔ جہاں ترائی کا اختتام ہوتا تھا وہاں درختوں کا سلسلہ دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس سلسلے کی زمین گھنے درختوں اور ان کے چھدرے پتوں کی وجہ سے پانی کی تباہ کاریوں سے محفوظ تھی۔ وہاں کچھ آگے جا کر پُراسرار شخص کے قدموں کے نشان موجود تھے۔ میں نے نشانات کا معائنہ کیا۔ پاؤں کا نشان نہ زیادہ چھوٹا تھا اور نہ ہی زیادہ بڑا تھا۔ ان کا رخ درختوں کے سلسلے سے باہر گڑوے کی طرف تھا۔ مجھے یقین ہو گیا کہ وہ جو بھی تھا اس کی رہائش گاؤں کے اندر تھی۔ درختوں کے سلسلے سے نکلتے ہی پاؤں کے نشان ختم ہو گئے لیکن میرے لیے اتنے ہی کافی تھے۔ میں گڑوے آگیا۔" انکل جون ایک دفعہ پھر خاموش ہو گئے۔ فاضل حسین نے تیکھی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھا۔ وہ سنجیدہ لہجے میں بولے۔

"تم جانتے ہو کہ ہر گاؤں کا ایک کھوجی ہوتا ہے۔ وہ پاؤں کے نشانات کے ذریعے مجرم تک بآسانی پہنچ جاتا ہے اس لیے اسے تمام گاؤں والوں کے پاؤں کے نشانات کے متعلق معلوم ہوتا ہے۔ گڑوے کے کھوجی کا نام عبدالرحیم تھا۔ میں اسے لے کر درختوں کی طرف آگیا۔ اس نے قدموں کا معائنہ کیا اور داڑھی کھجاتے ہوئے بولا۔ "جس شخص کے

قدموں کے نشان ہیں اس کا تعلق گڑودے سے نہیں ہے۔ وہ باہر کا آدمی ہے۔"
میں نے کھوجی سے پوچھا۔ "کیا تم اس کا کھوج لگا سکتے ہو۔ وہ بارش میں دو دفعہ ریسٹ ہاؤس کی طرف آیا ہے۔"
کھوجی بولا۔ "اگر پاؤں کے نشان زمین پر ہیں تو میں باآسانی اس تک پہنچ سکتا ہوں لیکن مجھے نہیں لگتا کہ طوفانی بارش نے زمین پر چھوڑے ہوں۔ اس کے باوجود میں کوشش کروں گا۔"

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اس کو لے کر ریسٹ ہاؤس میں آ گیا۔ وہ اردگرد کی زمین پر پاؤں کے نشان تلاش کرنے لگا اور میں فلورا کے پاس آ گیا۔ میں نے اسے حالات کے متعلق بتایا۔ وہ پریشان ہوگئی اور اس نے مجھے واپس انگلستان چلنے کا مشورہ دیا لیکن میں آدم خور کو ختم کیے بغیر واپس نہیں جانا چاہتا تھا اس لیے جواب دیے بغیر غسل خانے میں آ گیا۔ ڈسپرین کی گولی نے مجھے ہلکا پھلکا کر دیا تھا لیکن اب مجھے نیم گرم پانی کے ساتھ غسل کی طلب محسوس ہو رہی تھی۔ غسل سے فارغ ہونے کے بعد جب میں باہر نکلا۔ تو کھوجی میرا منتظر تھا۔

اس نے مجھے بتایا۔ "صاحب مجھے دو تین جگہوں پر قدموں کے نشان ملے ہیں اور ان کے مطابق وہ گڑودے کی طرف گیا ہے۔ میں نے گاؤں کے مخالف جانب اور اطراف کی زمین پر قدموں کے نشان تلاش کیے لیکن وہاں نشان نہیں تھے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ گاؤں میں داخل ہونے کے بعد باہر نہیں نکلا اور اگر نکلا تو بارش نے نشان مٹا دیئے۔"
میں نے پوچھا۔ "گڑودے سے آگے آبادی کہاں تک پھیلی ہے اور قریبی گاؤں کون سا ہے۔"
اس نے بتایا۔ "تقریباً آٹھ دس کوس دور پریم گڑھ ہے۔ اس سے آگے متعدد چھوٹے بڑے گاؤں کا لامتناہی سلسلہ ہے لیکن خراب موسم کی وجہ سے وہ وہاں تک پیدل نہیں جا سکتا۔ میں کھوجی کو لے کر گڑودے آ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ گاؤں کے کسی گھر میں چھپا ہوا تھا۔ میں نے تمام حالات سے گاؤں والوں کو مطلع کیا اور کچھ دیر کے لیے انہیں گھروں کو خالی کرنے کے لیے کہا۔ گاؤں والوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور گھر خالی کر دیئے۔ میں نے کھوجی کو لے کر تمام مکان کھنگال لیے لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی پھر کچھ خیال آنے پر میں نے کھوجی کو بتایا کہ وہ شخص کھسہ پہنے ہوئے تھا اور اس کا پاؤں درمیانے سائز کا تھا۔ اگر اسے گاؤں میں کسی کا کھسہ پہننا پڑے تو وہ کس شخص کا پہنے گا۔ کھوجی سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے پانچ ایسے آدمیوں کے نام بتائے جن کے پاؤں درختوں کے جھنڈ میں ملنے والے نشان کے مطابق تھے۔ میں نے ان پانچوں کو ہجوم میں سے باہر آنے کے لیے کہا۔ وہ باہر آ گئے۔ ان کے چہروں پر پریشانی کے تاثرات تھے۔ میں نے ان سے کھسے کے بارے میں پوچھا۔ تو ان میں سے ایک نے بتایا کہ دو دن قبل اس کا کھسہ کھیتوں میں کام کرنے کے دوران چوری ہو گیا تھا۔ تاحال اس کے متعلق معلوم نہیں ہوا۔ میں نے گاؤں والوں کو گھر جانے کے لیے کہا اور خود ریسٹ ہاؤس میں آ گیا۔ فلورا کو تمام واقعات بتانے کے بعد میں نے رات کو ریسٹ ہاؤس کے گرد پہرہ لگانے کے متعلق مشورہ طلب کیا۔"

فلورا نے پوچھا۔ "تم پہرے کے لیے آدمی کہاں سے لاؤ گے۔ گاؤں والے اس کے لیے کبھی بھی تیار نہیں ہوں گے۔ وہ جو کوئی بھی ہے۔ اسے ریسٹ ہاؤس سے مطلب ہے۔ اب تک اس نے ہمیں نقصان پہنچانے کی کوشش نہیں کی۔ میری مانو تو اس کی طرف توجہ دینے کے بجائے آدم خور کو ہلاک کرنے پر توجہ دو۔"
وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ ہم گڑودے کے آدم خور کے شکار کے لیے آئے تھے اور ہم نے پُراسرار سائے والے معاملے میں پڑ کر اسے نظر انداز کر دیا تھا لیکن میں اب فلورا کو ریسٹ ہاؤس میں تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا اس لیے میں نے اسے اپنے ساتھ مچان پر لے جانے کا تہیہ کیا اور مطمئن ہو کر کمرے سے باہر آ گیا۔

میں یہ بتانا بھول گیا کہ میں نے چند آدمیوں کو گڑودے بلانے کے لیے خط لکھا تھا۔ وہ اسی شام گاؤں پہنچ گئے۔ میں نے انہیں دو تالابوں کے کنارے درختوں پر بٹھانے کا فیصلہ کیا تھا۔ یہ سب آدم خور کو ترغیب دینے کا بہانہ تھا تاکہ وہ اپنی پیاس بجھانے کے لیے اس تالاب کا رخ کرے۔ جس کے کنارے میں اور فلورا مچان پر اس کے منتظر تھے۔
فاضل حسین نے بات درمیان میں کاٹتے ہوئے پوچھا۔ "فلورا کو مچان پر لے جانے کی کیا ضرورت تھی۔ آپ کے آدمی شہر سے آ گئے تھے۔ وہ اس کی بخوبی حفاظت کر سکتے تھے۔"

انکل جون نے جواب دیا۔ "بیشک وہ ایسا کر سکتے تھے لیکن فلورا کا اصرار تھا اور میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا۔ اس میں کوئی قباحت بھی نہیں تھی۔ وہ میرے ساتھ مچان پر کئی دفعہ بیٹھ چکی تھی اور یہ اس کے لیے کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔"



فاضل حسین نے فلورا کو بات پر آمادہ کرنے کے لیے کہا۔
"میرے خیال میں فلورا متحرک سائے سے خوفزدہ ہو گئی تھی۔ اس لیے اس نے مچان پر بیٹھنے کے لیے اصرار کیا۔"
انکل جون انکار میں سر ہلاتے ہوئے بولے۔ "نہیں..... در پردہ بات کچھ اور تھی۔ متحرک سائے کا وجود میری آپ بیتی میں بے معنی تھا۔ اصل حقیقت اس وقت سامنے آئی جب اس کے سامنے آنے سے مجھے کوئی فائدہ حاصل ہونے والا نہیں تھا۔ ہم نے شام ہونے سے قبل تیاریاں شروع کر دیں۔ مجھے یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ آدم خور بھوکا ہونے کے باعث درخت پر بیٹھے میرے آدمیوں پر بھی حملہ آور ہو سکتا تھا۔ ان میں زیادہ ور تجربے کار تھے۔ سر شام ہم نے دونوں تالابوں کے کنارے آگ کے الاؤ روشن کر دیئے اور میرے آدمی درختوں پر بیٹھ گئے۔ میں نے انہیں بتایا کہ آگ بجھنے کی صورت میں ان میں سے ایک نیچے اتر کر الاؤ کو روشن کر دے جبکہ مچان پر بیٹھا ہوا شخص جس کے پاس رائفل تھی۔ وہ اسے تحفظ فراہم کرے۔ یہ ہو سکتا تھا کہ آدم خور ان پر نگاہ رکھے ہو اور مچان سے اترنے والے آدمی کو دبوچ لے۔ انہیں ہدایات دینے کے بعد میں فلورا کے ہمراہ تیسرے تالاب پر بنی ہوئی مچان کی طرف آ گیا۔ پچھلی چند راتوں کی نسبت اس رات مطلع صاف تھا لیکن ماحول پر حبس طاری تھا۔ میں نے مچان پر گدے بچھانے کا اہتمام کر دیا تھا تاکہ فلورا پاؤں پسار کر آرام سے لیٹ سکے۔ رات سست روی کے ساتھ آگے کا سفر طے کرنے لگی۔ پانی کے تالاب پر جانوروں کا میلہ لگا ہوا تھا۔ وہ وقتاً فوقتاً پیاس بجھانے کی نیت سے تالاب پر آتے اور اس نعمت سے مستفید ہونے کے بعد واپس جنگل کی طرف چلے جاتے۔ فلورا رات بارہ بجے تک جاگتی رہی۔ اس کے بعد ماحول سے لاتعلق ہو کر نیند کی آغوش میں چلی گئی۔"
انکل جون چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئے پھر فاضل حسین کی طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ "تمہیں معلوم ہے کہ جانور چاہے شیر ہو یا پھر ہرن جنگل کی تبدیلی محسوس کر کے وہاں سے دور رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ ان کے حواس ہم انسانوں کی نسبت دس گنا تیز ہوتے ہیں۔ اگر آپ مچان پر خوشبو لگا کر بیٹھے ہوں یا پھر سگریٹ نوشی کر رہے ہوں تو اس بات کو بھول جائیے کہ جانور مچان کے قریب آئے گا لیکن حیرت انگیز طور پر اس رات فلورا نے خراٹے نہیں لیے۔ وہ پاؤں پسارے لیٹی رہی۔ اس کی آنکھیں بند تھیں لیکن میں نہیں جانتا تھا کہ وہ جاگ رہی ہے اور آنکھیں بند کیے اپنے ہدف کی غفلت کی منتظر ہے۔"
فاضل حسین نے حیرت بھری نگاہوں سے انکل جون کی طرف دیکھا۔
وہ اسی رو میں بولے۔ "میری ایک بات کو اپنے پلے سے باندھ لو۔ کبھی کسی پر اعتبار نہیں کرنا۔ اب چاہے وہ تمہاری بیوی ہی کیوں نہ ہو۔ اسے بھی سخت نگاہوں سے پرکھنا۔ مجھ سے یہاں غلطی ہوگئی۔ اور میں اندھا اعتماد کرنے کی بدولت مار کھا گیا۔ اگلی غلطی مجھ سے یہ ہوئی کہ میں نے مچان پر بیٹھ کر آدم خور کا انتظار کرتے ہوئے گڑودے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ آدم خور نے میری بے پروائی کا پورا فائدہ اٹھاتے ہوئے رات کو ایک گھر میں گھس کر چارپائیوں کے درمیان میں سے ایک نوجوان کو اٹھایا اور جنگل میں لے گیا۔ اس نے نہایت اطمینان کے ساتھ شکم سیر ہونے کے بعد کچھ دیر وہاں آرام کیا۔ پھر پانی پینے کے لیے قریبی تالاب کی طرف آ گیا لیکن وہاں آگ کا الاؤ روشن دیکھ کر وہ بدحواس ہو گیا اور دوسرے تالاب کی طرف چلا گیا۔ دوسرے تالاب پر بھی آگ روشن تھی۔ مجبوراً اسے تیسرے تالاب کا رخ کرنا پڑا۔ جہاں میں اور فلورا اس کے منتظر تھے۔ غالباً اس وقت رات کے تین بجنے والے تھے۔ فلورا میرے قریب لیٹی ہوئی تھی۔ میرے حساس کانوں نے آدم خور کے پاؤں کی آواز کو بخوبی سن لیا۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ وہ خشک گھاس پر بھی اس احتیاط سے پاؤں رکھتا ہے کہ تنکوں کے چرچرانے کی آواز بھی سنائی نہیں دیتی لیکن میرے کان معمولی سی آہٹ کو سننے کے لیے بے چین تھے اور میں نے خاص طور پر دماغ کی تمام صلاحیتوں کو ماحول پر مرتکز کر دیا تھا۔ درختوں کے جھنڈ سے نکلتے ہوئے وہ جھلکے سے نظر آیا۔ یہ تالاب کے گرد میدان صاف دیکھ کر خوشی کا اظہار تھا۔ وہ بے دھڑک ہو کر پانی کی طرف آیا اور مچان کے بالکل نیچے بیٹھ کر پانی پینے لگا۔ میں نے بے آہٹ اپنی رائفل کو سیدھا کیا اور اس کے سر کا نشانہ لیا لیکن چند شاخیں اور پتے درمیان میں آ رہے تھے۔ میں نے اور بہت سے معاملات کی طرح انہیں بھی نظر انداز کر دیا تھا۔ اس رات میرے ستارے گردش میں تھے۔ اب اگر میں ان شاخوں کو اپنی جگہ سے ہٹانے کی کوشش کرتا تو آدم خور متوجہ ہو جاتا اور انہیں ہٹائے بغیر نشانہ لینے پر مجھے دشواری پیش آ رہی تھی۔ میں اسی کشمکش میں مبتلا تھا کہ مجھے مچان کے چرچرانے کی آواز سنائی دی۔ آدم خور تڑپ کر مڑا۔ اس نے خونخوار نگاہوں سے مچان کی طرف دیکھا۔ اب وہ میری رائفل کی زد میں تھا۔ میں نے گھوڑے پر انگلی رکھ دی۔ فلورا پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھی۔ مچان ایک دفعہ پھر چرچرائی۔ یہ مچان لکڑی کے تختوں سے نہیں بنائی گئی تھی بلکہ چارپائی کو درخت کے تنے پر رکھ کر

رسیوں سے باندھ دیا گیا تھا۔ حالانکہ چارپائی پر موٹی دری بھی بچھائی گئی تھی لیکن اس کے باوجود بھی ہلکی سی حرکت کے باعث چرچراتی تھی۔ آدم خور درخت کے نیچے آکر کھڑا ہو گیا۔ وہ حیرت بھری نگاہوں سے درخت کی شاخوں کے درمیان پھنسی ہوئی چارپائی کو دیکھ رہا تھا۔ میں اسے بہ آسانی گولی مار کر ہلاک کرسکتا تھا لیکن مجھے فلورا نے حیرت زدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ وہ کسی چڑیل کی مانند میرے پیچھے کھڑی تھی۔ اس کے سنہرے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور آنکھوں میں نفرت کا سمندر موجزن تھا۔ پھر وہ کسی شیرنی کی طرح مجھ پر جھپٹی۔ میں نے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن مچان میں جگہ کم ہونے کی وجہ سے زیادہ پیچھے نہ جا سکا۔ وہ مجھے نیچے دھکیلنے کی کوششیں کر رہی تھی۔ میں نے اسے دونوں ہاتھوں کی گرفت میں جکڑ لیا لیکن جگہ کم ہونے کی وجہ سے اپنا توازن برقرار نہیں رکھ سکا۔ اس کا جسم مجھ پر حاوی ہونے لگا اور مضبوطی سے جمے ہوئے میرے قدم اچانک اکھڑ گئے۔ میں الٹ کر سر کے بل نیچے گرا۔ فلورا میرے ساتھ تھی اور تالاب کے کنارے کھڑا آدم خور ہم دونوں کا منتظر تھا۔ ہرچند کہ وہ پیٹ بھر کر تالاب کی طرف آیا تھا لیکن دخل در معقولات کی وجہ سے نہایت مشتعل ہو رہا تھا۔ ہم دونوں کے نیچے گرتے ہی اس نے فلورا کو نظرانداز کرتے ہوئے مجھے گردن کے پاس سے پکڑا اور دو ہی جھٹکوں میں میرا خاتمہ کر دیا۔ فلورا چیختے چلاتے ہوئے درختوں کے جھنڈ کی طرف بھاگی۔ آدم خور اس کے پیچھے لپکا۔ اسے ہلاک کرنے میں اسے کسی حد تک دشواری کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ درختوں کے درمیان روپوش ہو گئی تھی۔ تاہم اس کے جسم کی خوشبو آدم خور کو اس کی پوشیدگی والی جگہ کا پتا دے رہی تھی اس لیے اس نے تھوڑی سی تگ و دو کے بعد اسے بھی ہلاک کر دیا۔"

فاضل حسین حیرت کے مارے چلاتے ہوئے بولا۔ "اگر اس نے تم دونوں کو ہلاک کر دیا... تو کیا میرے سامنے تم دونوں کے بھوت بیٹھے ہوئے ہیں یا پھر تم ہوا پر مشتمل روح کی صورت اختیار کر چکے ہو۔ بند کرو اپنی بکواس کو اور یہاں آنے کا مقصد بیان کرو۔"

انکل جون اس کی بات کی طرف توجہ دیئے بغیر افسردہ لہجے میں بولے۔ "آدم خور نے ہم دونوں کو ہلاک کر دیا اور ہمارے آدمیوں نے لاش کے بچے کھچے ٹکڑوں کو ریسٹ ہاؤس کے پیچھے بنے قبرستان میں دفن کر دیا لیکن متحرک سایہ ریسٹ ہاؤس کے گرد منڈلاتا رہا اور پھر واپس انگلستان چلا گیا۔ دراصل یہ کوئی پُراسرار معاملہ نہیں تھا۔ رقابت اور محبت کا عام سا کھیل تھا۔ فلورا اور میرا چھوٹا بھائی ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن میرے ہوتے ہوئے ان کی محبت پنپنے نہیں پا رہی تھی اس لیے ان دونوں نے مجھے ختم کرنے کی تدابیر پر غور کرنا شروع کیا۔ انہی دنوں مجھے انگلستان سے ہندوستان بلا لیا گیا۔ میرا چھوٹا بھائی میرے پیچھے گڑوے آ گیا۔ وہ ریسٹ ہاؤس کے پیچھے بنے ہوئے اسٹور میں چھپا ہوا تھا اور مجھے غلط فہمی میں مبتلا کرنے کے لیے اس نے گاؤں سے کھسا چوری کیا۔ پھر گڑوے کے گرد چکر لگا کر واپس اسٹور میں آ گیا۔"

فاضل حسین اپنی حیرت پر کافی حد تک قابو پا چکا تھا۔ انکل جون کے خاموش ہونے پر اس نے پوچھا۔ "آپ کا چھوٹا بھائی زندہ ہے۔ تو پھر باقی کے معاملات کے متعلق آپ کو کیسے معلوم ہوا۔"

انکل جون نے بتایا۔ "تمام کیے دھرے کی قصور وار میرے ساتھ موجود ہے۔ اس نے مجھے سب کچھ بتا دیا۔ اب میں تم سے التجا کرتا ہوں کہ ان تمام واقعات کو تحریری صورت میں شائع کرنے کے بعد حکومت سے اپیل کرو کہ وہ میرے چھوٹے بھائی کو گرفتار کر لے۔ میں امید کرتا ہوں کہ تم ایک مرے ہوئے شخص کی التجا پر ضرور غور کرو گے۔" پھر وہ دونوں اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ فاضل حسین بھی باہر آ گیا سپیدۂ سحر نمودار ہونے لگا تھا۔ وہ دونوں گڑوے کے قبرستان میں داخل ہو گئے تھے۔ چند لمحے انہیں بے یقینی کے عالم میں دیکھتے رہنے کے بعد وہ واپس کمرے میں آ گیا۔ واقعات ناقابل یقین تھے لیکن جو بھی ہوا تھا۔ اس کے سامنے ہوا تھا۔ دوسرے دن اس نے گڑوے والوں سے انکل جون کے متعلق پوچھا۔ انہوں نے وہی تفصیل دہرا دی۔ جو گزشتہ رات انکل جون نے بیان کی تھی۔ اس سے اگلے دن فاضل حسین شہر آ گیا۔ تاہم حکومت کو اپیل کرنے کی نوبت نہ آ سکی۔ شہر آنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ انکل جون کے چھوٹے بھائی نے انگلستان میں خودکشی کر لی ہے اور اس کی لاش کو دفنانے کے لیے ہندوستان لایا جا رہا تھا۔ اس نے مرنے سے پہلے وصیت کی تھی کہ اسے گڑوے ریسٹ ہاؤس کے پیچھے واقع قبرستان میں دفن کیا جائے۔ فاضل حسین نے تحریر کو مقامی اخبار والوں کے حوالے کر دیا اور کسی حد تک پس و پیش کرنے کے بعد انہوں نے شائع بھی کر دی، یہ ایک محیر العقول قصہ۔ بمشکل ہی سے کسی کو یقین آئے گا مگر فاضل حسین کا دعویٰ ہے کہ حرف حرف سچا واقعہ ہے۔ قارئین اسے کتنا سراہتے ہیں۔

++

یہ انجمن اور مبین ملک کی شادی تھی۔ شادی بالکل اچانک طے پائی اور بڑی دھوم دھام سے ہو بھی گئی۔ وجہ یہ تھی کہ انجمن کے گھر والے بھی اس شادی کے حق میں تھے۔ اس شادی نے انجمن کی پیشہ وارانہ مصروفیات کے علاوہ اس کی ذہنی اور جذباتی صلاحیتوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ انجمن جو کامیابیوں کے جھولوں پر اونچی اونچی پینگیں بڑھا رہی تھی اس واقعے کے بعد ایسے حالات کا شکار ہو گئی کہ اس کی اداکارانہ صلاحیتوں کو زبردست دھچکا پہنچا۔ یہی وجہ ہے کہ

## فلم نگری

علی سفیان آفاقی

ملتان کے بازارِ حسن سے پاکستان و بیرونِ پاکستان کے فلم بینوں کے دلوں پر راج کرنے کا سفر دشوار کیسے طے ہوا۔ کن مصائب و مشکلات کا سامنا ہوا۔ کس طرح یہ منزلیں سر ہوئیں۔ یہ تمام باتیں جب علی سفیان آفاقی کے قلم سے نکلیں تو قارئین کا مسحور ہو جانا یقینی ہے۔

**فلم بینوں کے لیے تحفۂ خاص**

**دوسرا حصہ**
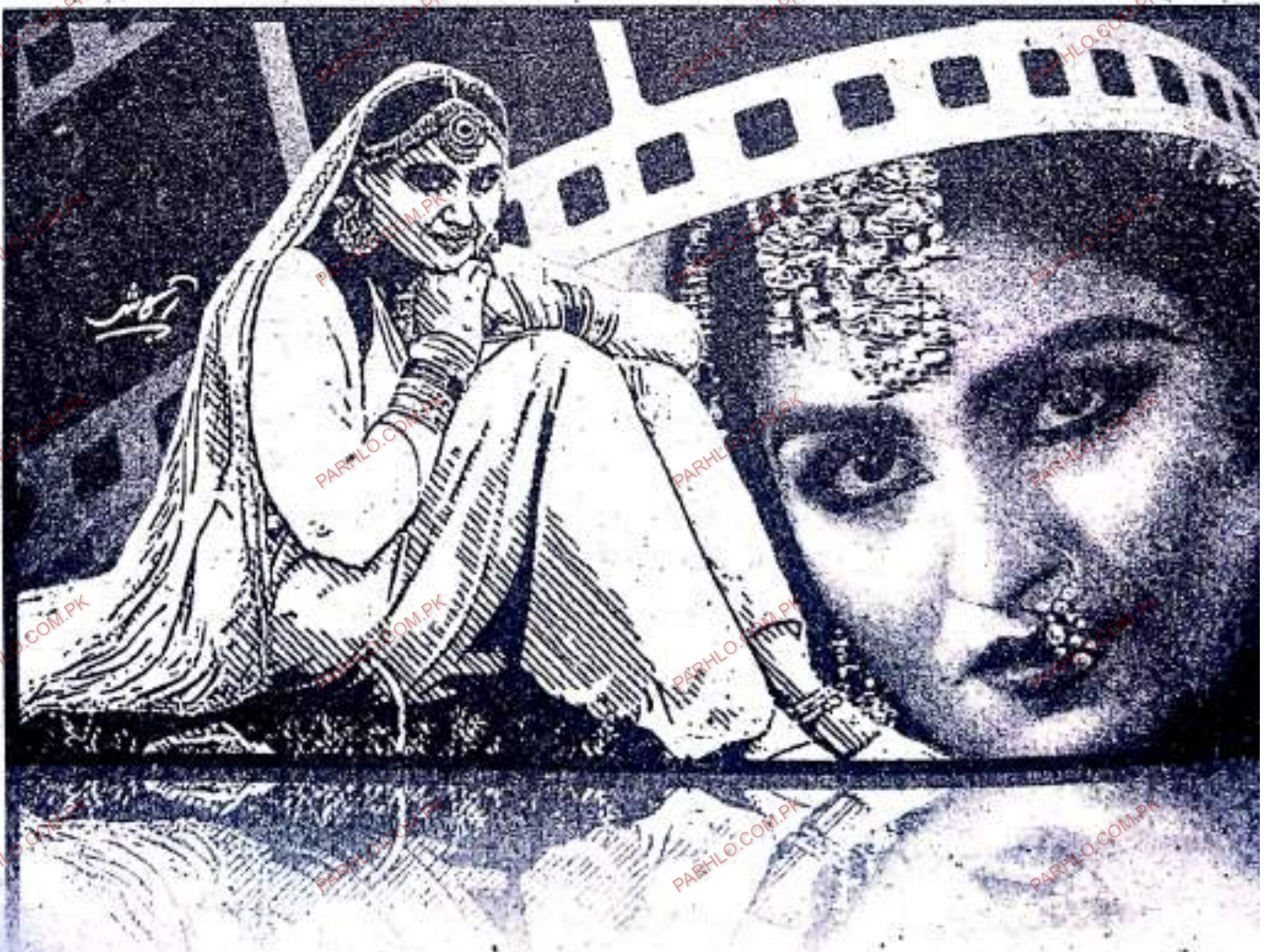
اس کی فلمی مصروفیات 1988ء میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ اس سال انجمن کی ریلیز ہونے والی فلمیں حسب ذیل ہیں۔ شاکا، توری، ہتھروالی، ڈسکو لیونٹی (پشتو) گویا اس سال انجمن کی صرف چار فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ ایک اداکارہ کے انتہائی عروج کے زمانے میں جب کہ ہر طرف اس کا طوطی بول رہا ہو اگر ایک سال میں اس کی ریلیز ہونے والی فلموں کی تعداد فقط چار تک محدود ہو جائے تو صاف ظاہر ہے کہ

کوئی معشوق ہے اس پردۂ زنگاری میں!

یہ کوئی راز نہیں کہ انجمن کے کیریئر کو یہ دھچکا اس کی شادی کے بعد پہنچا تھا اور وہ پے در پے ایسے واقعات کا نشانہ بن گئی کہ ایک موقع پر تو اس کی اداکاری کے بھی لالے پڑ گئے، مگر شکر ہے کہ یہ حالات ایک یا سوا سال سے زیادہ قائم نہیں رہے اور انجمن نے اپنے مسائل کو حل کر کے دوبارہ فلمی مصروفیات کا آغاز کر دیا۔

1989ء میں انجمن کی جو فلمیں نمائش پذیر ہوئیں ان کے نام یہ ہیں۔

سکندرہ، سپر گرل، قاتل حسینہ، سرفروش، مولا سائیں، آخری قتل، کالکا، زبردست، بلاول، بس اللہ رکھی، اچھو 302، چنگیز، ننگی تلوار، مزدور، یہ وہ فلمیں ہیں جو انجمن کے دوسرے دور کی نمائندگی کرتی ہیں۔ شادی اور بچے کی پیدائش کے علاوہ بھی مسائل نے اسے موٹا اور بدنما کر دیا تھا مگر اس کی مسکراہٹ کی دلکشی، دل میں اتر جانے والی آنکھوں کی کشش اور سیکس اپیل حیرت انگیز حد تک باقی تھی۔ اگرچہ اس کا جسم نشیب و فراز اور نسوانی کشش سے محروم ہو چکا تھا مگر اس کے باوجود اس کا چہرہ اور سراپا ابھی تک پرکشش اور خواہش انگیز تھا۔ یہ وہ دور تھا جب انجمن کی حقیقی کشش فلم سازوں پر آشکارا ہوئی۔ اس عالم میں بھی وہ چھریرے جسم کی مالک نیلی، متناسب بدن رکھنے والی نادرہ، اور سحر انگیز شخصیت کی مالک بابرہ شریف سے زیادہ مقبول و محبوب تھی۔ بہت سے لوگ اسے دور جدید کا ایک فلمی معجزہ بھی قرار دیتے ہیں۔ ان فلموں میں بلاول، زبردست، کالکا، سپر گرل اور قاتل حسینہ کامیاب فلمیں قرار دی جا سکتی ہیں۔ ننگی تلوار کے سوا سبھی فلموں میں اس کا ہیرو سلطان راہی تھا۔ فلم ساز جانتے تھے کہ ان دونوں کی جوڑی کو دیکھنے کے لیے فلم بین ترس گئے ہیں اور ان کا اندازہ درست بھی تھا۔ ننگی تلوار میں انجمن کا ہیرو جاوید شیخ تھا۔

اس دوران میں ایک اور نمایاں تبدیلی بھی ہوئی جس نے سب کو ششدر کر دیا۔ انجمن کا ایک ریکارڈ یہ بھی رہا ہے کہ اس نے نیم عریاں اور عریاں لباس کا سہارا کبھی نہیں لیا تھا۔ چست لاچا اور کرتا اس کا لباس ضرور رہا تھا اور بازوؤں اور پنڈلیوں کی نمائش بھی کوئی غیر معمولی بات نہیں تھی۔ بلکہ اسے تو دوسری ہیروئنوں کے لباسوں کے مقابلوں میں بے ضرر کہا جا سکتا تھا مگر جب انجمن نے ایک مختصر وقفے کے بعد دوبارہ اسکرین پر جلوہ فرمائی کی تو ایک بجھا بجھا سا ہوا اور انجمن کا ایک نیا روپ فلم بینوں کی نگاہوں کے سامنے آیا۔ فلم "بلاول" کے لیے بھیگے ہوئے لباس میں ایک گانے کی فلم بندی کی جا رہی تھی۔ انتظامات مکمل تھے اور کچھ دیر بعد انجمن کو بارش میں شرابور ہو کر رقص کرتے ہوئے دیوانہ وار گانا گانا تھا۔ انجمن کا لباس چست کرتے اور لاچے پر مشتمل تھا جس میں اس کے جسم کا انگ انگ نظر آ رہا تھا۔ اس لباس کو کرتے کے لیے فلم ساز نے اپنے گھر سے اصلی سونے اور ہیرے کے بٹن منگائے تھے۔ انجمن کو یہ بٹن بہت بھلے لگے۔ کہاں سے بنوائے؟ کیا قیمت ہے؟ اس نے سوالات کی بھرمار کر دی۔

فلم ساز کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے یہ تجویز پیش کی کہ اگر انجمن اپنے کرتے کے اوپر والے بٹن کھول کر رقص کرے تو شوٹنگ کے بعد یہ قیمتی بٹن اس کی نذر کر دیے جائیں گے۔

ایک لمحے کے لیے تو انجمن ساکت رہ گئی۔ پھر ہیرے کے بٹنوں کو دیکھا اور پھر اپنے سراپا پر نظر ڈالی۔ اسے بخوبی احساس تھا کہ وہ جسمانی کشش اور تناسب کھوتی جا رہی ہے اور یہ ترکیب اس کی مقبولیت کو کچھ عرصے کے لیے سہارا دینے کا سبب بن سکتی ہے۔ لہٰذا اس نے معمولی سی ہچکچاہٹ کے بعد منظوری کا اظہار کر دیا۔

کرتے کے بالائی بٹن کھول دیے گئے اور فلم بینوں نے پہلی بار وہ نظارہ دیکھا جو اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس گانے اور رقص کی فلم بندی کافی دن تک جاری رہی۔ انجمن پانی میں بھیگتی رہی، گاتی رہی اور رقص فرماتی رہی اور گانے فلمانے والوں کے دلوں کی دھڑکن تیز سے تیز تر ہوتی رہی۔

"بلاول" جب نمائش کے لیے پیش ہوئی تو یہ خبر پہلے ہی سب جگہ پھیل چکی تھی۔ تماشائی انجمن کے جسم کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ٹوٹ [illegible]



ہو گئے۔ "بلاول" کا بزنس ریکارڈ توڑ ثابت ہوا۔ سینما والوں نے منہ مانگی قیمت پر ٹکٹ فروخت کیے اور فلم ساز پر دولت کی بارش ہونے لگی۔

جب حکام سے یہ شکایت کی گئی کہ "بلاول" میں قابل اعتراض مناظر بھی دکھائے جا رہے ہیں تو فلم کی نمائش روک دی گئی مگر ہر طرف "بلاول" کا چرچا ہو چکا تھا اور انجمن نے ایک بار پھر میدان مار لیا تھا۔ اس رقص کے بعد دوسرے فلم سازوں نے بھی بارش میں رقص فلمانے پر توجہ دی اور دیگر ہیروئنیں بھی انجمن کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں اتر آئیں۔ اکثر فلموں میں ہیروئن کا پانی میں بھیگا ہوا ہیجان خیز جسم نظر آنے لگا۔ بابرہ شریف کی فلم "بارش" اور کویتا کی فلم "پانی" میں ان دونوں نے بھی خوب جی بھر کر پانی میں بھیگنے، زمین پر لوٹیں لگانے اور نیم عریاں لباس میں اپنا جسم جھلکانے کا مظاہرہ کیا۔ فلم "بارش" میں تو بابرہ شریف نے حد ہی کر دی۔ بابرہ شریف کا تین چوتھائی گورا بدن تماشائیوں کی نگاہوں کے سامنے دمکتا تھا۔ لباس اس نوعیت کا تھا اور بابرہ کے رقص کا انداز ایسا تھا کہ باقی ایک چوتھائی بدن بھی دیکھنے والوں کی چشم تصور سے پوشیدہ نہیں تھا۔ حیران کن بات یہ ہے کہ سنسر نے بھی ان ہوشربا مناظر سے چشم پوشی کرنے کو مناسب جانا اور پھر تو ہر طرف ایک طوفان سا برپا ہو گیا۔ ہر فلم میں نہانے کا منظر اور بھیگتے ہوئے ہیروئن کا رقص ایک لازمی آئٹم بن گیا اور بارش کے مناظر کے بہانے جسموں کی نمائش کا مقابلہ زور و شور سے شروع ہو گیا۔ ہر ہیروئن کی کوشش تھی کہ دوسروں کو اس مقابلے میں پیچھے چھوڑ دے۔ آخر جب اخبارات نے شور مچایا تو فلم سنسر بورڈ کو بھی ہوش آیا اور انہوں نے اس سلسلے میں ایک حد فاصل مقرر کر دی۔ فلم "بلاول" کو بھی کچھ عرصے بعد کاٹ چھانٹ کے بعد نمائش کی اجازت مل گئی مگر اس فلم کا ویڈیو تو موجود ہی تھا اور انجمن کے رقص کی پبلسٹی بھی حد سے زیادہ ہو چکی تھی اس لیے ہر شخص انجمن کے جسم کی جھلک دیکھنے کے لیے بے تاب تھا۔ اس مقابلہ آرائی میں بھی انجمن دوسری تمام ہیروئنوں پر بازی لے گئی۔ شاید اس کا سبب یہ بھی تھا کہ دوسری ہیروئنیں تو بہانے بہانے تماشائیوں کو وقتاً فوقتاً اپنے جسم کی جھلکیاں دکھاتی رہتی تھیں مگر انجمن کے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ اس رقص اور گانے کے ذریعے انجمن نے نہ صرف اپنی دوسری ہم عصر ہیروئنوں کو پیچھے چھوڑ دیا بلکہ [illegible] میں بھی اضافہ کر لیا

اور ہیرے کے قیمتی بٹن جو حاصل کیے اسے بونس سمجھیے۔

بعد کے سالوں میں بھی انجمن کی دھوم مچی رہی۔

1990ء کے آغاز میں اس کی اردو فلم "انسانیت کے دشمن" نمائش کے لیے پیش کی گئی۔ ہدایت کار حسنین کی اس فلم میں انجمن کے بالمقابل ندیم نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔ اظہار قاضی، نیلی، ہمایوں قریشی، وغیرہ بھی اس فلم کے اداکاروں میں شامل تھے اور سلطان راہی نے بھی ایک کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم میں انجمن کو ایک نئے انداز کا کردار دیا گیا تھا جو اس نے بہت خوش اسلوبی سے نبھایا۔ آغاز میں یہ ایک ویمپ کا رول تھا مگر فلم کے اگلے حصے میں پہنچ کر یہ ایک ہمدرد کردار بن گیا۔ انجمن نے اس فلم میں بہت اچھا کام کیا اور ماڈرن ملبوسات میں اپنے موٹاپے کے باوجود بہت خوبصورت اور تر و تازہ نظر آئی۔

انجمن کے ساتھ قدرت کی ایک مہربانی یہ ہے کہ اس کا چہرہ ہمیشہ خوش نظر اور پرکشش رہتا ہے۔ اگرچہ موٹاپے نے جسم کے ساتھ اس کے چہرے کو بھی متاثر کیا تھا مگر اس کے نقوش کی تراش خراش، آنکھوں کی طلاوت اور ہونٹوں کی جاں فزا دلکشی میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی تھی اور اس کے پرستاروں کے لیے انجمن کی کشش میں ذرا بھی فرق نہیں آیا تھا۔ "انسانیت کے دشمن" کا کردار اس فلم کا مرکزی کردار تھا مگر ویمپ ٹائپ کا تھا اس لیے اسے قبول کر لینا انجمن کی خود اعتمادی کی دلیل تھی۔ شیر ابلوچ، گوریلا، ڈاکو حسینہ، سلطانہ، کالی چرن، لوہا، انجمن گوجر، سرمایہ، جنگل اور شعلے اسی سال انجمن کی کامیاب اور مقبول فلمیں تھیں۔ حسب معمول ان فلموں میں بھی انجمن اور سلطان راہی کے باہمی تعلقات میں دراڑ پڑ چکی تھی اور اس کا سبب کوئی اور نہیں، خود انجمن کی بہن گوری تھی۔ گوری کو آگے بڑھانے اور فلموں میں نمایاں کردار دلانے میں سلطان راہی کی کوشش کا بھی دخل تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انجمن اور سلطان راہی اتنے عرصے تک ایک دوسرے کے ساتھ کام کرنے کی بنا پر اکتاہٹ اور یکسانیت محسوس کرنے لگے ہوں یا پھر گوری نے انجمن کے ساتھ خاندانی تعلقات خراب ہو جانے کے بعد اسے نیچا دکھانے کے لیے سلطان راہی کو بطور خاص اپنی جانب مائل کرنے کی کوشش کی ہو۔ گوری کے لیے سلطان راہی کی دوستی ہر صورت میں منافع بخش تھی۔ سلطان راہی کے ذریعے وہ فلموں میں اچھے کردار حاصل کر سکتی تھی اور اس کے ساتھ ہی انجمن کو چیلنج بھی کر سکتی تھی۔ گوری نے اس مقصد کو حاصل

کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا۔ وہ سلطان راہی کو اپنی طرف مائل کرنے میں تو کامیاب ہوگئی مگر انجمن کے مقابلے میں کوئی پوزیشن حاصل نہیں کر سکی۔ انجمن اتنے سال گزرنے کے باوجود آج بھی پنجابی فلموں کی فرسٹ لیڈی ہے۔ نئی، نوخیز اور شوخ و شنگ ہیروئنیں بھی اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں اور وہ اپنی جگہ چٹان کی طرح قائم ہے۔

انجمن نے اپنے وزن اور ڈیل ڈول میں حیرت انگیز حد تک کمی کر لی تھی۔ ٹیلی ویژن کی ایک تقریب کے موقع پر جب وہ لوگوں کو نظر آئی تو وہ اس کا سراپا دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ ایک بار پھر متناسب اور اسمارٹ نین کی جانب گامزن ہو چکی تھی۔ پھر جب اسلام آباد میں نیشنل فلم ایوارڈ کی ہنگامہ خیز تقریب منعقد ہوئی اور انجمن اسٹیج پر نمودار ہوئی تو سب کو انتہائی خوشگوار حیرت ہوئی۔ انجمن ماضی کی انجمن کی طرح سروقد اور گداز بدن نظر آ رہی تھی۔ اس کے پرستاروں کی خوشی کی کوئی انتہا نہ تھی۔ فلم ساز اور ہدایت کار بھی خوشی سے پھولے نہیں سما رہے تھے۔ مگر اس کی حریف ایکٹریسوں کے گھروں میں صف ماتم بچھ گئی تھی۔ انجمن موٹاپے کے باوجود ان کے سینے پر مونگ دل رہی تھی۔ اب اسمارٹ اور دبلی ہو کر وہ ان کے لیے پہلے سے بھی زیادہ بڑا چیلنج بن چکی تھی۔ انجمن نے گزشتہ چند ماہ میں کافی وزن کم کر لیا تھا، اس کے چہرے کی دلکشی اور جسم کی کشش انگیزی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔ اداکاری میں وہ پہلے ہی اپنی برتری تسلیم کرا چکی تھی۔ نئی لڑکیوں میں نیلی، مدیحہ شاہ اور نادرہ اس کی حریف بنی جاتی ہیں۔ نیلی اور ریما کے پرستاروں کی تعداد بھی کم نہیں ہے مگر انجمن کے سامنے ان دونوں میں سے کسی کا چراغ نہیں جلتا۔ یہ مانا کہ نوعمری اور تر و تازگی کے اعتبار سے وہ شگفتہ کلیاں ہیں مگر پنجابی فلمیں دیکھنے والے کشیدہ قامت اور بھرے بھرے جسم کی ہیروئنوں کو پسند کرنے کے عادی ہیں۔ جبکہ انجمن کی تمام حریف اداکارائیں اس معاملے میں اس سے کم تر تھیں۔ نیلی کے پاس دراز قد اور متناسب جسم تو تھا اور چہرہ بھی سیکس اپیل سے بھرپور تھا مگر انجمن کے سامنے وہ بہت بے بس نظر آتی تھی۔ وہ ایک چھریرے جسم اور مناسب قد والی لڑکی تھی... مگر ایسی ہیروئنیں اردو فلموں میں تو پسند کی جاتی رہی ہیں، پنجابی فلموں میں وہ تماشائیوں کی ڈیمانڈ پوری کرنے سے قاصر تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ زیبا اور شمیم آرا جیسی اداکارائیں جن کا اردو فلموں میں سکہ چلتا تھا پنجابی فلموں میں مقبول اور کامیاب نہ ہو سکیں۔

انجمن بظاہر ایک مطمئن اور پرسکون زندگی گزار رہی ہے اور ابھی آئندہ کئی سالوں تک اس کی برتری کو کسی جانب سے کوئی خطرہ لاحق نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے کہ وہ گھریلو مسائل پر بھی کسی حد تک قابو پا چکی ہے۔ اس کا یہ اندیشہ بھی باطل ہو چکا ہے کہ نئی ہیروئنیں کہیں اس کی جگہ نہ لے لیں کیونکہ اب تک آنے والی کھیپ میں سے کوئی ایک ہستی بھی ایسی نہیں ہے جو اسے چیلنج کر سکے اور اسے مقبولیت کے تخت سے سبکدوش کر سکے۔ پھر انجمن کو خبروں میں رہنے کا گر بھی آتا ہے۔ جس سے ہماری بہت کم ہیروئنیں واقف ہیں۔ کسی حد تک سلمیٰ آغا بھی اس فن میں ماہر ہیں مگر وہ خود عملی طور پر اسکینڈل بنا کر کے خبر بناتی ہیں جبکہ انجمن محض الفاظ کے گورکھ دھندے کی مدد سے خبریں اور اسکینڈل بنانے پر قادر ہے۔ جب واقعی کوئی بات کا اسکینڈل نہ ہو تو وہ خود بخود ایسا کوئی بہانہ تلاش کر لیتی ہے جس کی بدولت وہ اخبارات کی سرخیوں میں آ جاتی ہے۔ اس کا صحیح معنوں میں اسکینڈل بننے کا بظاہر کوئی امکان نہیں ہے۔ وہ ایک شادی شدہ عورت ہے۔ ہمارے بیشتر مرد اور اداکاروں سے عمر میں بڑی ہے اور عمر میں بھی زیادہ ہے اس لیے نئی لڑکیوں کی طرح اس کے بارے میں اسکینڈل کا بننا آسان کام نہیں ہے۔ مگر انجمن کو کاٹ دار بیانات جاری کر کے خبروں کی زینت بننے کا فن آتا ہے۔ مثلاً ایک بار اس نے بیٹھے بٹھائے یہ بیان جاری کر دیا تھا کہ میں طوائف زادی نہیں بلکہ ایک شریف اور معزز آدمی کی بیٹی ہوں۔ یہ بیان اس نے اپنی ماں اور بہن گوری کے خلاف دیا تھا۔ اس نے خود کو ان دونوں سے بلکہ اپنے تمام خاندان سے علیحدہ کر لیا تھا اور یہ تاثر دیا تھا کہ وہ ایک شریف زادی اور قابل احترام عورت ہے۔ ماں اور بہن نے بہت سارے جوابی بیانات جاری کیے مگر وہ بیانات انجمن کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکے۔ اس سے پہلے انجمن اپنے شوہر مبین ملک کے خلاف ہتک آمیز بیانات جاری کرتی رہی ہے اور اپنی ماں، بہن اور خاندان کے حق میں دلائل پیش کرتی رہی ہے۔ پھر اس نے قلابازی کھائی اور ماں کے خلاف اور مبین کے حق میں بیانات جاری کرنے شروع کر دیے۔ ظاہر ہے کہ جواب میں اس کی ماں اور بہن گوری کی جانب سے بھی بیانات کا جاری ہونا ضروری تھا۔ اس طرح خاصہ گرما گرم معرکہ چھڑ گیا۔ اس سے پہلے وہ اچانک شادی کر کے اور پھر شادی کے





اختیار کر کے خبریں بنا چکی تھی۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ زندگی بسر نہیں کر سکتی۔ پھر مقدمہ بازی شروع ہوئی یہاں تک کہ ایک ڈرامائی عدالتی سین کے بعد اس نے اپنے شوہر سے مصالحت کر لی۔ کچھ عرصہ گزرنے کے بعد انجمن نے اچانک نیشنل فلم ایوارڈ کے ججوں کے خلاف ایک بیان داغ دیا جب کسی صحافی نے دریافت کیا کہ 1987ء اور 1988ء میں بہترین اداکارہ کا ایوارڈ اسے کیوں نہیں ملا تو اس نے بھولا سا منہ بنا کر کہا۔ "اس لیے کہ میں نے ججوں کو خوش نہیں کیا تھا....."

انجمن کے اس بیان سے سارے ملک میں شور مچ گیا۔ انجمن نے ایک لحاظ سے فلم جیوری کے ارکان پر یہ الزام عائد کیا تھا کہ انہیں خوش کیے بغیر ان کی خوشنودی حاصل نہیں کی جا سکتی اور ایوارڈز میرٹ پر نہیں بلکہ سفارش اور رشوت کے ذریعے دیے گئے ہیں۔ یہ بیان اس لیے بھی افسوسناک تھا کہ اس سال جیوری کے ارکان میں دوسرے معززین کے علاوہ ریٹائرڈ جسٹس جاوید اقبال بھی شامل تھے جن کی شخصیت ہر ایک کے لیے قابل احترام اور شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ مگر انجمن کو ان باتوں سے کیا غرض، اسے تو بیان داغ دینے سے مطلب ہے۔

کچھ عرصہ بعد انجمن نے اعلان کیا کہ میں اس سال ماہ رمضان میں اعتکاف میں بیٹھوں گی مگر بعد میں اس فیصلے پر عمل نہیں کیا۔ یہ دلچسپ روداد مشہور کالم نویس عطاء الحق قاسمی نے اس طرح رقم کی ہے۔

"ایک مقامی اخبار میں" اداکارہ انجمن کے حوالے سے ایک خبر شائع ہوئی ہے جس کے مطابق اخبار کے نمائندے نے انجمن کو اسٹوڈیو میں مصروف شوٹنگ پایا تو پوچھا کہ آپ نے تو اخبار کے ذریعے اعتکاف میں بیٹھنے کا اعلان کیا تھا لیکن آپ تو شوٹنگ میں مصروف ہیں۔ یہ کیا معاملہ ہے؟" جس کے جواب میں انجمن نے کہا کہ میں تو اعتکاف میں بیٹھنا چاہتی تھی مگر فلمی مصروفیات نے ایسا نہیں کرنے دیا۔ اپنی بات کی وضاحت کرتے ہوئے انجمن نے "فرمایا" کہ حقوق اللہ سے حقوق العباد زیادہ اہم ہیں اور وہ فلموں میں کام کر کے حقوق العباد پورے کر رہی ہے۔ انجمن نے کہا کہ ہو سکتا ہے وہ اگلے رمضان میں اعتکاف میں بیٹھیں۔

اس "عاجز" خبر میں، میں نے اپنی طرف سے صرف لفظ "فرمایا" کا اضافہ کیا ہے

انجمن صاحبہ نے اعتکاف اور شوٹنگ میں سے شوٹنگ کو افضل عبادت قرار دیا ہے اور یوں خود کو مفتی کے مقام پر فائز کر دیا ہے چنانچہ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ میں "مفتی صاحبہ" کے ملفوظات کو "کہا" کے کھاتے میں ڈالنے کی گستاخی کروں۔ لہٰذا میں نے وفور عقیدت میں "فرمایا" کا لفظ استعمال کیا، متذکرہ رپورٹر صاحب رواروی میں مناسب الفاظ استعمال نہیں کر سکے۔ مجھے یقین ہے کہ میرے توجہ دلانے پر اب وہ بھی دل میں نادم ہوں گے۔ بہرحال ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے۔ تاہم دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ رپورٹروں کی اس فروگزاشت کو معاف فرمائیں۔ جہاں تک انجمن صاحبہ کے حقوق العباد کا تعلق ہے میرے ایک دوست ریاض الرحمٰن ساغر کا کہنا ہے کہ انہوں نے واقعی اس ضمن میں بھی کوتاہی نہیں کی اور وہ شادی سے پہلے اپنی والدہ اور اپنے بہن بھائیوں کی کفالت کا بوجھ اٹھاتی رہی ہیں۔ خود میں کچھ عرصے سے فلم سنسر بورڈ کے رکن کی حیثیت سے انجمن صاحبہ کی فلمیں پوری دلچسپی سے بلکہ ان کے موجودہ بیان کے حوالے سے اگر اسلامی اصطلاح استعمال کی جائے تو پورے خضوع و خشوع کے ساتھ دیکھ رہا ہوں۔ مجھ میں ابھی اتنا اعتماد نہیں آیا کہ میں انجمن صاحبہ کی طرح پورے یقین سے یہ فتویٰ دے سکوں کہ وہ اپنی فلموں کے ذریعے حقوق العباد پورے کر رہی ہیں۔ تاہم بہت محتاط لفظوں میں اس کی تصدیق ضرور کر سکتا ہوں کیونکہ جب وہ پردہ اسکرین پر رقص کا مظاہرہ فرماتی ہیں تو تماشائی تو تماشائی خود سنسر بورڈ کے ارکان کے چہرے کھل اٹھتے ہیں اور وہ ان کا ایک ایک رقص کئی کئی دفعہ جھک لگا کر دیکھتے ہیں اور ایسا کرتے ہوئے ہر بار عربی کے کچھ کلمات بھی ادا کرتے ہیں۔ اللہ کے بندوں کا دل قابو کرنا بھی میرے خیال میں حقوق العباد کے زمرے میں آتا ہے بلکہ کہنے والوں نے "دل بدست آور" والے فعل کو حج اکبر کے برابر قرار دیا ہے اور بلھے شاہ تو یہاں تک فرماتے ہیں کہ مندر ڈھا دو، مسجد ڈھا دو، اور اس کے علاوہ جو بھی چاہے ڈھا دو، بس کسی کا دل نہ ڈھاؤ کہ خدا دل میں رہتا ہے چنانچہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ انجمن صاحبہ بارش میں جو سین فلماتی ہیں اگرچہ وہ حقوق العباد کے ضمن میں آتا ہے مگر تھوڑا بہت خیال حقوق العباد کے علاوہ حقوق اللہ کا بھی کر لینا چاہیے چنانچہ ہم سنسر بورڈ کے ارکان اگرچہ بسا اوقات اس قسم کے سین پر قینچی چلا دیتے ہیں لیکن ایسا کرتے ہوئے ہمارے اپنے دلوں پر چھریاں چلتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ

ہماری یہ خطا معاف فرمائے۔

ایک دوست نے خدا کرے خبر پڑھ کر کہا کہ انجمن صاحبہ نے حقوق العباد کی جو بات کی ہے وہ اپنی فلموں کے ناظرین کے حوالے سے نہیں بلکہ اپنی فیملی کی کفالت کے حوالے سے کہی ہے۔ مگر انجمن صاحبہ کے فتوے کی یہ تفسیر درست نہیں کیونکہ اب وہ ماشاءاللہ شادی شدہ ہیں اور شادی کے بعد کفالت کی ذمے داری بیوی پر نہیں شوہر پر عائد ہوتی ہے۔ باقی رہا والدہ اور بہن بھائیوں کا مسئلہ تو اب وہ خود اپنے پاؤں پر کھڑے ہو چکے ہیں۔ نیز ایک اطلاع کے مطابق اب انجمن صاحبہ کے تعلقات ان کے ساتھ کچھ اتنے زیادہ خوشگوار بھی نہیں ہیں کہ ان کی خاطر اعتکاف چھوڑ کر فلموں میں کام کرتی پھریں۔ چنانچہ حقوق العباد سے ان کی مراد یقیناً ناظرین (اور فلم سنسر بورڈ کے اراکین) کو وہ "مسرت" فراہم کرنا ہے جس کا ایک آدھ [illegible]۔

انجمن صاحبہ نے اپنے بیان میں ایک بات یہ بھی فرمائی ہے کہ ہوسکتا ہے وہ اگلے رمضان میں اعتکاف میں بیٹھیں۔ اس سے پتا چلتا ہے کہ وہ اعتکاف کے مقابلے میں اگرچہ فلم کو زیادہ اہم عبادت سمجھتی ہیں تاہم اعتکاف کی اہمیت سے وہ مکمل طور پر انکاری نہیں ہیں بلکہ وہ اسے بھی عبادت کا حصہ سمجھتی ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ میں والد ماجد کی لائبریری سے گاہے گاہے استفادہ کیا کرتا تھا اور یوں دینی امور کے بارے میں مجھے کافی معلومات حاصل تھیں لیکن اب میں بھی حقوق العباد والی مصروفیات کی وجہ سے دینی کتب کے مطالعے سے غافل ہوتا جا رہا ہوں۔ چنانچہ یقینی طور پر نہیں کہہ سکتا کہ خواتین اعتکاف کے لیے اپنے گھر میں مختص ہیں یا انہیں مسجد میں بیٹھنے کی اجازت ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ مسجد میں اعتکاف میں بیٹھ سکتی ہیں۔ اس صورت میں اگلے سال انجمن صاحبہ جب اعتکاف میں بیٹھیں تو مسجد کا انتخاب ذرا احتیاط سے کریں۔ میرا مشورہ یہ ہے کہ وہ اس مقصد کے لیے شاہی مسجد کا انتخاب کریں۔ ایک تو اس لیے کہ وہ اورنگزیب نے تعمیر کی تھی جن کے خیالات فنون لطیفہ سے وابستہ لوگوں کے بارے میں کچھ اچھے نہیں تھے۔ چنانچہ انجمن صاحبہ جب اس مسجد میں اعتکاف میں بیٹھیں گی تو اورنگزیب عالمگیر کو اندازہ ہوگا کہ فنون لطیفہ سے وابستہ بھی لوگ مذہب بیزار نہیں ہوتے تو ان کی روح کو سکون ملے گا۔ بلکہ میرے ایک دوست شیشے کے گلاس پر روحوں کو بلانے کا کام کرتے ہیں انہیں زحمت دے کر اورنگزیب عالمگیر کی روح کو بلایا جائے اور انہیں بتایا جائے کہ انجمن صاحبہ نے فلم اور اعتکاف میں سے فلم کے افضل ہونے کا فتویٰ بھی دیا تھا تو وہ سوچ میں پڑ جائیں گے کہ اب فتاویٰ عالمگیری کا کیا مصرف تلاش کریں؟ بہرحال بادشاہی مسجد کے انتخاب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ یہاں حضرت مولانا عبدالقادر آزاد جیسے جو گریڈ بائیس کے عالم دین ہیں۔ انہوں نے حال ہی میں لیڈی ڈیانا صاحبہ کو قبول اسلام کی دعوت دی تھی۔ انجمن صاحبہ کو حضرت مولانا صاحب کی ذات بابرکات سے یہ فائدہ ہوگا کہ اعتکاف کے دوران اسلام کی تشریح و تعبیر کے ضمن میں غور و فکر کرتے ہوئے اگر انہیں کہیں کوئی الجھن درپیش ہوئی تو وہ حضرت مولانا دام مجدہم سے فوراً استفادہ کرسکیں گی بلکہ خود انجمن صاحبہ نے اسلامی احکامات کے ضمن میں جس بصیرت کا ثبوت دیا ہے اس کے پیش نظر خود مولانا صاحب بھی ان سے استفادہ کرسکتے ہیں کہ علم کسی کی میراث نہیں۔ بہرحال اگر اگلے برس انجمن صاحبہ کی فلمی مصروفیات اجازت دیں اور ان پر حقوق العباد کا بوجھ نہ ہو تو میری خواہش ہے کہ وہ اعتکاف میں ضرور بیٹھیں بلکہ مقررہ دنوں سے بھی زیادہ دن اعتکاف میں بیٹھیں۔ میں فتویٰ دیتا ہوں کہ اس طویل اعتکاف کی وجہ سے اگر ان کی ایک آدھ فلم مس ہوگئی تو وہ اللہ کے حضور جواب دہ نہیں ہوں گی بلکہ ممکن ہے وہ ذات فلم کے مس ہونے کو بھی حقوق العباد ہی کے کھاتے میں ڈال دے کہ بے شک یہ وہی ہے جو ہر بات کی حکمت سمجھنے والا ہے۔"

اس طویل اقتباس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ انجمن اس قسم کے بیانات جاری کرنے کے بعد ملک بھر کے اخبارات اور کالم نویسوں کی توجہ کا مرکز بننے کی ترکیب سے واقف ہے۔ وہ تھوڑے تھوڑے عرصے بعد اس قسم کے بیانات جاری کرنے کی پالیسی پر گامزن رہتی ہے۔ اگر مخالفت میں بہت زیادہ شور مچ جائے تو کچھ دن بعد تردید جاری کر کے ایک بار پھر اخبارات کے صفحات پر موجود نظر آتی ہے۔

اس سے پہلے انجمن نے یہ بیان بھی جاری کیا تھا کہ وہ دو سال بعد اپنی تمام فلمیں مکمل کرا کے حج کرنے جائے گی اور پھر فلموں سے ریٹائر ہوجائے گی۔ اس خبر پر حاشیہ آرائیوں اور تبصروں کا سلسلہ ابھی زور و شور سے جاری تھا کہ انجمن نے تردید کردی کہ میں نے ایسا کوئی بیان نہیں دیا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے بیانات کے ذریعے اخبارات کے کالموں میں سرخیوں کا موضوع بنے رہنا یا تو ہمارے لیڈر صاحبان جانتے ہیں یا پھر یہ گر انجمن کو معلوم ہے۔

مگر نہیں ایسا قحط الرجال بھی نہیں ہے۔ فلموں میں نئی وارد ہونے والی ہیروئن ریما کو اس فن میں کافی سوجھ بوجھ ہے۔ ریما کی فلمی عمر تو ابھی کم ہے مگر اس کی پختگی اور بالغ نظری سے اندازہ ہوتا ہے کہ شاید وہ تیس چالیس سال سے فلمی دنیا میں موجود ہے۔ انجمن نے اپنے "شریف" ہونے کا جو اعلان کیا تھا اس کو آگے بڑھانے کا سہرا بھی ریما کے سر ہے۔ انجمن کے بعد ریما دوسری ہیروئن ہے جو تھوڑے تھوڑے عرصے بعد اس قسم کے بیانات جاری کرتی رہتی ہے کہ اخبارات نے خواہ مخواہ میرے متعلق اسکینڈلز بنالیے ہیں جن کی وجہ سے میری بدنامی ہو رہی ہے۔ ہر روز میرا نام کسی کے ساتھ منسوب کردیا جاتا ہے۔ آخر میں بھی خاندانی لڑکی ہوں۔ میری بہنوں کے مستقبل پر بھی اس کا اثر پڑسکتا ہے۔ ایک بار تو ریما نے یہ بیان دیا کہ میرے گھر والے اور والد صاحب اسکینڈلز سے بہت تنگ آچکے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہت رسوائی ہوچکی ہے تم کس چکر میں پڑ گئی ہو۔ فلمیں چھوڑ دو تاکہ ہم لوگوں کو سکون اور عزت کی نیند حاصل ہوسکے۔ پھر ریما خود ہی اپنے بیان میں وہ دہراتی رہتی ہے کہ کبھی میرا اسکینڈل شان کے ساتھ بنایا جاتا ہے تو کبھی میرا نام کسی وزیر سے منسوب کیا جاتا ہے جو میرے بزرگ کی عمر کے ہیں۔ خدارا میرے اوپر رحم کیجیے۔ میرا سکون غارت ہوگیا ہے۔ میرے خاندان پر لوگ انگلیاں اٹھانے لگے ہیں۔ ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ اس قسم کے بیانات اور پارسائی اور شرافت کے دعوے وہ صاحبہ کر رہی ہیں جو فلموں میں کام کرنے سے پہلے بھی مجرے کیا کرتی تھیں اور اس بازار میں ان کا ٹھکانا تھا اور آج بھی بڑے دھڑلے سے یہ کام کر رہی ہیں۔ کوئی پوچھے کہ محترمہ کون سے شریف گھرانے کی لڑکیاں ہیرامنڈی میں رہتی ہیں اور مجرے کرتی ہیں؟ مزے کی بات یہ ہے کہ وہ ہیروئن بن جانے کے بعد بھی مجرے کرتی ہیں اور ایک ایک رات میں ایک ایک لاکھ روپیا کماتی ہیں۔ یہ بات کسی سے پوشیدہ بھی نہیں ہے۔ اس کے باوجود ان کا کہنا ہے کہ اخبارات میں اسکینڈلز شائع ہونے کی وجہ سے ان کے خاندان کی اور ان کی بدنامی ہوتی ہے۔ شاید شاعر نے ایسے ہی مواقع کے لیے کہا ہے کہ

جنوں کا نام خرد رکھ دیا، خرد کا جنوں
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ طرز کلام اور انداز بیان سب سے پہلے انجمن ہی نے اختیار کیا تھا۔ لطیفے کی بات یہ ہے کہ انجمن کی چھوٹی بہن گوری نے بھی اپنی بہن کی دیکھا دیکھی ایک پریس کانفرنس میں یہ اعلان فرمایا کہ میرے بارے میں اخبارات جیسی خبریں شائع کرتے ہیں وہ شرمناک ہیں۔ میں شریف لڑکی ہوں اس طرح میری بدنامی ہوتی ہے۔ یہ گوری ہیں جو ایک پولیس چھاپے کے دوران میں لاہور کی ہیرامنڈی سے پکڑی گئی تھیں مگر انہوں نے اتنا شور مچایا اور ایسے تار ہلائے کہ نہ صرف انہیں پولیس نے چھوڑ دیا بلکہ معذرت بھی طلب کرلی۔ گوری اس کے جواب میں پولیس پر خوب گرجیں برسیں اور کہا کہ میں تو اپنے رشتے داروں سے ملاقات کے لیے ہیرامنڈی گئی تھی کہ پولیس والوں نے پکڑ لیا۔ کیا رشتے داروں سے ملاقات کرنا کوئی جرم ہے؟ ان بیانات کو پڑھ کر کبھی احساس ہوتا ہے کہ شاید شرافت، خاندان اور بدنامی کے مروجہ معانی بدل گئے ہیں۔ مگر یہ ماننا پڑے گا کہ اس قسم کے بیانات جاری کرنے کی جرأت اس سے پہلے کسی ایکٹریس کو نہیں ہوئی تھی کہ اس بازار سے تعلق رکھنے والی ایکٹریسیں پارسائی اور بدنامی کے موضوع پر اظہار خیال کریں۔ بہرحال جس طرح یہ کہا جاتا ہے کہ بھٹو صاحب نے اور کچھ کیا ہو یا نہ کیا ہو انہیں یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے اس ملک کے غریب اور مزدور کے منہ میں زبان دے دی۔ اسے بولنے کا حق اور حوصلہ دے دیا۔ اسی طرح یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ انجمن کو یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ اس نے بازار کی ایکٹریسوں کو شرافت اور پارسائی کا نعرہ دے دیا اور ان کے منہ میں زبان دے دی۔ انجمن کا یہ کارنامہ بھی کچھ کم نہیں ہے۔ کم از کم اپنی برادری والوں کے لیے اس کا یہ عمل کارنامے سے کم نہیں ہے اور اس نے ان تمام لڑکیوں کو "دفاع" کرنے کے بجائے "جارحیت" کرنے کا سبق سکھا دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس بازار کا کلچر اب ہماری فلمی صنعت پر چھا گیا ہے۔ اس انڈسٹری کا ماحول اور مزاج ہی بدل کر رہ گیا ہے۔

انجمن جس نے ہماری فلمی صنعت میں بہت سی نئی روایات قائم کی ہیں۔ بہت سے ڈرامائی واقعات میں مرکزی کردار بھی رہی ہے۔ ان میں سے بہت سے ڈرامے تو منظر عام پر آگئے ہوئے اور سب نے انہیں دیکھا مگر بہت سی ایسی ان کہی داستانیں بھی ہیں جو مخصوص کانوں تک

محدود رہی ہیں۔ یہ کارنامہ سرانجام دینے والی اداکارہ جس نے ماضی کی تمام ہیروئنوں پر سبقت حاصل کر لی ہے آخر کون ہے اور کہاں سے آئی ہے؟ اس کا معمہ اور بھید کیا ہے؟ آیئے۔ آپ کو انجمن کی کہانی سناتے ہیں جو کسی فلمی کہانی سے کم دلچسپ اور ڈرامائی سے کم زوردار نہیں ہے۔

یہ تو آپ پڑھ ہی چکے ہیں کہ جب وہ پیدا ہوئی تو گھر والوں نے اس کا نام انجم رکھا تھا۔ بازار حسن میں لڑکیوں کے نام ایسے ہی رکھے جاتے تھے۔ مثلاً ستارہ، زہرہ، انجم، نیلوفر، شعلہ وغیرہ۔ نام رکھتے ہوئے یہ لحاظ رکھا جاتا ہے کہ نوزائیدہ بچی کی صورت شکل اور رنگ روپ بھی نام کے مطابق ہے یا نہیں؟ مگر انجم پیدائش کے وقت بھی ایک پیاری اور خوب صورت بچی تھی۔ روشن بڑی بڑی آنکھیں، تیکھا ناک نقشہ، کھلتا ہوا گندمی رنگ، وہ قد و قامت اور صحت میں بھی کسی سے کم نہیں تھی۔ اماں نے فوراً بلائیں لی۔ گھر والوں نے بچی کی پیدائش پر اللہ کا شکریہ ادا کیا اور ملتان کے محلے میں مٹھائی تقسیم کی تاکہ سب کو پتا چل جائے کہ حسن کی بستی میں ایک نووارد ہستی نے جنم لیا ہے جو کاروبار اور پیشے کی آبرو بڑھائے گی، دولت کمائے گی، صنف مخالف کے دلوں پر قیامت ڈھائے گی۔ انجم نام رکھتے وقت کسی کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ لڑکی ایک دن چاند ستاروں کی طرح جگمگائے گی اور اس کی روشنی سارے ملک میں پھیل جائے گی۔

انجم (اب انجمن) کے بارے میں عام طور پر یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ وہ اپنی بہن گوری کی سگی بہن نہیں ہے۔ ان دونوں کی ماں تو ایک ہے مگر باپ جدا ہیں۔ چنانچہ بعد میں جب انجمن کا اپنے گھر والوں کے ساتھ جھگڑا ہوا تو اس نے پریس کانفرنس میں یہ اعلان کیا کہ میرا ان لوگوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ میں ایک شریف اور معزز باپ کی بیٹی ہوں لیکن اڑتی چڑیا جو خبر لائی ہے اس کے مطابق انجمن حقیقت میں نہ تو گوری کی بہن ہے اور نہ اس کی ماں کی بیٹی ہے۔ انجمن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ وہ دراصل گوری کی خالہ کی بیٹی ہے۔ گوری کی خالہ نے ایک شادی کر لی تھی جس کے نتیجے میں انجم نے جنم لیا۔ انجم کا ایک بھائی بھی بتایا جاتا ہے۔ انجم ابھی چھوٹی ہی تھی کہ اس کی ماں کا انتقال ہو گیا اور اس کی پرورش کی ذمہ داری گوری کی ماں پر عائد ہوئی۔ اس نے انجم کو اپنی بیٹی بنا کر پالا اور اس کی تربیت کی۔ ظاہر ہے کہ جس ماحول میں وہ پرورش پا رہی تھی وہاں اسے ناچ گانے کی تعلیم ہی دی جا سکتی تھی۔ انجم ایک دراز قد دبلی پتلی اور پرکشش لڑکی تھی۔ وہ شوخ بھی تھی اور اسے اداکاری کا بھی شوق تھا۔ وہ بچپن ہی سے فلمیں دیکھنے کی شوقین تھی اور جو بھی فلم دیکھ کر آتی آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اس فلم کی ہیروئن کی نقل ضرور کرتی تھی۔ اس طرح یہ دونوں بھائی بہن اپنی خالہ کے گھر میں پلے بڑھے مگر انہیں یہی تاثر ملا کہ وہ اسی کے بچے ہیں۔

انجم کو اداکارہ بننے کا شوق تھا جس کے لیے ملتان مناسب اور موزوں جگہ نہیں تھی پھر انجم جس طرح رنگ و روپ نکال رہی تھی اس کے پیش نظر بھی اس کے گھر والوں نے ملتان چھوڑ کر لاہور میں رہائش پذیر ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس طرح انجم اپنے گھر والوں کے ہمراہ ملتان سے لاہور پہنچ گئی اور لاہور کے بازار حسن میں دکان سجائی۔ انجم کا چہرہ اور جسم پرکشش تھا ہی اس کی آواز میں بھی ایک کھنک اور عجیب سی لطافت تھی جو سننے والوں کے کانوں پر بجلی گراتی تھی۔ اداکارہ بننے کے بعد آواز کی یہی خوبی انجمن کے کام آئی۔ پاکستانی ہیروئنوں میں بہت کم ایسی ہوئی ہیں جن کو اچھی اور دل کو بے تاب کرنے والی آواز میسر آئی ہو ورنہ عام طور پر ہماری ہیروئنوں کی آوازیں سمع خراشی کی حد تک خراب ہوتی ہیں۔ مثلاً شمیم آرا نے جب فلمی صنعت کا رخ کیا تو اس کی آواز بہت خراب تھی۔ کانوں کو کھٹکنے والی یہ آواز ہیروئن کے منہ سے اچھی نہیں لگتی تھی۔ رفتہ رفتہ شمیم آرا نے اپنی آواز کی کوالٹی کو بہتر بنایا۔ زیبا کو بھی میٹھی اور اچھی آواز نہیں ملی۔ یہ بھی تیز اور کانوں میں خارش پیدا کرنے والی آواز تھی۔ زیبا نے آواز کو دبا کر اور اس میں دھیما پن پیدا کر کے اس خامی پر کسی حد تک قابو پا لیا تھا مگر اس کی آواز میں کشش کبھی پیدا نہیں ہوئی۔ ممتاز کی آواز سن کر تو لوگ کانوں پر ہاتھ دھر لیا کرتے تھے۔ ہمارے فلم سازوں اور ہدایت کاروں میں سے کسی کو اتنی توفیق نہ ہوئی کہ ممتاز کے لیے کسی اچھی آواز، مستعار لے کر اس کے مکالمے ڈب کر لیے جاتے۔ اگر ایسا ہو جاتا تو نہ صرف ممتاز کی کشش اور مانگ میں اضافہ ہو جاتا بلکہ اس کی فلموں کی کامیابی کا تناسب بھی بہت اچھا ہو جاتا۔ ایک اتنی اچھی صورت اور اس قدر خوب صورت پیکر والی ہیروئن جب زبان کھولتی تھی تو سننے والے کان بند کر لیا کرتے تھے اور تمام تاثر برباد ہو جاتا تھا۔ شمیم آرا کی آواز میں تو باقاعدہ دو آوازوں کا تاثر تھا۔ ذرا اونچی آواز میں بولنے سے اس کی آواز پھٹ جایا کرتی تھی۔ کچھ فلم سازوں نے اس کی فلموں کے مکالمے اچھی آوازوں میں ڈب کیے تو بہت حوصلہ افزا نتائج نکلے۔ مگر بعد میں شمیم آرا نے اصرار کر کے اپنے مکالمے خود بولنے پر زور دیا اور فلم ساز کو بھی اس میں مالی فائدہ نظر آیا۔ ہماری چوٹی کی ہیروئنوں میں سے اچھی، مدھر اور مختلف ہوئی آواز صبیحہ خانم کی تھی۔ مسرت نذیر کی آواز بھی بری نہیں تھی۔ رانی کی آواز نفیس تھی۔ یہی حال دوسری ہیروئنوں کا بھی تھا۔ نیلو کی آواز میں ایک خاص قسم کی کیفیت تھی جو کسی دوسری ہیروئن کو نصیب نہ ہو سکی۔ یہی وجہ ہے کہ وہ زیادہ جلدی کامیاب ہو گئی۔ فردوس کا سراپا بہار آفریں تھا مگر آواز میں ایک خشک تاثر تھا۔ وہ ایکسپریشن اور میٹھے پن سے عاری تھی۔ اس اعتبار سے دیکھا جائے تو انجم کی آواز میں ایک خداداد کشش ہے۔ وہ ایک بھرپور اور پختہ عورت کی آواز تھی ہے جو سننے والے کے دل میں آرزوئیں اور امنگیں بیدار کر دیتی ہے۔ انجمن جب انجم تھی اس وقت بھی آواز کی یہ خوبی اس کے کام آئی۔ وہ اچھا گانا گاتی تھی جو سننے والوں کے دلوں کے تار چھو لیا کرتا تھا۔ انجم نے شباب کے آنگن میں قدم رکھا تو قیامت کے آثار پہلے ہی نظر آنے لگے۔ اس کے حسن و شباب کا چرچا چار سو پھیل گیا۔ کشاں کشاں یہ اطلاع ان ایکسپورٹرز کو بھی مل گئی جو پاکستان کی منڈیوں سے معقول اور اچھا سامان بیرون ملک بھیجا کرتے تھے۔ اس زمانے میں مشرق وسطیٰ کی مارکیٹ تازہ تازہ قائم ہوئی تھی۔ وہاں دولت کی فراوانی تھی اور حسن و شباب کی جستجو بھی اس کے ہمراہ تھی۔ وہاں کا دورہ کر کے بہت سی رقاصائیں لکھ پتی بن گئی تھیں۔ ایک ایسا وقت بھی آیا تھا جب لاہور کی فلمی دنیا میں معقول اور کام کی صورت شکل والی کوئی ایک اداکارہ بھی باقی نہیں رہی تھی۔ ہیروئنوں کو تو چھوڑیے اچھے چہروں اور جسموں والی سائیڈ ہیروئنیں اور ڈانسر تک نایاب ہو گئی تھیں۔ شیخ صاحبان کے کارندے مناسب مال کی تلاش میں بو سونگھتے پھرتے تھے۔ انجم کی چڑھتی جوانی کی اطلاع بھی انہیں مل گئی اور پھر اسے ایک دولت مند شیخ نے پسند بھی کر لیا۔ یہ ایک منافع کا سودا تھا۔ اچھا دھندا بھی جاری تھا اور شیخ صاحب کی تجوریوں کا منہ بھی کھلا ہوا تھا۔ ایک باخبر ذریعے کے مطابق انجم اس شیخ کے بچے کی ماں بھی بن گئی تھی۔ واللہ اعلم بالصواب جب حسن و شباب خداداد ہو، دولت شیخ کی عطا کردہ ہو اور دل میں ہیروئن بننے کی آرزو بھی مچل رہی ہو تو پھر راستے خود بخود کھل جاتے ہیں۔ یہی وقت تھا جب

انجم نے قلم اسٹار محمد علی کے ذریعے شباب کیرانوی تک رسائی حاصل کی۔ شباب کیرانوی کو لڑکی کا چہرہ مہرہ تو اچھا لگا مگر ضرورت سے زیادہ لمبا قد پسند نہیں آیا۔ وہ ایک چھریرے اور دلکش جسم کی مالک ضرور تھی مگر دراز قامتی نے اس کی کشش کو کم کر دیا تھا۔ شباب کیرانوی کا خیال تھا کہ کچھ عرصے بعد جب جسم بھر جائے گا تو وہ قیامت خیز جسم کی مالک ہوگی۔ مگر انجم کی ڈکشنری میں انتظار کا لفظ موجود نہیں تھا۔ اس نے شباب کیرانوی کو اپنی رعنائیوں کے ہتھیاروں سے شکار کرنا چاہا اور ساتھ ہی یہ اشارہ بھی دیا کہ وہ فلم میں کچھ سرمایہ کاری بھی کرے گی۔ ظاہر ہے کہ تیل والے ایک شیخ صاحب کے ہوتے ہوئے اسے سرمائے کی کیا کمی ہو سکتی تھی؟ اس طرح شباب کیرانوی کی فلم "وعدے کی زنجیر" میں انجم کو وحید مراد اور محمد علی جیسے چوٹی کے اداکاروں کے ساتھ کاسٹ کر لیا گیا۔ مگر شاید شباب کیرانوی کے دل میں چور تھا اس لیے انہوں نے کاسٹ کرنے سے پہلے انجم کا اسکرین ٹیسٹ لینا بھی ضروری سمجھا حالاں کہ اس سے پہلے وہ اس کے قائل نہیں تھے اور کسی ٹیسٹ کے بغیر ہی نئے چہروں کو سائن کر لیا کرتے تھے۔ اس دوران میں میل ملاپ بڑھا تو شباب کیرانوی پر انجم کی دوسری خوبیاں بھی اجاگر ہو گئیں۔ وہ بہت ڈھنگ سے بات چیت کرتی تھی۔ آواز میں ایک عجیب قسم کی کھنک اور سیکس اپیل تھی۔ اس کی آنکھوں میں بلا کا تاثر بلکہ تاثرات تھے۔ وہ خوش شکل، بہت ساحت، شریر، شوخ، بے چارگی ہر طرح کے تاثرات کا اظہار محض اپنی آنکھوں کے ذریعے کر سکتی تھی۔ اس کا چہرہ کیمرے کے لیے نہایت موزوں تھا۔ اس طرح انجم، شباب کیرانوی کے دل کو بھا گئی۔ جب انہوں نے انجمن کا نام دے کر اس کی شوٹنگ کا آغاز کیا تو پھر اس کی دوسری خوبیاں بھی رفتہ رفتہ شباب کیرانوی پر کھل گئیں۔ وہ دلنوازی اور دل گیری میں مہارت رکھتی تھی۔ بہت جلد اس نے یونٹ کے سب ہی لوگوں کے دل جیت لیے۔ وحید مراد تو حسب عادت ریشہ خطمی ہو گئے مگر قربت کے زیادہ مواقع شباب کیرانوی کی وجہ سے حاصل نہ ہو سکے۔ یہ پہلے ہی بتایا جا چکا ہے کہ انجم کی ماں نے شباب کیرانوی کو بتایا تھا کہ وہ ایک شریف عورت ہے اور انجم ایک شریف اور دولت مند زمیندار کی بیٹی ہے۔ مگر پھر ڈرامائی انداز میں یہ راز شباب کیرانوی پر آخر کار کھل ہی گیا کہ انجم کا تعلق اس بازار سے ہے اس کی جس ٹھاٹ باٹ اور کھلے خرچ، اخراجات کو وہ اس کے باپ کی دولت مندی کا سبب

سمجھ رہے تھے وہ دراصل اس کے فن اور ناز و انداز کی کمائی سے حاصل کی ہوئی دولت تھی۔ یہ راز فاش ہونے کے بعد شباب کیرانوی نے احتیاط اور احترام کا وہ فاصلہ ختم کر دیا جو پہلے قائم کر رکھا تھا۔ مگر اس معصوم صورت مگر پختہ کار عورت کی فنکاری اور اداکاری کے قائل ضرور ہو گئے۔

"وعدے کی زنجیر" بنتی رہی۔ شیخ صاحب بھی خوش تھے اور انجمن بھی۔ ان کی پسند کا ہیرا ساری دنیا میں فلم کے ذریعے روشنی پھیلانے والا تھا۔ ان کے غرور و ناز کی انتہا نہ رہی تھی۔ انہوں نے انجمن کی آؤ بھگت اور دلداری میں اضافہ کر دیا۔ شیخ صاحب نے اسے ایک فیشن ایبل علاقے میں کوٹھی خرید کر دے دی اور اس کو قیمتی فرنیچر سے آراستہ بھی کر دیا۔ قالین، فانوس، صوفے، میزیں، کرسیاں ہر طرح کا سامان آرائش اس کوٹھی میں موجود تھا اور اس سے بڑھ کر سب سے بڑی سجاوٹ خود انجم کی ذات تھی ساری رونق اور چہل پہل اسی کے دم سے تو تھی۔ کار اس کے پاس پہلے ہی سے تھی۔ دولت کی فراوانی تھی اور تحفے تحائف کے طور پر گھڑیاں اور قیمتی زیورات کی بھی کمی نہ تھی۔ شیخ صاحب اپنی شان کے مطابق اپنے محبوب کی دلداری کر رہے تھے اور انجمن کی دلنوازی اور دلربائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی تھی۔

"وعدے کی زنجیر" تو کامیاب نہ ہوئی مگر انجم اپنی ذاتی حیثیت میں بہت ہٹ ہو گئی۔ جس نے اسے دیکھا دل تھام کر رہ گیا۔ وہ حقیقی زندگی میں فلم کے پردے سے کہیں زیادہ خوبرو اور دلکش نظر آتی تھی۔ اس کے جسم سے شعلے لپکتے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ اس کی مسکراہٹ دیوانہ بنا دینے والی اور انداز کلام مدہوش کر دینے والا تھا۔ "وعدے کی زنجیر" کے بعد کچھ عرصے تک اسے دوسری فلم میں کام کرنے کا موقع نہیں ملا مگر ہر طرف دبی دبی زبان میں انجمن ہی کے چرچے تھے۔ شیخ صاحب اسے ایک بچے کا آخری تحفہ دے کر رخصت ہو گئے اس لیے کہ ان کے پاس دولت کی کمی تو نہ ہوں گی۔ ان کی ہوس نشاط کار کے لیے نئے نئے چہرے اور نئے نئے جسم تلاش کرتی پھرتی تھی۔ ڈھائی تین سال تو انجمن کے گھر میں بٹھا دیے بھی کچھ کم نہ تھا۔ اس عرصے میں انجمن نے فلمی دنیا میں خود کو متعارف کرا لیا تھا۔ جگرے ہیروئن بننے کے بعد بھی جاری تھے جہاں تک کہ مخصوص لوگوں کے لیے اس کی شاندار کوٹھی کے ڈرائنگ روم میں بھی طبلے کی تھاپ اور گھنگھروؤں کی جھنکار کا جادو جاگ اٹھتا تھا۔

انجمن کی فلمی کارکردگی کا تذکرہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے "شیر خان" سے پہلے اسے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں ہوئی تھی مگر یہ محض فلم کی حد تک تھا۔ ذاتی زندگی میں وہ کامیابیوں اور کامرانیوں کی بلندیوں پر تھی۔ "وعدے کی زنجیر" اس کے لیے بے پناہ پبلسٹی کا سبب ثابت ہوئی تھی اور اس نے اپنے عشق و ناز کی فیس میں بھی بے انتہا اضافہ کر دیا تھا۔ دولت مندوں اور اہل دل کی بھی کوئی کمی نہ تھی جو اسے منہ مانگا نذرانہ پیش کرنے کو تیار تھے بلکہ اس معاملے میں ایک دوسرے پر بازی لے جانے کی کوشش میں مصروف رہا کرتے تھے۔

اسی زمانے میں انجمن کا رابطہ ایک ادھیڑ عمر انتہائی دولت مند صنعت کار سے ہوا۔ یہ صاحب زندگی کے آخری حصے نوش فرما رہے تھے اور جیب بھر کر دل کے ارمان نکالنے کے خواہاں تھے۔ انجم کو دیکھا تو دل تھام کر رہ گئے۔ ان کے کارخانے اور فیکٹریاں دن رات دولت پیدا کرنے میں مصروف تھیں۔ مزدوروں کا حق اور سرکاری انکم ٹیکس اور دوسرے ٹیکس ہمارے صنعت کار کہاں ادا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کی دولت میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ ان صاحب کا بھی عالم تھا کہ کپڑے کی ملیں چل رہی تھیں۔ دوسرے کاروبار بھی خوب چل رہے تھے۔ انہیں عیش و عشرت کے سوا کوئی اور مصروفیت نہ تھی۔ انجمن سے ملاقاتیں بڑھیں تو بالکل ہی جی ہار بیٹھے۔ انہیں یوں لگا جیسے اب تک کی زندگی رائیگاں ہی گئی ہے۔ ایسی دلربا، بھرپور اور دلنواز محبوبہ پہلے ان کی زندگی میں کبھی نہیں آئی تھی۔ ادھر انجمن کو ان کے بینک بیلنس اور کارخانوں سے سروکار تھا۔ ملاقاتیں بڑھتی گئیں اور ان کے ساتھ ہی صنعت کار کی دیوانگی میں بھی روز افزوں اضافہ ہوتا رہا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا جب وہ دل و جان سے اسی کے ہو کر رہ گئے اور اسے اپنا جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچنے لگے۔ ایک بڑی عمر کے عیش پسند انسان میں انجمن کو دولت کے سوا اور کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ مگر وہ غریب اس غلط فہمی کا شکار ہو گیا تھا کہ انجمن درحقیقت اس کی محبت میں گرفتار ہو چکی ہے۔ انجمن تو بہت اونچی پرواز پر تھی۔ جہاں سے اسے آمدنی اور منافع کی امید تھی وہاں اس کی نظریں اور توجہ لگی ہوئی تھی۔ صنعت کار سے انجمن کی ملاقات ہیرا منڈی کے ڈیرے پر ہوئی تھی جہاں صرف پیسے والے اور دل والے ہی نقد جان اور نقد زر لے کر آتے ہیں۔ وہ ایسے متاثر اور مرعوب ہوئے کہ انجمن ان

کی بدولت ہیرا منڈی سے گلبرگ میں پہنچ گئی۔ تمام اخراجات، ناز و انداز بوڑھے عاشق کے ذمے تھے۔ انعام و اکرام اور نذر و نیاز اس کے علاوہ تھی۔ انہوں نے تو اپنی دانست میں انجمن کو محبت کی ڈور میں مضبوطی سے باندھ لیا تھا اور اخلاقی بندھن کے ذریعے بھی پابند کر لیا تھا کہ اب وہ کسی اور جانب نظر نہیں اٹھا کر دیکھے گی مگر انجمن کو چین کہاں تھا۔ وہ ایک بے چین روح کی طرح بے قرار، مضطرب اور عاشق مزاج مردوں کو ذہنی اور جسمانی سکون پہنچانے کا فرض ادا کرنے میں لگی ہوئی تھی۔

اخبارات میں جو اطلاع اور تبصرے شائع ہوئے ان کے مطابق بوڑھے صنعت کار کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ غیروں کی بات کیا ہے خود اس کے اپنے بھی انجمن کے حریم ناز کی زد سے باہر نہیں تھے۔ صنعت کار کے نوجوان صاحبزادے بھی اس کے حسن و شباب کے جال میں گرفتار تھے۔ انجمن کی انجمن میں تو ہر ایک کی پذیرائی تھی۔ شرط صرف یہ تھی کہ جیب میں لٹانے کے لیے دولت ہونی چاہیے۔ اس نے گانے اور رقص کی محفلوں سے ملاقات کا آغاز کیا اور فریق مخالف کے التفات کی بدولت اس جال میں پھنستا ہی چلا گیا۔ یہاں تک کہ دل و جان کی بازی ہار بیٹھا۔ صنعت کار ان حالات سے بے خبر محبوب کی خوشبودار زلفوں کے سائے میں شام جاں کو معطر کرنے میں مصروف تھا۔ اس کو احساس بھی نہیں تھا کہ اس گھر کو خود اپنے گھر کے چراغ سے آگ لگ جائے گی۔

ان ہی دنوں ایک انتہائی حیرت انگیز اور ڈرامائی واقعہ رونما ہوا۔ انجمن نے ایک دن صنعت کار کو بہت شرماتے اور لجاتے ہوئے یہ خوش خبری سنائی کہ وہ اُمید سے ہے۔ اس نے بات سنی تو سکتے کے عالم میں اس کا منہ دیکھتا رہ گیا۔ انجمن نے نہ جانے اور کیا کیا کہا اور اپنی خوش ادا وفاؤں کا کیسے کیسے یقین دلایا۔ ایسے موقعے پر اس قسم کی عورتیں ایک ہی قسم کے فقرے ادا کرتی ہیں۔ جن کا مفہوم یہ ہوتا ہے کہ آپ کے بچے کو جنم دے کر میری زندگی کا مقصد پورا ہو گیا ہے۔ انجمن نے بھی اسی قسم کی باتیں کیں۔ صنعت کار سناٹے کے عالم میں سنتا رہا۔ انجمن کا خیال تھا کہ شاید خاندانی رسوائی کے پیش نظر سوچ میں پڑ گیا ہے۔ مگر انجمن کو یہ علم نہیں تھا کہ صنعت کار کچھ عرصہ قبل ایک آپریشن کرا چکا تھا جس کے بعد اولاد پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں تھا۔

کچھ دیر بعد وہ خاموشی سے اٹھا اور کار میں بیٹھ کر اپنے گھر چلا گیا۔ مگر یہ صدمہ اس کے لیے نا قابل برداشت تھا کہ وہ محبوبہ جسے وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا اور جو اپنی محبت اور وفا کا یقین دلانے کے لیے بڑی بڑی قسمیں کھایا کرتی تھی اس کے ساتھ بے وفائی اور اتنا بڑا دھوکا کرے گی اور پھر اس قدر ڈھٹائی اور اعتماد کے ساتھ اسے بے وقوف بنانے کی کوشش کرے گی۔ وہ تو اسے اپنا شریک حیات بنانے کے خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں کبھی ننھے منے معصوم بچوں کے والدین نہیں بنیں گے مگر اس خوب صورت عورت کے ساتھ وہ اپنی باقی ماندہ زندگی گزارنے کو ہی بہت بڑی سعادت خیال کرتا تھا۔

بوڑھے صنعت کار کی راتوں کی نیند اڑ گئی۔ اسے اپنے بے تکلف دوستوں اور رشتے داروں کی باتیں یاد آنے لگیں جنہوں نے اسے مشورہ دیا تھا اور سمجھایا تھا کہ وہ کسی طوائف کی وفا پر اعتبار نہ کرے۔ انہوں نے کہا تھا کہ یہ عورتیں کبھی کسی کے ساتھ ساری زندگی گزارنے کی قائل نہیں ہوتی ہیں۔ اب اسے رہ رہ کر وہ تمام باتیں، اور وہ سارے مشورے اور وہ نصیحتیں یاد آ رہی تھیں جنہیں اس نے مطلق توجہ نہیں دی تھی اور توجہ دیتا بھی کیسے جب کہ اس کی آنکھوں میں انجمن کے حسن و جمال کی چکا چوند نے اس کے سوا کچھ اور دیکھنے کی صلاحیت سلب کر لی تھی۔ اس نے آج تک انجمن کو یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ اولاد کو جنم دینے کی صلاحیتوں سے محروم ہے اور جب اس نے انجمن کو جیون ساتھی بنانے کے بارے میں سوچا تھا تو اسے بارہا پچھتاوا ہوتا تھا کہ یہ آپریشن کرا کے اس نے کہیں جلد بازی تو نہیں کی۔ اگر اس بے مثال عورت کو اولاد کی خواہش پیدا ہوئی تو وہ انجمن کو کیا جواب دے گا؟

انجمن نے اس کی اچانک خاموشی اور اداسی کو اس بات پر محمول کیا تھا کہ شاید وہ اس عمر میں بچے کا باپ نہیں بننا چاہتا یا پھر یہ نہیں چاہتا کہ اس کے خاندان کا چشم و چراغ ایک طوائف کی آغوش میں پرورش پائے لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ محض ابتدائی پھڑ پھڑاہٹ تھی۔ کچھ دیر بعد جب وہ جال مضبوط ہو گا اور شکار ہلکان ہو چکا ہو گا تو پھر وہ من مانی کرانے کے لیے آزاد ہو گی۔ اس نے چند بار فون بھی کیا۔ لگاوٹ کی باتیں بھی کیں اور اسے بڑے پیار بھرے انداز میں گھر آنے کی دعوت دی بھی مگر وہ کوئی عذر کر کے ٹال گیا۔ مگر جب وقت گزرنے لگا اور اس کی قوت برداشت انجمن کے قرب کی خواہش کے مقابلے میں دم توڑنے لگی تو ایک رات اس نے اپنی قیمتی کار نکالی اور کوئے یار کی سمت رواں ہو گیا۔ دل دھڑک رہا تھا، ہاتھ پیروں میں سنسنی سی پھیلی ہوئی تھی۔ ایک طرف محبوبہ کی بے وفائی کا شکوہ تھا مگر دوسری جانب ایک موہوم امکان یہ بھی تھا کہ ہو سکتا ہے آپریشن مکمل اور مفصل نہ ہوا ہو اور سرجن کی کسی کوتاہی کے باعث وہ ابھی تک اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت سے محروم نہ ہوا ہو۔ محبوبہ کی والہانہ اور بے اندازہ محبت اور حسن سلوک کا خیال آتا تو وہ اپنی غلط فہمی پر پشیمان ہونے لگتا۔ ان ہی اندیشہ ہائے دور دراز میں کھویا ہوا انجمن کی کوٹھی تک پہنچ گیا۔ باہر چوکیدار نے اس کی کار دیکھی تو گھبرا گیا مگر پھر اس کی ہدایت پر گیٹ کھول دیا۔ چوکیدار جانتا تھا کہ گھر کا اصل مالک یہی ہے تو پھر اس کے گھبرانے کا کیا سبب تھا! صنعت کار کی کار بے آواز انداز میں کوٹھی کے ڈرائیو وے پر داخل ہوئی مگر بالکل سامنے کھڑی ہوئی ایک کار پر نظر پڑی تو بے اختیار بریک پر گیا۔ اونچی آواز کے ساتھ کار ایک جھٹکے سے رک گئی۔ مگر یہ جھٹکا اس جھٹکے کے مقابلے میں بے حد خفیف تھا جو کار کو دیکھ کر اس کے دل کو لگا تھا۔

سامنے اس کے جوان بیٹے کی کار کھڑی منہ چڑا رہی تھی۔ اتنی رات گئے انجمن کے گھر پر اس کے بیٹے کی کار مطلب کیا تھا؟ صنعت کار نے دنیا دیکھ رکھی تھی۔ خود کو انسانوں کی نفسیات کا ماہر سمجھتا تھا۔ اڑتی چڑیا کے پر بھی گن سکتا تھا۔ مگر اس کی آنکھوں پر ایسی پٹی بندھ گئی تھی کہ وہ اس دہرے کھیل کے بارے میں سوچ بھی نہ سکا۔ رفتہ رفتہ سارے پرانے واقعات یاد آنے لگے اور گمشدہ کڑیاں ملنے لگیں۔ چند لمحے میں وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ اس کی محبوبہ بیک وقت باپ اور بیٹے کو بے وقوف بنا رہی ہے۔ باپ کی دولت اور بیٹے کا شباب ہی اس کا منتہائے نظر تھا کہ ہونے والا بچہ بھی اس کے جوان بیٹے ہی کی نشانی تھی۔

صنعت کار اس سے زیادہ نہ سوچ سکا۔ اس کا دماغ جھن جھنانے لگا۔ ہاتھ پیر بے قابو ہونے لگے دل کی دھڑکن رکنے لگی۔ سارا جسم پسینے میں ڈوب گیا۔ بڑی مشکل سے اپنی کھوئی ہوئی قوتوں کو بحال کر کے اس نے کار کو ریورس کیا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے شہر میں سنسنی پھیلا دی تھی۔ ایسے واقعہ کے بارے میں کسی کو اندازہ بھی نہ تھا۔

بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں

شکور پٹھان

سچ کہا ہے کہ جاوداں، پیہم دواں، ہر دم رواں ہے زندگی لیکن اس روانی میں بھی تجربات کا جوہر ہوتا ہے۔ وہ بھی اسی خیال سے، تجربات سمیٹنے پہنچا، مگر اس کے حصے میں کیا آیا؟

**ایک دلچسپ رپورتاژ جو آپ کو بھی پسند آئے گا**

”یار تو بمبئی کیوں نہیں چلا جاتا؟“

”نہیں یار فی الحال تو کراچی کا پروگرام ہے۔ زیادہ روکڑا خرچ کرنے کی گنجائش نہیں۔“

”ابے اسی ٹکٹ میں، بلکہ اس سے بھی کم میں!“

”کیا مطلب؟“

”پی آئی اے کی اسپیشل آفر ہے بائیے کے لیے۔ کراچی کے ٹکٹ سے بھی نوّے ریال کم ہیں۔ دہران، کراچی، بائیے، کراچی، دہران بنا دیتا ہوں۔ بمبئی نہیں بھی

"میا تو فرق نہیں پڑے گا، تیرے تو دے ریال کی بچت ہو جائے گی۔"

نہ جانے یہ کیسی آفر تھی۔ میں اپنے دوست 'اتفاق' کی ٹریول ایجنسی میں بیٹھا ہوا تھا۔ مست ملنگ، ہمیشہ ہنستے ہنسانے والا اتفاق، انگلش کرکٹر اویس شاہ کا ماموں اور میرے ایک کزن کا سالا ہے۔ اللہ جانے اب کہاں ہے۔ زمانہ ہوا اسنوں نے چھوڑ دیا۔ اتفاق بھی کہیں یورپ یا امریکا نکل لیا تھا۔

میں سالانہ چھٹیوں پر گھر جانے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اتفاق نے یہ آفر بتائی تو بمبئی کا ٹکٹ بنوالیا اور کراچی پہنچ گیا جہاں مجھے کھونٹے سے باندھنے کی تیاری ہو رہی تھی یعنی منگنی کا پروگرام تھا اور میں نے اپنی ہونے والی جیون ساتھی کی تصویر تک نہ دیکھی تھی۔ جب منگنیاں اور شادیاں ایسی ہی ہوتی تھیں، ٹاس کی طرح، کچھ نہیں پتا چلتا تھا کہ سکے کا کون سا رخ سامنے آئے گا۔ یہ داستانِ عبرت پھر کبھی، ابھی تو آیئے بمبئی یاترا کی بات کرتے ہیں۔

فصل خریدی تھی اب گھوڑے کی تلاش تھی یعنی ٹکٹ تو لے لیا تھا اب ویزے کا مرحلہ تھا۔ ان دنوں یہ کوئی ایسا دشوار گزار مسئلہ نہیں تھا۔ ہند و پاک میں پیار کی پینگیں بڑھ رہی تھیں۔ ان کی کرکٹ ٹیم ہمارے ہاں اور ہماری ٹیم ان کے ہاں کھیل کر آچکی تھیں۔ ظہیر عباس اور عمران خان بیشتر بھارتیوں کے ہیرو تھے۔ پاکستان، بمبئی میں ہی جرمنی کو پانچ گول سے ہرا کر عالمی چیمپئن بن گیا تھا اور سمیع اللہ شہباز اور اصلاح الدین کے نام بھارت میں بھی عزت سے لیے جاتے تھے اور مجھ سے پہلے مادام ملکہ ترنم نور جہاں بھی ہندوستان پہنچ چکی تھیں جہاں بمبئی کی پوری فلم انڈسٹری ان کے لیے دیدہ و دل فراش راہ کیے ہوئے تھے۔ مادام جہاں جاتیں محفلیں سجتیں۔ ان کے پرانے ساتھی، دلیپ کمار، نوشاد، ثریا، لتا منگیشکر، پران وغیرہ ان پر واری واری جاتے اور اس وقت پاک بھارت کو ایک دوسرے کو دہشت گرد کہنے کی عادت نہیں پڑی تھی۔ بہت ہوا تو ویزے سے زائد المیعاد رہنے والوں کو جاسوسی کے الزام میں بند کر دیا جاتا۔ کینٹ اسٹیشن کے عقب میں انڈین قونصلیٹ تھی جہاں سے دو روپے دے کر میں نے ویزا فارم حاصل کیا اور باہر بیٹھے ایک بابو کے حوالے اس لیے کیا کہ میرے پاس قلم نہیں تھا [illegible]

بہتر علم تھا کہ فارم کس طرح بھرا جائے کہ ویزا مسترد نہ ہو۔ ہندوستان میں قیام کے لیے تین شہروں کے نام اور وہاں کے پتے بتانے تھے اور مجھے صرف اپنے آبائی قصبے کا پتا یاد تھا جو باجی کو خطوط لکھ کر ازبر ہو گیا تھا۔ میں اسے بمبئی کے مضافات میں ہی سمجھتا تھا۔ یہ تو مجھے وہاں جا کر علم ہوا کہ یہ الگ ضلع ہے اور اس کا بمبئی میٹروپولیٹن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

قونصلیٹ کے باہر بیٹھے منشی نے اپنی طرف سے میرے دیے ہوئے پتے کے علاوہ بمبئی اور پونا کے بھی دو پتے ڈال دیے۔ صبح گیارہ بجے میں نے فارم جمع کروایا اور دوپہر دو بجے آنے کے لیے کہا گیا۔ گھر جا کر آنا مشکل تھا۔ میں مٹر گشتی کرتا ہوا فریئر ہال کی طرف جا نکلا۔ کچھ دیر امریکن کلچرل سینٹر کی لائبریری میں تصویروں والی کتابوں کی ورق گردانی کرتا رہا، باہر آکر کچھ دیر فریئر ہال کے سامنے گارڈن میں لیٹا رہا، اب بھوک لگی تو رکشا لے کر صدر آگیا، کیفے آکسفورڈ میں دال فرائی جس میں ان کے مخصوص اچار کی ایک پھیری تھی، کھائی۔ فرام پتے پر واقع لسی کی مشہور دکان سے ملائی سے بھرپور لسی پی اور نیند میں جھومتا دوبارہ قونصلیٹ کی راہ لی۔ ویزے کے لیے کوئی خاص تشویش یا تجسس نہیں تھا، مل جائے تو ٹھیک ورنہ چھٹیاں تو اپنے کراچی میں بھی مزے میں گزر رہی تھیں۔

قونصل خانے کی مقررہ کھڑکی پر پہنچا تو بغیر کسی سوال جواب کے پاسپورٹ مع ویزا میرے حوالے کر دیا گیا۔ وہاں سے سینٹرل ہوٹل میں واقع پی آئی اے کے دفتر جا کر کراچی، بمبئی، کراچی، واپسی کی تاریخ ٹکٹ پر لکھوائی اور ایمپریس مارکیٹ آکر ہندوستان لے جانے کے لیے تین کلو خستہ کرارے چلغوزے خریدے کہ سردیوں کے دن تھے اور بمبئی میں چلغوزے بڑی عزت و احترام اور رغبت سے کھائے جاتے تھے اور یہ کہ یہ میوہ وہاں ناپید تھا اور شاید ہی کوئی اس کے نام سے بھی واقف تھا۔

بمبئی ایئرپورٹ پر ایسی کوئی خاص چیز نہیں تھی جسے یاد رکھا جاتا، چنانچہ کچھ یاد نہیں۔ البتہ کسٹم کے اہلکاروں کا حیرت و استعجاب سے چلغوزوں کا معائنہ کرنا یاد ہے۔ پوچھا کہ کیسے کھایا جاتا ہے، میں نے مونگ پھلی کی طرح چھیل کر دکھایا، منہ میں جاتے ہی اس افسر کی گردن ستائش میں ہلنے لگی۔ یہاں عام طور پر جذبات کا اظہار گردن ہلا کر [illegible]

کی گردن ہلنے سے بعض اوقات اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بات سے راضی ہے یا نہیں۔ خیر جی، اس نے بڑی لجاجت سے پوچھا کہ اسے کچھ دانے مل سکتے ہیں۔ میں نے دو مٹھی بھر چلغوزے ان دونوں کے حوالے کیے، میرے سوٹ کیس میں بغیر سلے کپڑے، پرفیوم دیگر تحائف تھے اور سب سے بڑھ کر میری جیب میں ڈالروں کی تعداد ڈیکلیئر کی گئی تعداد سے زیادہ تھی۔ یاد نہیں کس نے اور کیوں مشورہ دیا تھا کہ زیادہ ڈالر نہیں دکھانا۔ چلغوزوں نے اپنا کام دکھایا اور کسٹم والوں نے خوشدلی سے مجھے باہر کا راستہ دکھایا۔

باجی، آزاد بھائی (میرے خالہ زاد بھائی اور بہنوئی) آزاد سے چھوٹا فوزان، میری چھوٹی خالہ کی بیٹی نور اور ان کے شوہر ایئرپورٹ سے باہر میرے منتظر تھے۔ باجی ہمارے آبائی قصبے اورن سے آئی تھیں جو ضلع رائے گڑھ کا حصہ تھا۔ رائے گڑھ چند سال پہلے ڈسٹرکٹ کولابہ کہلاتا تھا۔

نور بمبئی میں ہی رہتی تھی اور ان کے ابا یعنی میرے چھوٹے خالو، اے سلام، (عبدالسلام) فلم ڈائریکٹر تھے اور تقدیر، جرمانہ، سلاخیں اور آخری داؤ نامی فلموں کی ہدایات دے چکے تھے۔

"ارے تم کتنے بڑے ہو گئے۔"

"اور تم کتنی موٹی ہو گئیں۔"

اس قسم کے مکالموں کے دوران میں سب سے ملتا رہا۔ آج سے بیس سال پہلے یہاں آیا تھا جب میں آٹھ سال کا چھوٹا سا موٹا آلو پلپلا کہلاتا تھا۔ نور میری ہم عمر تھی اور بڑی نازک اندام ہوا کرتی تھی۔

"تم اب کچھ سدھرے یا نہیں؟" یہ میرے پچھلے دورے کے حوالے سے سوال تھا۔

سن باسٹھ میں جب میں امی کے ساتھ اپنے سب سے چھوٹے ماموں کی شادی میں آیا تھا اور ہم یہاں چھ ماہ رہے تھے، میں نے اس قصبے میں خاصی شہرت کمائی تھی۔ اس کا قصہ یوں کچھ یوں کہ محلے میں جب کوئی واردات ہوتی مثلاً کسی کی گائے کو کسی نے دھپ لگادی، کسی بچے کی چٹیا پیچھے سے کھینچ کر کوئی بھاگ گیا، کسی پانی بھرنے والی "کولی" عورت کے مٹکے کا کسی نے تاک کر پتھر سے نشانہ لیا، کسی کے گن میں تازہ اتارا ہوا کیلوں کا گچھا کوئی غائب کر گیا، کسی ہندو لڑکے کو بے سر سڑک پچھاڑ کر کوئی بھاگ گیا تو ہر اس طرح [illegible]

"پاکستان سے آیا ہوا چھوکرا" ٹھہرایا جاتا۔ مجھے اب بھی یقین ہے کہ ان میں سے اکثر الزامات غلط تھے لیکن بد اچھا بدنام برا...... یہ سارے قصے پھر کبھی سناؤں گا۔

کچھ دیر بعد نور اور سہیل بھائی (ان کے میاں) نے جلد ان کے ہاں آنے کا وعدہ لے کر اجازت چاہی اور ہم نے آزاد بھائی کی "ایمبیسڈر" میں اورن کا رخ کیا۔ یہ ایمبیسڈر بھی خوب گاڑی تھی۔ نہایت کشادہ، دروازوں میں لیور نما ہینڈل، ٹرک جتنا اسٹیئرنگ اور سب سے نمایاں اس کا بھونپو۔ جی ہاں گاڑی میں ہارن تھا لیکن ڈرائیور کی جانب والی کھڑکی کے باہر ایک بھونپو بھی لگا ہوا تھا اور یہ یہاں اکثر گاڑیوں، خاص کر "ٹمپو" میں نظر آیا۔ ٹمپو یہاں وین، ویگن یا منی بس کو کہتے ہیں۔

بمبئی سے اورن تقریباً ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ ہے۔ سمندری راستے سے یہ صرف پینتالیس منٹ کا سفر رہ جاتا ہے۔ پرانی لانچوں اور کار رکھ لانچوں میں اورن کی جانب سفر کرتے ہوئے داہنے ہاتھ پر "ایلیفنٹا" کے غار (Elephanta Caves) نظر آتے ہیں جہاں قدیم زمانے کی مورتیاں اور مجسمے، بمبئی آنے والے سیاحوں کی توجہ کا مرکز ہیں لیکن ہمارے اورن کے رشتہ داروں میں سے شاید ہی کسی نے انہیں دیکھا ہو، گو کہ ان میں سے بہت سے تقریباً روز ہی اس راستے سے سفر کرتے ہیں۔ وجہ ایک ہی ہے "مندروں اور مورتیوں سے ہمیں کیا لینا" چاہے تاریخی ہی کیوں نہ ہوں۔

لیکن ہم سڑک کے راستے سے اورن جا رہے تھے۔ بمبئی سے واشی یعنی نیو ممبئی جانے والی سڑک پر سوائے لوگوں کے اژدحام کے ایسی کوئی چیز نہیں تھی جو ایک سیاح کی متلاشی اور متجسس نظروں کا مرکز بنتی۔ آس پاس کی کالی زرد سیاہ اور دھواں آلود کائیں ہوں، ورکشاپ اور مختلف قسم کے خراد کے کارخانے، اپنے [illegible] پاڑہ یا گولیمار سے مشابہ تھے۔ یہاں رنگ و روغن کا رواج زیادہ نہیں کہ بارشیں تیز ہوتی ہیں اور دیواروں پر کائی جم جاتی ہے۔ کہیں کہیں جھونپڑ پٹی کا لامتناہی سلسلہ نظر آتا تو اچانک کوئی جدید بلند و بالا عمارت نظر آتی۔ نئی عمارتوں کی دلکشی آس پاس کے ماحول میں کہیں گم ہو کر رہ جاتی۔

"لوٹ جاتی ہے ادھر کو بھی نظر کیا کیجیے"

ان ورکشاپوں اور کارخانوں میں کام [illegible]

میں نظر آتے تھے یا پھر سروں پر کیلوں کے ٹوکرے رکھے سیاہ رنگت والی کوئی عورتیں تھیں جن کے ساڑی باندھنے کے انداز سے ان پر نظر پڑتی۔ یہ عجیب، واہیات سا انداز ہے، ساڑھی کا اگلا پلو، ٹانگوں کے بیچ سے پیچھے کی جانب نکال کر کمر میں اڑس لیا جاتا ہے، لنگوٹ کے سے انداز کی یہ ساڑی "دھوتی ساڑی" بن جاتی ہے۔ اکثر نے اپنے جوڑوں میں بیلے کے گجرے گوندھے ہوئے تھے۔ ان گجروں کے علاوہ دلکشی کا اور کوئی سامان ان میں نہیں تھا۔

آزاد بھائی کا کزن شمیر، ایمبیسڈر چلا رہا تھا اور مشاقی سے لوگوں، ہاتھ گاڑیوں، آوارہ پھرتی گایوں کے درمیان سے راستہ بناتا جاتا تھا اور اب ہم بمبئی سے باہر آتے جا رہے تھے۔ کچھ دیر بعد واشی کے قریب سے گزر ہوا۔ یہ نسبتاً نیا اور کھلا علاقہ تھا اور اس میں کراچی کے مضافات کی مشابہت تھی۔ اورن کے راستے میں نمبرا، چوبل اور جنجیرہ آتے تھے۔ جی ہاں وہی جنجیرہ جس کی ایک نواب زادی عطیہ فیضی نے ایک عالم پر اپنا سحر طاری کیا ہوا تھا جس کے مداحوں میں علامہ اقبال اور علامہ شبلی نعمانی جیسے نام بھی تھے۔

میں بیس سال بعد بمبئی آیا تھا لیکن سارے راستے میں کہیں تجسس نہ ہوا کہ آس پاس کے مناظر دیکھوں۔ راستے بھر، بہن، بہنوئی اور خالہ زاد بھائی سے باتیں کرتے، مغرب سے چند گھڑیوں بعد ہم آزاد بھائی کے حویلی نما گھر کے سامنے تھے۔

اب ذرا خالہ اور گھر والوں سے مل لوں۔ نہا دھو کر سفر کی تکان اتار لوں پھر آگے کا قصہ سناتا ہوں۔

آزاد بھائی کا گھر "اورن" کے بڑے گھروں میں سے ایک تھا۔ یہ ایک بڑی سی حویلی تھی لیکن جتنی وسیع و عریض یہ حویلی تھی اس سے کہیں زیادہ لوگ اس میں رہتے تھے۔ بڑے خالو (خالو ابا) ان کے بھائی، ان کے چچا زاد بھائی، ان کی اولادیں، اولادوں کی اولادیں، یعنی تین چار نسلیں اور ان کی شاخیں یہاں رہ رہی تھیں اور کوئی حویلی چھوڑ کر جانے کو تیار نہیں تھا۔ چنانچہ ہر نئے نکاح کے بعد کسی کمرے میں لکڑی کی ایک پارٹیشن نما دیوار ڈال کر ایک اور کمرا بن جاتا۔ ایک کمرے میں کئی کمرے تھے۔ ہر بڑے کمرے کے ساتھ ایک غسل خانہ ہوتا لیکن پوری حویلی کا بیت الخلا صرف ایک تھا جو چھت پر تھا اگر آدھی رات کو تقاضائے بشریت سے مجبور ہو کر جانا ہوتا تو کئی کمروں سے گزر کر جانا ہوتا اور چند ایک سوالوں کے جواب میں بتانا پڑتا کہ کیا صورت حال پیش آئی ہے۔ "چھوٹے موٹے" کام کمروں سے ملحق غسل خانے ہی میں انجام دے دیے جاتے اور یہ یہاں کا عام رواج تھا۔

اس حویلی کی بیٹھک البتہ بڑی وسیع اور آراستہ تھی۔ یہ قدیم وضع کا فرنیچر، ظروف اور حویلی کا سب سے قیمتی اثاثہ یعنی "جھومر" بھی اسی بیٹھک میں تھا۔ یہ بیلجیم کٹ گلاس کا بنا ہوا ایک بھاری بھرکم، قدیم اور بے حد قیمتی فانوس تھا۔ یہ دیوان خانہ اور فانوس پورے خاندان کی مشترکہ ملکیت تھا اور صرف شادی بیاہ اور میت کے موقع پر اسے کھولا جاتا تھا۔ جن بھائیوں کے مکانوں کے حصے باہری جانب تھے وہاں ان کی ایک چھوٹی سی مردانہ بیٹھک بھی تھی۔ ایسی ہی ایک بیٹھک بڑے خالو کی بھی تھی۔

"ارے آگیا بابوا"

آزاد بھائی سوٹ کیس اتروا رہے تھے اور میں خالہ اماں کے گلے سے لگا ہوا تھا۔ انہوں نے میری پیشانی جھکا جھکا کر بوسہ دیا۔ "زلیخا کیسی ہے۔" مجھے دیکھ کر خالہ اماں کو اپنی بہن یاد آگئی۔

"ارے دیکھیں، زلیخا کا بابو آیا ہے۔" یہ اطلاع قطعاً غیر ضروری تھی کیونکہ کار رکنے کی آواز سن کر سب ہی خالو بھی نیچے ہی آرہے تھے۔ میں نے سلام کیا اور جھجکتے ہوئے ان کی طرف بڑھا۔ بیس سال پہلے جب میں یہاں آیا تو ان کا بڑا رعب تھا۔ ہم بچے انہیں آتا دیکھ کر کھیل روک دیتے اور ادھر ادھر ہو جاتے۔ میں بھی ان کے سامنے نہ جاتا تھا، میری شہرت بھی ان دنوں وہاں بہت اچھی نہ تھی۔

"کیسے ہو بابو۔" خالو نے ہاتھ بڑھایا تو میں ان کے سینے سے لگ گیا۔ وہ شرارت اب ڈھل چکی تھی اور میں بھی اب بچہ نہیں، اٹھائیس سال کا منگنی شدہ جوان تھا۔

بھائی جان (بڑے بھائی) نے انگریزی میں خیریت پوچھی۔ پھر خالہ زاد بہنوں کا تعارف شروع ہوا۔ سب نے آگے بڑھ کر ہاتھ ملایا۔ یہ رواج اس وقت تک کراچی میں نہیں تھا۔

"جاؤ، ہاتھ دھو لے، پھر کھانا نکالتے ہیں۔" خالہ اماں نے کہا۔

میں نہانا چاہتا تھا مگر یہاں وقت بے وقت نہانے کا رواج نہیں تھا کہ پانی ہر وقت نہیں آتا تھا۔

ادھر کھانا ختم ہوا، ادھر حویلی سے ملحق مسجد سے عشا کی اذان بلند ہوئی۔ خالو ابا مسجد کی طرف چلے اور میں بھائی جان کے سوالات کا جواب دینے لگا۔ کچھ دیر بعد باجی نے حویلی کے دوسرے مکینوں سے ملوانا شروع کیا۔ یہ وہ تھے جو خالو ابا کے حصے میں رہتے تھے۔ یعنی ان کے بھائی وغیرہ۔

☆☆☆

"سنا ہے راجا کا بیٹا آیا ہے؟" دروازے پر آواز آئی۔

"ہاں، ہاں بلاتا ہوں۔" یہ آزاد بھائی کی آواز تھی۔

اور کچھ دیر بعد میں تین بزرگوں کے سامنے تھا۔ یہ ابا کے بچپن کے ساتھی تھے۔

"تمہیں تمہارے دادا کا نام دیا ہے ناں!"

میرے دادا کا بھی یہی نام تھا اور میرے ابا کا نام بھی ان کے دادا کے نام پر رکھا گیا تھا۔ ہماری چار نسلوں نے ناموں کے معاملے میں بڑی کفایت سے کام لیا تھا۔

"جی" میں نے سر جھکا کر کہا۔

"تمہارے دادا تو بس ضد میں چلے گئے تھے پاکستان۔ یہاں اچھا بھلا کام چل رہا تھا ان کا لیکن انہیں تو بس جناح صاحب اور مسلم لیگ کی پڑی رہتی تھی۔ منشی صاحب آئے تھے پچھلے دنوں کراچی سے۔ وہ تو کہتے تھے میں ایک گھر یہاں خرید لوں گا۔"

"منشی صاحب ایسا کہتے تھے تو بڑے ناشکرے تھے۔" اس بار میری گردن جھکی ہوئی نہیں تھی۔

منشی صاحب کراچی میں ہماری برادری کے خوش حال ترین فرد تھے اور میرے ابا کے بچپن کے دوست تھے۔ ہندوستان میں تھے تو کچھ نہیں تھے۔ کراچی آئے تو دھن برسنے لگا۔ مٹی کو ہاتھ لگاتے تو سونا بن جاتی۔ جس پاکستان نے انہیں سب کچھ دیا، اسے چھوڑ کر اپنے اس گاؤں کی تعریف کرتے تھے جہاں کبھی اسکول کی فیس دینا بھی ان کے لیے مشکل تھا۔

تینوں بزرگوں نے تکدر سے میری طرف دیکھا۔ راجا کے بیٹے سے انہیں اس لہجے اور بدتمیزی کی امید نہیں تھی۔ میرے ابا بہت دھیمی طبیعت اور ہر ایک کا احترام کرنے والے انسان تھے۔ دھیمے لہجے میں وہ بولتے تو ان کی بات سننے کے لیے کان لگانا پڑتا اور ان ہی راجا صاحب کا بیٹا بزرگوں کی بات کاٹ رہا تھا۔

اب تک میں باجی، خالہ اماں، خالو ابا اور خالہ زاد بہن بھائیوں کی محبت کے شیرے میں لتھڑا ہوا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ چھٹی پر اپنے گھر آیا ہوں اور امی، ابا، بہن بھائی آس پاس بیٹھے ہیں۔

اب اچانک احساس ہوا کہ میں ہندوستان میں آگیا ہوں۔ وہ ہندوستان جس میں کبھی پاکستان بھی شامل تھا اور جس سے الگ ہو کر ہم نے ایک اپنا ملک بنا لیا تھا اور یہ کہ وہ اب بھی ان کے سینے میں کانٹے کی طرح کھٹکتا ہے۔

"آپ پاکستان گئے ہیں کبھی؟" میں نے نرم آواز میں پوچھا، میرا لہجہ لیکن میری آواز کا ساتھ نہیں دے رہا تھا۔

"نہیں، ہمیں کرنا بھی کیا ہے وہاں جا کر۔ ہمارے رشتہ دار آتے رہتے ہیں، وہ تو بڑے خوش ہوتے ہیں یہاں آکر۔"

"جی مجھے بھی بہت اچھا لگا یہاں آکر لیکن ایک بار آپ پاکستان آکر دیکھیں۔"

"کیا ہے کراچی میں؟" یہ بزرگ اب تک خاموش بیٹھے تھے۔

"آپ پاکستان آئیں، آپ کو اندازہ ہوگا کہ آزاد ملک کسے کہتے ہیں۔"

خالو ابا نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ مہمان بزرگوں کے چہرے تمتمائے ہوئے تھے، سوچ رہے تھے کہ کس قدر گستاخ اور منہ پھٹ لڑکا ہے راجا کا؟

"یہاں آپ کو مکان لینے سے پہلے دیکھنا پڑتا ہے کہ آس پاس مسلمانوں کی آبادی ہے یا نہیں۔ پاکستان میں ہمیں ایسا کچھ نہیں سوچنا پڑتا۔"

میں سعودی عرب اور بحرین میں چھ سال سے کام کر رہا تھا اور میرے بہت سے ہندوستانی مسلمان دوست تھے۔ میرا ہوم ورک مکمل تھا۔

"اور یہاں وہی مسلمان خوشحال ہیں جو اسمگلنگ وغیرہ کے دھندے میں ہیں یا کانگریس پارٹی کے ممبر ہیں۔" میں نے ہندوستانی فلمیں بھی دیکھ رکھی تھیں اور حاجی مستان جیسے کرداروں سے بھی واقف تھا۔

"باتوں کا حال تو برا ہی رہتا ہے۔"

"عبدالرؤف، ہم چلتے ہیں۔" تینوں بزرگ ایک ایک کر کے اٹھ کھڑے ہوئے۔ خالو ابا خاموشی سے اندر چلے گئے۔

آزاد نے میری کمر میں ہاتھ ڈالا اور کھینچتے ہوئے دوسرے کمرے میں لے گئے۔

"ارے یہ تو نے کیا کر دیا؟"

"کیا ہوا؟"
"ان میں سے جوشی صاحب کے چچا زاد بھائی ہیں وہ اسمگلنگ کے کیس میں اندر ہو چکے ہیں اور اب کانگریس جوائن کرلی ہے، معیت سے بچنے کے لیے۔"
"ایسا ہے تو اچھا ہی ہوا۔ مجھے معلوم ہوتا تو شاید میں مروت کے مارے خاموش رہتا اور وہ میرے دادا اور ابا کی غلطیاں گنواتے رہتے۔ دفع کرو ان کو، چلو خالہ اماں کے پاس چلتے ہیں۔"
رات کا کھانا کھا کر ہم بیٹھک میں بیٹھے تھے۔ میرے پچھلے دورے کی باتیں ہو رہی تھیں جب میں آٹھ سال کا تھا۔ میری حرکتوں کا ذکر ہو رہا تھا اور قہقہے لگ رہے تھے۔
"اگر ہمت ہے تو خالد ماموں کے ہاں چلیں۔" آزاد نے پوچھا۔
"کیا خیال ہے، صبح سب سے مل لیں۔"
"کل بمبئی جا کر ریزرونگ کرانی ہے۔ زوبیہ کو خالہ جان کے پاس بھی جانا ہے۔ کچھ آج مل لیتے ہیں۔ صبح ماموں صاحب سے بھی ملنا ہے۔" آزاد بھائی نے پروگرام بتایا۔
ہم خالد ماموں کی طرف جا رہے تھے۔ میری امی سے چھوٹے یہ درویش صفت اور سادہ طبیعت ماموں "اوران" کے نواح میں ایک چھوٹا سا مقام پر رہتے تھے جو "بگلا" کہلاتا تھا۔ یہاں سبزے سے ڈھکے پہاڑی ٹیلے اور دور تک پھیلی ہریالی کا غلاف اوڑھے میدان ہوتے تھے۔ میدان میں جگہ جگہ چنار کے درخت تھے۔ پت جھڑ کے دنوں میں یوں لگتا کہ سبزے پر پنکھڑیاں بکھری ہوئی ہیں۔ میدان کے بیچ سے گزرتی سڑک کے کنارے آم کے درخت تھے، جہاں بچپن میں، میں نے سڑک سے اٹھا کر ایک آم کھایا تھا اور اس کی مٹھاس اب تک لبوں پر محسوس کرتا تھا۔ یہاں کسی کی درگاہ تھی اور ہم اسی درگاہ پر آتے تھے۔ یہیں اوران کا واحد سینما گھر تھا جس کے ساتھ والے میدان میں ایک صاحب نے پانچ دن سائیکل چلائی تھی اور میں بھائی جان (اسمٰعیل بھائی) کے ساتھ یہ تماشا دیکھنے آیا تھا۔
لیکن اب یہ سب کچھ نہیں تھا۔ رات میں ویسے بھی ہریالی نظر نہ آتی تھی اور جہاں میدان تھے اب وہاں بے تحاشا چھوٹے بڑے مکان بن گئے تھے۔ خالد ماموں بھی یہیں رہتے تھے۔
[illegible]
دی جو اندر نماز پڑھ رہے تھے۔
ماموں نے میرے رخسار پر بوسہ دیا اور ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ میرے یہ ماموں امی سے سب سے زیادہ قریب تھے اور انہیں بہت چاہتے تھے۔
"آپا کیسی ہیں۔ انہیں بھی ساتھ لاتے ناں۔" ماموں آنسو پونچھتے ہوئے بولے۔
"سعید کھانا نکالو۔ بابو اور آزاد بھی کھائیں گے۔"
"نہیں ماموں ہم کھا کر آئے ہیں۔ ہم زیادہ دیر نہیں بیٹھیں گے۔ صبح بمبئی جانا ہے۔" آزاد نے بتایا۔
گھر واپس پہنچ کر خالو ابا کے بھائی کے کمرے میں نوزان کے ساتھ میرا بستر لگا دیا گیا۔ خالو ابا کے یہ بھائی بمبئی میں رہتے تھے لیکن گھر میں ان کا حصہ موجود تھا۔ نوزان ریاض (سعودیہ) سے کما کر واپس آ گیا تھا۔ ہم دونوں ہم عمر تھے۔ دیر تک باتیں کرتے رہے۔ نوزان پر غنودگی طاری ہو رہی تھی اور میں اوران کے مچھروں سے لڑ رہا تھا۔ مچھر کراچی میں بھی کم نہ تھے لیکن اوران اور کراچی کے مچھروں میں وہی فرق تھا جو آسٹریلین اور پاکستانی گائے میں ہوتا ہے۔
یہ البتہ آسانی تھی کہ جب کوئی بھاؤ ایک آدھ مچھر ضرور زد میں آتا لیکن کانوں میں ان کی بھن بھن سے شدید الجھن ہو رہی تھی۔
پھر ہوا کچھ یوں، نیند بہرحال آ کر رہتی ہے۔ سو آ ہی گئی۔
☆☆☆
"پاسپورٹ لینا نہ بھولنا۔" آزاد بھائی نے تلقین کی۔
آزاد بھائی ہر کام ناپ تول کر اور ڈسپلن کے ساتھ کرنے کے عادی ہیں۔ انہوں نے پورا پروگرام ترتیب دیا ہوا تھا کہ کب کہاں جانا ہے اور کس سے ملنا ہے۔
میرے چار ماموں اور تین خالائیں... ان کی اولادیں... ان کے بچے، اوران اور بمبئی میں رہتے تھے۔ اتنے کم عرصے میں سب سے ملنے کے لیے ترتیب کی واقعی ضرورت تھی۔ آزاد بھائی نے میرے "ٹور گائیڈ" کا کام سنبھالا ہوا تھا۔
یہ کہانی کچھ طویل ہو جائے گی لیکن سب سے ملاقات کا احوال بیان کیے بغیر یہ داستان مکمل نہ ہوگی۔ میں ان ہی [illegible]
اب نہ کوئی ماموں رہے نہ خالہ۔ بہت سے خالہ زاد اور ماموں زاد بہن بھائی بھی اب نہیں رہے۔
ناشتے کے بعد ہم ماموں صاحب کی طرف جا رہے تھے کہ کسی گھر کی کھڑکی کھلی اور کسی بڑی بی نے آزاد کو آواز دی۔ یہاں تمام گھروں میں ہماری برادری اور رشتے دار رہتے تھے۔
"یہ بی بی جان کا بابو ہے، شہناز کا بھائی۔" آزاد بھائی نے تعارف کروایا۔
"ارے اندر آؤ۔"
آزاد ناں ناں کرتے رہ گئے اور بڑی بی نے دروازہ کھول دیا۔
"ارے ہاں۔ یاد آیا انہوں نے آپ کو بہت سلام کہا تھا۔" میں نے ہوا میں تیر چلایا۔
بڑی بی خاموش ہو گئیں اور کسی سوچ میں گم ہو گئیں۔ پھر کچھ دیر بعد اٹھیں۔ "میں چائے لاتی ہوں۔"
"ہم ناشتا کر کے چلے ہیں۔"
"اچھا کافی پی لو۔"
ماموں صاحب کے ہاں پہنچنے سے پہلے ہم کم از کم تین گھروں سے کافی، شربت اور چائے پی چکے تھے۔ ماموں صاحب میری امی سے بڑے اور خالہ اماں سے چھوٹے ہیں۔ ان کا بڑا سا فارم ہاؤس تھا جسے یہاں "واڑی" کہتے ہیں۔ اس فارم میں سبزیوں، پھلوں، پھولوں کے درختوں اور پودوں کے علاوہ بڑی تعداد میں کیلے، ناریل اور تاڑ کے درخت تھے۔ تاڑ ایک عجیب و غریب پھل ہے جس سے شاید کراچی میں کوئی واقف نہیں، جیسے بمبئی والے چلغوزوں سے واقف نہیں تھے۔ یہ لیچی کی طرح ایک نرم سا شفاف سا پھل ہوتا ہے۔ اس کی لفظی تصویر کشی سے یہ عاجز جاں معذور ہے۔ یہ نرم سا پھل ہے جس کی دو رنگیں ہوتی ہیں۔ پرتوں کے بعد زرد گودا ہوتا ہے اور گودے کے اندر گٹھلی پکنے سے پہلے گٹھلی میں نہایت مفرح اور شیریں پانی ہوتا ہے جو عام طور پر پکے اور نو خیز تاڑ گولوں میں ہوتا ہے۔ زیادہ پک جانے کے بعد گودا گہرا زرد ہو جاتا ہے اور اس میں سے پانی غائب ہو جاتا ہے پانی ہم کر کر اسپرٹ گٹھلی میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ یہ اپنی لطافت اور مٹھاس بھی کھو دیتا ہے۔ خشک ہو جانے کے بعد یہ سخت ہو جاتا ہے، جس سے قمیص کے بٹن وغیرہ بھی بنائے جاتے [illegible]
شاید کچھ دوستوں کو یاد ہو کہ سن اسی میں جب ہندوستان اور بنگلہ دیش سے چھالیا آنا بند ہو گئی تھی تو پان کے شوقین اسمگل شدہ تاڑ گولوں کی گری بطور چھالیا استعمال کرتے تھے۔
فارم کے ایک گوشے میں ماموں کی رہائش تھی۔ یہ چھوٹا سا بنگلا نما گھر تھا جس کے ایک حصے میں ماموں صاحب کا دفتر تھا، اسی فارم ہاؤس میں ایک ڈیری فارم بھی تھا اور ماموں اس وقت مقامی، دودھ کے کاروباریوں سے مراٹھی میں حساب کتاب میں مصروف تھے۔ مجھے اور آزاد کو آتا دیکھ کر فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔ یہ میرے ماموں بڑی رنگ شخصیت کے مالک تھے لیکن اپنے۔ سینے سے لگا کر جب انہوں نے میرے گال چومے تو لگا کہ میں وہی آٹھ سال کا بچہ بن کر چھاتی سے لگا ہوا ہوں اور یہ بھی عجیب سا تجربہ تھا۔ چھٹیوں سے واپس آتا تو ابا مجھے پیار کرتے لیکن کسی اور کے ساتھ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ یہاں جب ماموں اور خالائیں پیار کرتیں تو میں اپنے آپ کو چھوٹا سا بچہ محسوس کرتا اور ان سب کے نزدیک تو میں "زلیخا کا بابو" ہی تو تھا۔ محبت کے یہ دریا اب سوکھ چکے لیکن اس پیار کی نرمی، مٹھاس اور حدت آج بھی یاد آتی ہے تو حلق میں کچھ گھٹتا ہوا سا لگتا ہے۔ اس دورے کی اگر سب سے حسین کوئی یاد ہے تو وہ یہی پیار ہے جو ہندوستان میں ملا اور بے تحاشا ملا۔
☆☆☆
آٹو رکشا "سوریا" کی طرف جا رہی تھی۔ یہ سمندر کا کنارا تھا جہاں بمبئی جانے کے لیے لانچیں لگی تھیں، مقامی زبان میں اسے "دھکا" کہتے ہیں۔ میں رکشا سے باہر گردن نکال کر اوران کی گلیوں اور بازاروں کو دیکھتا جا رہا تھا۔ یہ قصبہ بمبئی والوں کے لیے پکنک کا مقام تھا جیسے ہم کراچی والے پکنک کے لیے منوڑا جاتے ہیں۔
بمبئی میں "گیٹ وے آف انڈیا" سے سمندر کے اس پار دیکھیں تو درختوں اور سبزے سے گھری پہاڑیاں نظر آتی ہیں۔ یہ اوران کا "کرنجا چ" والا علاقہ ہے۔ اوران ایک جزیرہ نما ہے اور تین طرف سمندر سے گھرا ہوا ہے۔ یہ بنیادی طور پر ماہی گیروں کی بستی ہے جہاں کی اسی فیصد آمدنی ماہی گیری سے حاصل ہوتی ہے۔ بمبئی کو مچھلی اوران کے ہی "کولی" سپلائی کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کھیتی باڑی جس میں چاول کی کاشت نمایاں ہے، بھی اوران کی معیشت کا [illegible]

ساحل کے ساتھ ساتھ کھیتوں کی طرح منڈیریں بنا کر سمندری پانی کو خشک کر کے نمک حاصل کیا جاتا ہے۔ میرے دونوں بڑے ماموں، خالو ابا اور سب سے چھوٹے خالو بھی اس کاروبار سے منسلک تھے۔ نمک کے ذخیروں کو "اگر" کہا جاتا ہے۔ یہ کاروبار اب ختم ہو چکا ہے کیونکہ یہاں جواہر لال نہرو پورٹ (جو ایشیا کا سب سے بڑا کنٹینر ٹرمینل ہے) کی تعمیر کے لیے حکومت نے ان "اگروں" پر قبضہ کر لیا اور پچھلی تین عشروں سے اوران والے معاوضے کے لیے حکومت سے برسرپیکار ہیں۔

"مورا" میں ایک طویل پل نما پلیٹ فارم ہے جو لانچوں میں سوار ہونے کی جگہ "دھکا" تک جاتا ہے۔ اس پل سے کچھ دور پہلے ہم رکشا سے اتر گئے۔ کوئی مرد اور عورتیں سروں پر مچھلی، کیلوں اور بیلے کے گجرے کے ٹوکرے دھرے لانچوں کی جانب جا رہے تھے اور ہمیں ایک نہایت کریہہ المنظر شے سے بچتا ہوا چلنا تھا۔ یہ سیاہ رنگت والے سور اور ان کے بچوں کے غول تھے جو بیروں سے لپٹتے چلتے تھے۔ یہ غلیظ جانور میں نے کراچی، بحرین یا سعودی عرب میں نہیں دیکھا تھا۔

پل سے نیچے سیڑھیاں اتر کر لانچ کی جانب جا رہے تھے کہ پروین مل گئی۔ پروین میری سب سے چھوٹی خالہ کی بیٹی تھی جو بمبئی سے آ رہی تھی۔ پروین مجھ سے چھوٹی تھی اور جب میں یہاں بچپن میں آیا تھا تو نہ جانے کس وجہ سے میں اپنی امی اور بہن بھائیوں سے الگ، خالہ کے پاس رہتا تھا۔ امی وغیرہ نانا کے پاس رہتے تھے۔ ہم سارا دن گھر میں ساتھ کھیلتے، کبھی سیڑھیوں پر سے گھسٹتے نیچے آتے تو کبھی پیچھے بنے ہوئے بھینسوں کے باڑے میں گائے بھینسوں کے بچوں سے کھیلتے۔

پروین بڑی گوری چٹی تھی اور اس کی بڑی بڑی آنکھیں شرارت سے بھرپور ہوتیں۔ میں جب (سن باسٹھ) میں کراچی واپس آیا تو میرے چھوٹے چچا نے پوچھا۔ "وہاں کون دوست تھے تمہارے؟" اور میں نے پروین کا نام لے دیا۔

"اوہو... پروین تھی۔"

اور اس کے بعد سالہا سال تک چچا مجھے اس نام سے چھیڑتے رہے۔ آج وہ پروین میرے سامنے ایک موٹی تازی خاتون کی شکل میں کھڑی تھی۔ مٹاپے کے سبب اس کی عمر زیادہ نظر آتی تھی اور وہ مجھ سے بہت بڑی لگ رہی تھی اور وہ بڑی تھی بھی، کیونکہ وہ اب شادی شدہ تھی اور میری ابھی منگنی ہی ہوئی تھی۔ سیڑھیوں پر سے سامان سروں پر رکھے لوگ آ جا رہے تھے۔ ہم نے جلد ہی ایک دوسرے کو خدا حافظ کہا۔ پروین کو میں نے اس کے بعد آج تک کہیں دیکھا۔

"اصغری" نام کی لانچ میں مچھلیوں اور سبزیوں کے ٹوکروں کو ایک طرف رکھ کر چند مسافر تو آلتی پالتی مار کر فرش پر بیٹھ گئے اور تاش کے پتے بانٹنے لگے اور میں سمندر کا نظارہ کرنے لگا۔ دور دائیں جانب "ایلیفینٹا" کی پہاڑی نظر آ رہی تھی۔ جس کے غاروں اور مورتیوں کے بارے میں پہلے بتا چکا ہوں۔

گیٹ وے آف انڈیا سے کچھ آگے "بھاؤ کے دھکے" کے پاس ہم لانچ سے اترے اور باہر آ کر ٹیکسی روکی۔

"کرافورڈ مارکیٹ" آزاد نے ٹیکسی والے کو بتایا اور ہم بمبئی شہر کی طرف روانہ ہوئے۔

گیٹ وے آف انڈیا سے کرافورڈ مارکیٹ کا فاصلہ کچھ ایسا طویل بھی نہ تھا لیکن لگتا تھا کہ شاید یہ فاصلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ پیدل چلنے والوں کا اژدہام، ہاتھ گاڑیاں، ٹیکسیاں، کاریں، بسیں۔ مجھے جوڑیا بازار یاد آ گیا۔ وہاں کچھ ایسا ہی نقشہ ہوتا تھا۔

پھر کچی ہی ایک سرکاری عمارت کے سامنے ٹیکسی رکوا کر آزاد بھائی نے میٹر دیکھ کر ڈرائیور کو بتایا کہ کتنے پیسے بنے۔ ڈرائیور نے ڈیش بورڈ سے ایک چھوٹے سے گتے پر بنے چارٹ پر دیکھ کر بتایا کہ اب اتنے پیسے ہوئے ہیں۔ دراصل حال ہی میں ٹیکسی کے نئے کرائے مقرر ہوئے تھے لیکن میٹر ابھی تک پرانے حساب سے چل رہے تھے۔ آزاد نے چند نوٹ نکالے اور ڈرائیور نے بقیہ کی ریزگاری آخری پیسے تک واپس کی اور میں اس کی شکل دیکھتا رہ گیا۔ یاد آیا کہ کراچی میں اگر میٹر آٹھ روپے پچاس پیسے دکھا رہا ہے اور آپ نے دس کا نوٹ دیا تو رکشا والا آپ کی جانب دیکھے بغیر آگے نکل جائے گا اور یہ شاید ایک غیر تحریری معاہدہ تھا کہ مسافر بھی امید نہیں رکھتے تھے کہ بقیہ پیسے واپس ملیں گے اور یہ تب کی بات تھی جب ہم تھوڑے بہت تہذیب یافتہ تھے اور ہمارے ہاں بھی رکشا ٹیکسی میں میٹر ہوا کرتے تھے۔ میں جب دلی آیا تو یہاں میٹر نہیں ہوتے تھے لیکن اب کوئی ٹیکسی میٹر کے بغیر نہیں ہے اور اگر کبھی میٹر خراب ہوا تو آپ

کا سفر طے ہے۔ ہمارا سفر الٹے قدموں چل رہا ہے۔ خیر بہ سبیل تذکرہ ایک بات اور سن لیں۔

"وہاں صرف بمبئی کا خالہ جان کے گھر کا پتا لکھوانا۔ اور ان کا ذکر نہ کرنا۔" آزاد بھائی نے سرگوشی میں ہدایات دیں۔

"وہ کیوں؟"

"بمبئی تک ہم لوگ نکلیں گے اجمیر، جے پور اور آگرہ کے لیے۔ بمبئی میں کوئی گھر آ کر انکوائری نہیں کرتا کہ یہاں اتنے سارے پاکستانی رپورٹ کرتے ہیں۔ اگر کوئی آیا بھی تو کہہ سکتے ہیں کہ باہر فلم وغیرہ دیکھنے گیا ہے لیکن اوران چھوٹی سی جگہ ہے اور وہاں تم سب کی نظروں میں رہو گے۔ ہر بار جب اوران سے نکلو اور واپس آؤ تو رپورٹ کرنا ہوگی۔ وقت بھی بہت ضائع ہوگا۔ تمہارے پاسپورٹ پر صرف بمبئی اور پونے کا اندراج ہے۔ تمہیں اجمیر وغیرہ نہیں جانے دیں گے۔" آزاد نے مجھے نئی خبر سنائی کہ پورا خاندان اجمیر کے لیے نکل رہا ہے اور میں بھی اس قافلے کا حصہ ہوں۔

☆☆☆

ہم سی آئی ڈی آفس میں داخل ہوئے۔ خاکی بش شرٹ، پتلون اور سر پر گاندھی ٹوپی اوڑھے ایک چپڑاسی نے بتایا کہ اس کمرے میں پاکستانی یاتریوں کی جانچ ہوتی ہے۔

ہم اندر داخل ہونے لگے تو ایک اور چپڑاسی نے روک دیا۔

"پاکستان سے کون آیا ہے؟"

میں نے پاسپورٹ دکھایا۔

"ٹھیک ہے اندر جائیں آپ، ادھر ہی رکو۔" اس نے آزاد کو اشارہ کیا۔ یہ ساری گفتگو مراٹھی میں ہوئی۔

ایک بڑے سے ہال میں یہاں سے وہاں میزیں لگی ہوئی تھیں۔ میں سوالیہ نشان بنا کھڑا تھا کہ کہاں جاؤں کہ ایک بابو نے پوچھا۔ "پاکستان سے آئے ہو؟"

"جی۔" یہاں بات ہندی میں ہو رہی تھی۔

اب وہ کلرک ہندی میں سوال پوچھتا تھا اور میں اپنی واجبی سی مراٹھی میں جواب دیتا۔ وہ ہندی چھوڑ مراٹھی پر اتر آیا اور جنالی قسم کی مراٹھی بولنے لگا۔ میں نے درمیانہ راستہ نکالا اور ہندی مراٹھی اور انگریزی کے ملغوبے سے اپنا مافی الضمیر بیان کیا۔

اب یہاں کلرک نے کچھ شرافت کا مظاہرہ کرنا چاہا اور

## ناحق چوٹ جلاپا کھائے...!

خلد آشیاں نواب میر محبوب علی خان آصف سادس نظام دکن کی تخت نشینی نہایت کم سنی میں ہوئی تھی۔ شاید وہ چار برس کے ہوں گے کہ دکن کی سلطنت کا بار گراں قدرت نے ان کے کمزور شانوں پر رکھ دیا۔ بچہ بچہ ہی ہے۔ کسی جھونپڑے میں پیدا ہوا ہو یا شاہی محل سرا میں آنکھ کھولی ہو۔ تعلیم و تربیت میں سرکار مرحوم کے اساتذہ کو سخت دقت پیش آتی تھی۔ اگرچہ وہ اساتذہ جید علما تھے مگر ان کا واسطہ کس سے پڑا تھا۔ تخت و تاج کے مالک سے جس کی مٹھی میں ان کی قسمتیں تھیں۔ سرکار مرحوم برآمد ہوتے تو استاد سروقد تعظیم کے لیے کھڑا ہوتا۔ آداب شاہی بجا لاتا، پھر ہاتھ جوڑ کر عرض کرتا۔ سرکار تشریف رکھیں تو سبق شروع ہو۔ سرکار استاد کی گزارش بھی سنتے اور بیٹھ جاتے، کبھی کھیل کی طرف طبیعت مائل ہوتی تو قطعی سماعت نہ فرماتے اور آگے بڑھ جاتے۔ استاد ہاتھ باندھے پیچھے پیچھے ساتھ ہو جاتا۔ کبھی محل سے برآمد نہ ہوتے، وہیں کھیل میں مصروف رہتے۔

مشیران سلطنت اس مشکل کو دیکھ کر بہت گھبرائے۔ مجبوراً اس مشکل کو سلجھانے کے لیے امرائے سلطنت کی ایک کونسل جمع ہوئی، جس میں بڑے بڑے امرا شریک تھے۔ اس کونسل نے کئی دن کے بحث و مباحثے کے بعد یہ طے کیا کہ سرکار کے ہم عمر چند بچے ان کے ساتھ اور بٹھائے جائیں۔ استاد سب کو ایک ساتھ سبق پڑھائے اور جب سرکار کوئی شرارت یا ضد کریں تو دوسرے بچوں کو تنبیہ کی جائے۔ آصف سادس نظام دکن کے پاس بیٹھنے اور ان کا ہم سبق ہونے کی عزت عوام کے بچوں کو تو نہ دی جا سکتی تھی۔ اس کے لیے بڑے بڑے خاندانی امرا کے بچوں کا انتخاب ہوا۔ اب جس وقت سرکار کوئی ضد کرتے یا سبق پڑھنے سے انکار فرماتے تو استاد آنکھیں نیلی پیلی کر کے کمال بے دردی سے ان امیرزادوں کو چپیاں لگاتا۔ وہ بلبلا کر روتے۔ ادھر استاد ایک چٹکے سے سرکار سے عرض کرتا۔ "سرکار! آپ اپنی کتاب کی طرف متوجہ رہیں۔ مولوی صاحب اس وقت غصے میں ہیں۔" مشہور ہے کہ سرکار مرحوم جب تک سن شعور کو نہ پہنچے وہ امیرزادے جو ان کے ہم سبق رہتے تھے۔ اسی قول مشہور کے مطابق "ناحق چوٹ جلاپا کھائے" برابر چپیاں کھاتے رہے۔

اقتباس از دربار در بار۔ مصنف صدق جائسی

اسے بتایا کہ اردن میں میرے رشتہ دار رہتے ہیں اور میں نے اردن کو بمبئی کا حصہ سمجھ کر اپنی شہری فہرست میں نہیں لکھوایا۔

میں تو توقع کر رہا تھا کہ اب کچھ سخت قسم کے سوال ہوں گے اور پوچھا جائے گا کہ میں بغیر ویزا اردن کیسے چلا گیا لیکن کلرک شاید اسی آس میں بیٹھا تھا کہ کوئی تیز طرار کیس سامنے آئے۔

یہاں وہاں دیکھ کر اس نے بالکل آزاد کے انداز میں سرگوشی کی اور وہی مشورہ دیا جو آزاد نے دیا تھا کہ اردن میں رپورٹ نہ کروں ورنہ مشکل میں پڑ جاؤں گا۔

اس نے مجھے باہر انتظار کرنے کو کہا۔

آزاد باہر بے چینی سے ٹہل رہے تھے۔ میں نے انہیں آواز دی اور ایک بینچ کی طرف بڑھا۔

"بیٹا" بینچ پر بیٹھنے سے پہلے ہی آزاد نے مجھے کھینچ لیا۔

لکڑی کی بینچ کی درزوں میں یہ بڑے بڑے ہاتھی کھٹملوں کے برابر کھٹمل تھے۔ میں ایک جھٹکے سے پیچھے ہٹ گیا لیکن وہاں بہت سے سائل اور چپڑاسی وغیرہ بے فکری سے بیٹھے کھجا رہے تھے۔ آزاد نے کچھ پوچھنا چاہا تھا کہ چپڑاسی نے اشارہ کیا کہ اندر بلا رہے ہیں۔

میں پھر اسی بابو کے سامنے تھا۔ اس نے میرا پاسپورٹ میرے حوالے کیا۔

میں نے شکریہ ادا کیا اور اٹھتے ہوئے پوچھا کہ اور کچھ بھی ہے۔

اس نے مراٹھی میں جو کچھ کہا وہ یہ تھا کہ "صاحب سے ملاقات کرو۔"

یا اللہ کن صاحب سے ملنا ہے! اب کیا مسئلہ ہو گیا۔

"کون سے صاحب سے ملنا ہے؟"

اس نے اسی چپڑاسی کی طرف اشارہ کیا جس نے مجھے آواز دی تھی۔

"صاحب کہاں ہیں؟" میں نے مراٹھی میں چپڑاسی سے پوچھا۔

"اس صاحب نے میرے پاس بھیجا ہے۔" چپڑاسی نے بتایا۔ گویا وہی "صاحب" تھا۔

"اب کیا کرنا ہے؟"

"صاحب ہمارے چائے پانی کے لیے بھی تو کچھ دو۔ صاحب نے آپ کا کام کر دیا ہے۔" وہ لجاتے ہوئے بولا۔

"اوہ اچھا۔ لیکن انہوں نے خود کیوں نہیں لیے؟"

"نہیں وہ کھلے میں نہیں لے سکتے۔"

میری جیب میں کھلے صرف پندرہ روپے تھے۔ میں نے اب تک پاکستانی روپے اور ڈالر تبدیل نہیں کروائے تھے۔ میں نے شرمندگی سے بتایا کہ میرے پاس تو صرف یہی کچھ ہے۔ اس نے تیزی سے نوٹ میرے ہاتھ سے لے کر کاغذی کپ کے نیچے کھسکا لیے۔ "مہربانی صاحب" وہ ممنون نظر آ رہا تھا۔ میں نے صدق دل سے اس کا شکریہ ادا کیا اور باہر آ گیا جہاں دروازے کے پاس آزاد کھڑے سارا تماشا دیکھ رہے تھے۔

"ہو گیا کام؟ کتنے پیسے دیے؟"

"میرے پاس چینج ہی نہیں تھی۔ صرف پندرہ روپے دیے۔"

"کیا؟ پندرہ!" آزاد نے تقریباً چلا کر پوچھا۔

"ارے صرف پانچ دینے تھے۔"

مجھے اپنے پاکستانی ہونے پر فخر ہوا۔ کم از کم یہاں ہم ہندوستان سے بہت آگے تھے۔ ہمارے پاکستان میں سو سے کم تو دینے والے کو بھی شرم آتی ہے۔ رشوت دینے کے معاملے میں ہمارا معیار ان بھارتیوں سے کہیں زیادہ بلند تھا۔

ہم بھنڈی بازار پہنچے۔ یہاں بھی وہی نقشہ تھا۔ بھیڑ بھاڑ، شور شرابا اور دھکم پیل۔

ایک کھوکھا نما دکان کے تخت پر بیٹھے دکاندار کو آزاد نے سلام کیا اور ہاتھ ملایا پھر میرا تعارف کرایا۔ اس نے پان آلود سرخ زبان سے مجھے خوش آمدید کہا۔ سامنے دھرے اسٹول پر ہمیں بٹھا کر کسی کو دو "تھمس اپ" لانے کا حکم دیا۔

آزاد سعودیہ کی ملازمت کے دنوں میں اس سے ڈالر وغیرہ تبدیل کراتے تھے اور یہ عموماً اچھے دام دیتا تھا۔ یہ مسلمان تھا اور ہم اردو میں بات کر رہے تھے۔ مجھے پاکستانی سو کے بدلے بھارتی ایک سو پانچ روپے ملے۔ ان دنوں ہمارے روپے کی قدر زیادہ تھی۔ ہماری فی کس آمدنی بھی ہندوستان کے مقابلے میں بہت بہتر تھی اور نجانے کیا بات تھی، عام ہندوستانی پاکستانیوں سے مرعوب نظر آتا تھا یا شاید مجھے یوں محسوس ہوتا تھا۔ میرا اندازہ اتنا غلط بھی نہیں تھا، آگے چل کر ایسے کئی مشاہدے ہوئے۔



☆☆☆

"اب کہاں؟" ہم بمبئی کی سڑکوں پر سرگشت کر رہے تھے۔ یوں سمجھیں بھیڑ بھاڑ سے گزر رہے تھے۔ یہاں ایک اور جرجر سے بنی عمارت میں آزاد بھائی داخل ہونے لگے۔ یہ پوسٹ آفس اور تار گھر تھا۔ اندر گھپ اندھیرے میں ایک چھوٹا سا پیلا بلب روشن تھا۔ کچھ دیر میں آنکھیں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو دیواروں سے لگی الماریوں پر فائلوں کے ڈھیر نظر آئے۔ مجھے کراچی کا پاسپورٹ آفس یاد آیا جہاں فائلوں کے ڈھیر دیکھ کر میں حیرت میں گم تھا کہ کاغذوں کے اس انبار سے مطلوبہ کاغذ کیسے ڈھونڈ نکالا جاتا ہوگا۔ ہندوستان پاکستان کے سرکاری دفتروں کا حال ایک سا تھا لیکن فائلنگ کے معاملے میں دونوں کا فول پروف طریقہ تھا اور منٹوں سیکنڈوں میں مطلوبہ کاغذ نکل جاتا تھا۔

آزاد نے یہاں سے کسی کو دہلی میں تار بھیجا جس میں دہلی سے بمبئی کے لیے ٹکٹ خریدنے کی ہدایات تھیں۔ اب ہم واکولا جانے والی بس کی تلاش میں تھے کہ آزاد کو ایک ریڑھی پر مٹکوں میں رکھی آئسکریم نظر آئی۔ یہ کچھ کچھ پشاوری آئسکریم طرز کی تھی۔

"یہ کھائیں گے۔ مزیدار ہوتی ہے۔"

آزاد نے آئسکریم کے پیسے دیے۔ میں منتظر تھا کہ شاید کسی ڈنڈی پر لگی قلفی ملے گی یا کسی پیالے یا پلیٹ میں؟ لیکن وہاں تو ایسی کوئی شے نظر نہ آئی تھی۔ ٹھیلے والے نے ایک بڑے چمچے سے آئسکریم نکال کر مٹکے اور اپنے درمیان رکھے پیپل کے دو بڑے پتے نکال کر آئسکریم ان پر رکھ کر ہمارے حوالے کی۔

"کوئی چمچ ملے گا؟" میں نے پوچھا تو وہ میرا منہ دیکھنے لگا۔ اس دوران آزاد کو دیکھا وہ اطمینان سے پتا منہ کے سامنے رکھے زبان سے آئسکریم "چیپڑ" رہے تھے۔ میں بھی شروع ہو گیا لیکن آئسکریم میری مونچھوں اور ٹھوڑی سے لپٹی لپٹی جاتی تھی۔ دو چار بار زبان مار کر میں نے ٹھیلے کے نیچے رکھے ٹوکرے میں پتا پھینکا ہی تھا کہ ایک نو دس سالہ لڑکا جانے کہاں سے وارد ہوا اور پتا اٹھا کر چاٹنے لگا۔

"ارے رکو! میں تمہیں دوسری آئسکریم لے کر دیتا ہوں۔" میرے ہاتھ جیب کی طرف بڑھے ہی تھے کہ آزاد نے سختی سے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

"ایسی غلطی بھول کر بھی نہ کرنا۔" آزاد نے تنبیہ کی۔ "تمہیں جان چھڑانا مشکل ہو جائے گا، اتنے سارے جمع ہو جائیں گے۔"

آزاد کی بات مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ ہمارے آس پاس چھوٹے چھوٹے ننگے اور بنیان اور نیکر پہنے لڑکے جمع ہونے لگے۔ آزاد نے ڈانٹ کر انہیں بھگانے کی کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوتے تھے۔ میں نے تھوڑے پیسے ریڑھی والے کو دے کر کہا ان بچوں کو آئسکریم دے دے۔ آزاد مجھے لے کر وہاں سے ہٹ گئے۔

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ بچے گھیرا ڈالے پتوں سے آئسکریم کھا رہے تھے اور چھین جھپٹ ہو رہی تھی۔

ہم ایک ڈبل ڈیکر بس میں سوار ہوئے جس میں مرد و زن شانہ بشانہ کھڑے تھے۔ یہاں مستورات کے لیے الگ کمپارٹمنٹ کا رواج نہیں۔ میرے لیے یہ عجیب بات تھی۔ کراچی میں تو بسوں اور منی بسوں میں عورتوں کی علیحدہ نشستیں ہوتی تھیں یہ اور بات ہے کہ اکثر مرد حضرات خواتین کے حصے سے بس میں داخل ہو کر مردانہ حصے میں جانے کو ترجیح دیتے۔

میں کھڑکی سے باہر دیکھتا جاتا تھا لیکن مجھے صدر، بندر روڈ جیسا ہی ماحول نظر آتا تھا البتہ ایک عظیم الشان قدیم عمارت کے قریب بہت سے لوگوں کو جاتے دیکھ کر میں چونکا۔

"یہ وی ٹی اسٹیشن ہے۔" آزاد نے بتایا۔ وکٹوریہ ٹرمینس کو بمبئی والے پیار سے وی ٹی کہتے ہیں۔ یہ یقیناً انگریز کے دور کی بنی عمارت تھی یہاں زیادہ تر عمارتیں پرانی ہی تھیں۔ صرف نریمان پوائنٹ کے آس پاس شیراٹن ہوٹل کی بلند و بالا عمارت اور دوسری جدید عمارتیں نظر آئی تھیں۔

ہم سمندر پر بنے ایک پل سے گزرے تو دور چاروں طرف پانی میں گھری ایک مسجد نما عمارت نظر آئی۔

"یہ حاجی علی کی درگاہ ہے۔" آزاد نے بتایا۔

"لیکن یہ تو سمندر کے بیچوں بیچ ہے۔ وہاں لوگ پہنچتے کیسے ہوں گے؟"

"اس وقت سمندر چڑھا ہوا ہے۔ جب جوار کے بعد بھاٹا آئے گا، پانی اترے گا تو یہاں سے درگاہ تک لمبا راستہ نکل آئے گا۔ اس سے آتے جاتے ہیں۔"

مجھے آزاد کی بات کا یقین نہیں آیا۔ یہ ایک عجیب لیکن خوبصورت عمارت تھی اور سمندر کے بیچوں بیچ ایک دلکش نظارہ پیش کرتی تھی۔ ہندوستان ایسے ہی عجوبوں کا ملک ہے۔ پُراسرار ہندوستان، دنیا بھر کے سیاحوں کی سیاحت

جسے دیکھے بغیر مکمل نہیں ہوتی۔ (کہتے ہیں کہ پانچ وقت اذان کے ساتھ راستہ نکلتا ہے اور نماز ختم ہونے کے ایک آدھ گھنٹے بعد راستہ پانی میں ڈوب جاتا ہے)

سانتا کروز کے اگلے اسٹاپ یعنی واکولا پر ہم اتر گئے۔ ہم اپنی چھوٹی خالہ کے ہاں جارہے تھے، جن کے میاں فلم ڈائریکٹر تھے اور جن کی بیٹی اور داماد مجھے ایئرپورٹ پر خوش آمدید کہنے آئے تھے۔

بچپن میں جب امی کے ساتھ یہاں آکر رہا تھا تو اس وقت کی بہت سی سہانی یادیں اس جگہ سے جڑی تھیں۔ خالہ کے چھوٹے سے لیکن صاف ستھرے اور قرینے سے سجے فلیٹ میں ہم دوپہر کی چائے کے ساتھ بھولا رام کے ہاتھ کے بنے پکوڑے کھاتے تھے، اس جیسے پکوڑوں کا ذائقہ مجھے پھر کہیں نہیں ملا۔ واکولا کی دوسری یاد ناریل کے درختوں کی پھننگ پر بیٹھے گدھ اور گلیوں میں پھرتے سور تھے۔

شاید یہیں کہیں پارسیوں کا وہ کنواں تھا جہاں وہ اپنے مردے چھوڑ جاتے تھے۔ گدھوں کا یہاں مستقل قیام شاید اسی سبب تھا۔ یہیں عیسائیوں کی بڑی آبادی تھی اور سور بھی اسی لیے پائے جاتے تھے کہ ہندو اور مسلمان نہ سہی، عیسائی ان کے بڑے قدر دان تھے۔ جو محبت ہم مسلمانوں کو گائے اور بکروں سے ہوتی ہے ویسی ہی شیفتگی عیسائیوں اور خنزیروں میں پائی جاتی ہے۔ دونوں محبتیں البتہ پیٹ میں جاکر ختم ہوجاتی ہیں۔

مجھے لگا کہ وقت بیس سال پیچھے لوٹ گیا ہے۔ ہر چیز ویسی ہی تھی۔

''میں تمہیں خالہ جان کے گھر لیے چلتا ہوں۔'' میں نے آزاد سے کہا۔

''راستہ معلوم ہے تمہیں۔'' آزاد کو شبہ تھا۔

''چلو دیکھتے ہیں مجھے کہاں تک یاد ہے۔'' اور میں آگے آگے چلنے لگا۔ ایک دومنزلہ فلیٹ کے سامنے آکر میں رک گیا۔ میں اپنے حساب سے صحیح جگہ پہنچا تھا لیکن میرے ذہن میں ایک نئی نکور، تازہ تازہ روغن کی ہوئی عمارت تھی اور یہاں میرے سامنے ایک کائی زدہ بلڈنگ کھڑی تھی۔ میں کچھ جھجکا......

اچانک مجھے یاد آیا کہ خالہ کے گھر کی بالکونی سے ہم باہر دیکھتے تھے تو سڑک کے دوسری طرف ایک چھوٹے سے مکان کی ایک ہمیشہ کھلی کھڑکی کے قریب لکڑی کے بریکٹ پر سیتا میا کی تصویر کے ساتھ دیے جل رہے ہوتے تھے اور گھر والے اس کی آرتی اتارتے نظر آتے تھے۔ میں اسی سڑک پر کھڑا تھا، بے ساختہ میں نے مڑ کر دائیں جانب دیکھا۔ وہی گھر تھا، کھڑکی اب بھی کھلی تھی اور سیتا میا، نا جانے کس کی تصویر کے سامنے دیا جل رہا تھا۔ البتہ آرتی کوئی نہیں اتار رہا تھا۔ ظاہر ہے بھگوان کو یاد کرنے کے علاوہ اور بھی کام تھے۔

تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

''یہی ہے۔'' میں خوشی سے چلایا جیسے کبھی کوئی پکارا تھا۔ ''یوری کا!''

آزاد نے ستائشی نظروں سے مجھے دیکھا اور یہ اللہ کا مجھ پر خاص کرم ہے کہ مجھے بچپن کی بہت سی باتیں اسی طرح یاد ہیں جیسے کل ہی کی بات ہے۔ میری عمر کے اکثر ساتھی ان باتوں سے یوں لاعلمی ظاہر کرتے ہیں جیسے وہ میرے بہت بعد میں پیدا ہوئے ہوں اور مجھ میں کوئی بوڑھی روح سمائی ہوئی ہو۔

خالہ کے ہاں پہنچ کر نقشہ وہی تھا جو کل خالہ اماں اور خالو، خالد ماموں اور آج صبح ماموں صاحب سے مل کر پیش آیا تھا۔ میری یہ خالہ بڑی سبک اندام اور صفائی پسند ہوا کرتی تھیں۔ خالو نے جن کا تعلق فلم انڈسٹری سے تھا اور جو شاعری و مصوری بھی کرتے تھے، خالہ کو یوں ہی تو پسند نہ کیا ہوگا۔ خالو گھر پر نہیں تھے بلکہ صرف ان کی سب سے چھوٹی بیٹی شاہین ہی گھر پر تھی۔ اکلوتا بیٹا ''فیض'' بھی فلم پروسیسنگ سے منسلک تھا اور اس وقت اسٹوڈیو میں تھا۔

میں جب پہلے یہاں آیا تو صرف نور اور فیض ہی تھے۔ فیض میرے چھوٹے بھائی کا ہم عمر تھا۔ شاہین اور اس سے بڑی صوفیہ بعد کی پیداوار تھے اور شاہین اپنے کراچی والے بھائی کو حیرت، اشتیاق اور محبت سے دیکھتی تھی اور جب کھانا لگا تو بڑھ بڑھ کر چیزیں میرے سامنے رکھتی۔ میں نے اپنی منگنی کی تصویروں کا چھوٹا سا البم دکھایا جو میں بطور خاص یہاں لایا تھا۔ وہ تصویریں جن میں میری وہ منگیتر تھی جسے میں نے اب تک نہیں دیکھا تھا۔ میں نے بتایا ناں کہ اس زمانے میں رشتے تاس کی طرح ہوتے تھے۔

''سو سویٹ ناں؟'' شاہین نے میری منگیتر کی تصویر دیکھ کر خالہ سے کہا۔

اور مجھے کچھ کچھ اندازہ ہورہا تھا کہ تاس کا سکہ کس رخ سے میرے سامنے آئے گا۔

یہاں آنے کے بعد پہلی بار مجھے گھر یاد آیا۔

(باقی آئندہ شمارے میں)

# ثور افگن

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

بل فائٹنگ ایک ایسا کھیل ہے جس کا اختتام موت ہے۔ بیل یا پھر کھلاڑی کی موت۔ یہ خطرناک کھیل قوی اعصاب کے حامل افراد ہی کھیلتے ہیں۔ اس کھیل کے لیے جب اس نے اپنا نام پیش کیا تو سب دنگ رہ گئے۔ صدیوں پرانے اس کھیل کے لیے پہلی بار ایک عورت نے اجازت نامہ مانگا تھا۔

## ایک بہادر دوشیزہ کے حوصلے کا بیان

1937ء میں جب ہم تعطیلات منانے میکسیکو پہنچے تو میں نے وہاں پہلی بار ثور افگن (لیڈی بل فائٹنگ) کا مقابلہ دیکھا۔ یاد رہے کہ ثور کے معنی بیل اور افگن کے معنی پچھاڑنے والا۔

اس وقت میری عمر صرف سات سال تھی۔ ننھے ذہن پر کھیل سے زیادہ ثور افگنوں (بل فائٹروں) کی رنگ برنگی وردی پریڈ اور بگل کی آواز نے اثر کیا۔ لوگ بار بار اپنی نشستوں سے بے ساختہ اٹھ کر ثور افگنوں کو داد دیتے اور

## جامع مسجد دھلی

دہلی کی مشہور و معروف مسجد جسے شاہ جہاں نے بنوایا تھا شاہجہان کی خواہش تھی کہ اس کا نیا دارالحکومت جو شاہجہان آباد کہلاتا تھا۔ دنیا کے اعلیٰ ترین شہروں میں سے ایک ہو۔ اپنے محل کے قریب ہی اس نے جامع مسجد تیار کرائی۔ جس کے بارے میں یہ روایت کی جاتی ہے کہ اس مسجد کا نمونہ شاہجہان نے خواب میں دیکھا تھا اور اسی قسم کی مسجد جو تھے آسمان پر ہے جامع مسجد جہاں نما بھی کہتے ہیں۔ یہ مسجد 1054-1644 سے 1069ہجری 1658ء کے درمیانی عرصے میں بن کر تیار ہوئی۔ اس مسجد کے بارے میں ایک روایت یہ بھی مشہور ہے جس کا کتب تاریخ میں کہیں ذکر نہیں ملتا کہ جب جامع مسجد بن کر تیار ہو گئی تو بادشاہ نے آ کر معائنہ کیا۔ قطب نما رکھ کر جب قبلہ جانچا تو معلوم ہوا کہ کچھ فرق رہ گیا ہے۔ بادشاہ نہایت مایوس اور رنجیدہ ہوا۔ پھر ایک درویش ظاہر ہوئے اور انہوں نے پائے والوں کی طرف جو مسجد کا کونہ ہے اس سے پشت لگا کر مسجد کو سیدھا کر دیا اور اس کے بعد فوراً ہی انتقال کر گئے۔ بادشاہ نے اس بزرگ کی قبر اسی مقام پر بنا دی۔ اتفاق سے چند قبریں آج بھی وہاں موجود ہیں۔ چنانچہ اس روایت میں اور بھی جان پڑ گئی۔

مسجد کو دیکھتے ہی پہلا اثر اس کی بلندی گری کا ہوتا ہے۔ اصل وجہ یہ ہے کہ اس کے نیچے ایک پوری پہاڑی دبا دی گئی ہے۔ وہ چبوترہ جس پر مسجد کی عمارت بنائی گئی ہے تیس فٹ اونچا ہے اور چودہ سو مربع گز اس کا رقبہ ہے۔ مسجد کے جنوبی، مشرقی اور شمالی سمت بڑی بڑی چوڑی سیڑھیاں ہیں جن پر لمبی لمبی پتھر کی سلیں جڑی ہوئی ہیں۔ جہاں سیڑھیاں اوپر جا کر ختم ہوتی ہیں وہاں خاصی بڑی کشادہ جگہ ہے۔ اس جگہ پر سیڑھیاں تین طرف سے آ کر ختم ہوتی تھیں۔ ہر دروازے کی سیڑھیوں کا یہی معاملہ ہے۔

قبلے کی جانب (مغربی سمت) کو چھوڑ کر باقی تین طرف خوش نما اور وسیع دروازے ہیں۔ جن کی شان اس سبب سے اور بھی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ وہ بلندی پر واقع ہیں اور ان تک پہنچنے کے لیے نہایت وسیع اور کشادہ سیڑھیاں ہیں۔ شاہی زمانے میں لال قلعہ کے سامنے والا دروازہ جو مشرقی دروازہ کہلاتا ہے۔ بادشاہوں کے استعمال کے لیے کھولا جاتا تھا اور شمال جنوب کی سمت والے دروازے پبلک کے لیے تھے۔ مسجد کا صحن 325 مربع فٹ ہے اس کے صحن کے عین وسط میں ایک بڑا حوض ہے اور تینوں اطراف میں مسقف دالان ہیں۔ اصل عمارت عرض میں دو سو فٹ اور گہرائی میں نوے فٹ ہے سامنے دیوار میں گیارہ محرابی در ہیں جن پر سفید اور سیاہ پتھر کا کام ہے۔ قبلے کی جانب دیوار میں نہایت خوشنما محرابیں بنائی گئی ہیں۔ بیچ امام کے سامنے جہاں وہ کھڑے ہوتے ہیں ایک سنگ مرمر لگا ہوا ہے۔ اس دودھیا پتھر میں یہ خوبی ہے کہ جب مشرق میں سورج کی کرنیں پھوٹتی ہیں تو یہ پتھر گلابی ہو جاتا ہے۔ سنا ہے کہ یہ پتھر اب وہاں سے اکھاڑ لیا گیا ہے۔ مسجد کی چھت پر تین بڑے گنبد ہیں جن پر سنگ موسیٰ اور سنگ سرخ کی پٹیاں ہیں۔ عمارت کے دونوں کناروں پر سنگ سرخ کے ایک سو تیس فٹ بلند مینار ہیں ان کے اندر چکر دار دروازے ہیں۔ جن سے اوپر تک پہنچا جا سکتا ہے۔ خوبصورتی دیدہ زیبی غرض ہر نکتہ نظر سے یہ عمارت لاجواب بنی گئی ہے۔

مرسلہ: تسلیم زہرا، لاہور

میرے سارے جسم میں ٹیسیں اٹھ رہی تھیں مگر ان کے سامنے مسکرانے لگی۔

”امی! آپ خود دیکھ لیں، بالکل صحیح سالم آپ کے سامنے کھڑی ہوں۔“

ان کی باتوں سے پتا چلا، ٹیلی فون پر میرے کسی دوست نے انہیں مقابلے میں میرے زخمی ہونے کی اطلاع کر دی تھی اور وہ پریشان ہو کر بھاگم بھاگ مجھے دیکھنے آ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد ابا بھی آ گئے۔ وہ پرنسپل کے دفتر میں میرا تعلیمی ریکارڈ دیکھنے گئے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ میں نے تعلیم کو بالکل پس پشت ڈال رکھا ہو گا چنانچہ اس بہانے مجھے گھر لے جائیں گے، لیکن انہیں مایوسی ہوئی۔ ثور افگنی کے شوق میں، میں نے تعلیم کو نظر انداز نہیں کیا تھا۔

ہر ٹیسٹ میں کم از کم پاس ضرور ہوتی رہی تھی۔ امی اور ابا دیر تک بیٹھے رہے اور کوشش کی کہ میں ثور افگنی ترک کر دوں، لیکن میری ضد کے آگے ان کی ایک نہ چلی۔

آخر کار انہیں اپنی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی کی خواہش اور ضد کے آگے ہتھیار ڈالنے پڑے۔

ابا نے کہا۔ ”ٹھیک ہے، جیسی تمہاری خوشی منظور ہے، جو جی میں آئے کرو، لیکن اتنی بات یقینی ہے ہم تمہارا کوئی مقابلہ دیکھنے نہیں آئیں گے۔“

چند روز بعد قرناطہ کے کہنے پر میں نے ایک اور مقابلے میں حصہ لیا۔ مقابلے والے دن میری قلبی کیفیات بے حد متضاد تھیں۔ انہیں الفاظ میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ خوف، پریشانی، ہیجان، تذبذب اور شوق و جذبات کی فراوانی، عجیب ملی جلی کیفیت تھی۔

مقابلے کے دوران میں ایک دو بار گر پڑی، لیکن مجموعی طور پر سانڈ کو بہت دق کیا۔ جب وہ بری طرح تھک گیا تو میں نے تلوار اٹھائی اور ججوں سے اس کو ہلاک کرنے کی رسمی اجازت طلب کی۔

اس وقت میرے سارے حواس پوری طرح بیدار تھے اور سانڈ کی ایک ایک حرکت پر میری نظر تھی۔ جونہی سانڈ قریب پہنچا، میں نے اس کے شانوں پر وار کرنے کے لیے تلوار کو دونوں ہاتھوں سے تولا مگر بالکل قریب پہنچ کر اس نے پہلو بچایا اور دوسری طرف نکل گیا۔

تیسری بار میں نے تلوار زیادہ اونچی کر لی۔ سانڈ نے ٹکر ماری تو اس کا سینگ کپڑے میں اٹک گیا اور میں دور



بھی اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی۔

تماشائی بے تاب ہو کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ میرے بازو سے خون بہنے لگا۔ متعدد عورتیں چلا اٹھیں۔

”اس عورت کو اکھاڑے سے نکالو، یہ کیا کر رہی ہے؟“ لیکن مجھے کسی بات کا ہوش نہ تھا صرف ایک خیال چھایا ہوا تھا، سانڈ کو کسی طرح زیر کروں۔

چند لمحے بعد میں سانڈ پر بخوبی قابو پا چکی تھی۔ اسے ہلاک کرنے کا بگل بجا تو میں نے بڑے سکون سے تلوار کا ایک بھرپور ہاتھ مارا۔ تلوار دستے تک اس کے جسم میں اتر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر گر پڑا اور چند لمحے بعد اس نے دم توڑ دیا۔ میری پہلی کوشش کامیاب رہی تھی۔ اس وقت مجھے جو خوشی حاصل ہوئی، بیان سے باہر ہے۔ سارا پنڈال تالیوں اور نعروں سے گونج اٹھا۔ سانڈ کا ایک کان کاٹ کر مجھے بطور انعام دے دیا گیا۔

اس مقابلے کے بعد میرا حوصلہ بڑھ گیا۔ رفتہ رفتہ دل میں پیشہ ور ثور افگن بننے کا شوق چرایا۔ اس کے لیے ثور افگنوں کی باقاعدہ انجمن کا باقاعدہ ممبر بننا ضروری تھا۔

اس ممبری کو ثور افگنی کی اعلیٰ سند سمجھنا چاہیے۔ اس کے بغیر کسی ثور افگن کو سرکاری طور پر تسلیم نہیں کیا جاتا اور نہ وہ ثور افگن (MATADOR) کا خطاب استعمال کرنے کا مجاز ہوتا ہے۔

ثور افگنی کی تاریخ میں اب تک صرف دو عورتوں کے نام ملتے ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کئی سانڈ ہلاک کیے اور مردوں کے دوش بدوش، اس کھیل میں حصہ لیا، لیکن انجمن انہیں اپنا ممبر بنانے پر کبھی آمادہ نہ ہوئی۔

عورت ہونے کی بنا پر مجھے انجمن سے کسی قسم کی مراعات کی کوئی امید نہ تھی۔ میں نے ان کے کڑے معیار پر پورا اترنے کے لیے دن رات مشق جاری رکھی۔

جلد ہی وہ دن آ گیا جب انجمن نے میری درخواست کو پذیرائی بخشی اور 20 جنوری 1952ء مقابلے کا دن مقرر ہو گیا۔

مقابلے کی زور و شور سے منادی کی گئی۔ مقررہ دن سے پہلے ہی گرد و نواح کے بے شمار لوگ شہر میں امڈ آئے اور زبردست میلے اور جشن کا گمان ہونے لگا۔

امی بھی میرے مجبور کرنے پر چلی آئی تھیں، مگر ابا نے مقابلہ دیکھنے سے انکار کر دیا۔ ان کا ایک ہی جواب تھا۔

”میں اپنی اکلوتی اولاد کو اپنی آنکھوں سے ہلاکت

کے منہ میں جاتے نہیں دیکھ سکتا۔"

انہیں میری صلاحیتوں کے بارے میں ابھی تک شک تھا۔ میں نے امی کے ساتھ ایک ہوٹل میں قیام کیا۔ دن رات ملنے والوں کا جمگھٹا لگا رہتا۔ ہر ایک "سرپھری لڑکی" کی ایک جھلک دیکھنے کا مشتاق تھا۔

بڑی بوڑھی عورتیں، امی کے سامنے میری بہادری اور جرأت کے تذکرے کرتیں تو مجھے ان کے انداز سے یوں لگتا جیسے درپردہ وہ امی کے ساتھ اظہار افسوس اور ہمدردی کر رہی ہیں۔

طویل مشق اور تجربے سے میرے اندر خاصی خود اعتمادی پیدا ہو گئی چنانچہ مقابلے کے لیے جب اکھاڑے میں داخل ہوئی، تو ذرا اضطراب یا خوف نہ تھا۔ البتہ موسم ابر آلود ہونے کی وجہ سے خاصی پریشان اور آزردہ تھی۔

صاف اور روشن دن میری نفسیاتی کمزوری بن گئے ہیں۔ سورج کا نظروں سے اوجھل ہونا میرے نزدیک نیک شگون نہیں۔ اسی احساس کا اثر یہ تھا کہ مقابلے میں حصہ لیتے وقت میں قلبی مسرت سے محروم تھی۔

اس وقت گویا میرے اعصاب پر ایک نامعلوم سی بے چینی اور اضطراب کی کیفیت طاری تھی۔ تاہم ایسے عالم میں امی کی دلآویز مسکراہٹ نے سہارا دیا جو تماشائیوں کی صف میں بیٹھی ہوئی تھیں۔

مقابلہ شروع ہوا تو بدقسمتی سے میرے بدترین خدشات کی تصدیق ہو گئی۔ میرے حصے میں جو سانڈ آیا، وہ پرلے درجے کا سست اور عیار تھا۔ سانڈ اگر خود آگے بڑھ بڑھ کر ثور افگن پر حملے کرے تو اسے روکنا مشکل نہیں ہوتا۔ کپڑے کے اشاروں سے بڑی آسانی کے ساتھ اسے اپنے ڈھب پر لایا جا سکتا ہے، لیکن اس کے برعکس سست سانڈ سے مقابلے میں کئی مشکلات پیدا ہو جاتی ہیں۔

سانڈ، باڑے سے باہر قدم رکھنے پر کسی طرح تیار نہیں ہوتا۔ ثور افگن کو بار بار آگے بڑھ کر اسے کھیل میں حصہ لینے پر اکسانا پڑتا ہے۔ ثور افگن کو کچھ اندازہ نہیں ہوتا کہ سانڈ اچانک کس رخ سے حملہ کرے گا۔

یہی وجہ تھی کہ حتی الوسیع دفاعی انداز اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ایسے سانڈ مجھے سخت ناپسند ہیں، لیکن شامت اعمال کہ پیشہ وارانہ امتحان میں پہلا مقابلہ ایسے ہی سانڈ سے ہو گیا، میں نے اسے ٹوپی اور کپڑے سے ہشکا کر کھلے میدان میں لانے کی سرتوڑ کوشش چاہی، مگر کامیاب نہ ہوئی۔

سانڈ باڑے کی چوبی دیوار سے لگا ہوا کھڑا زور زور سے گردن ہلا ہلا کر اور زمین پر کھر مار مار کر رہا تھا۔ میں نے اسے جس بیدردی سے ہلاک کیا، مجھے عمر بھر افسوس رہے گا لیکن اس کی ذمہ داری خود عائد ہوتی ہے۔

وہ میری کوششوں کے باوصف کھلے میدان مردانہ وار مقابلے پر آمادہ نہ ہوا۔

تھوڑی دیر بعد جب دوسرے سانڈ سے مقابلے بگل بجا تو بادلوں میں سے سورج جھانکنے لگا اور دھوپ پھیل گئی۔ تیز روشنی میں میری طبیعت کا سارا اور تکدر جاتا رہا۔

خوش قسمتی سے اب کے سانڈ خوب تیز طرار محافظوں نے باڑے کا دروازہ کھولا، تو سیاہ اور دھاریوں والا نوجوان سانڈ اچھلتا کودتا تیزی سے طرف دوڑا۔

میں پورے اطمینان اور سکون سے کپڑا لیے منتظر تھی۔ جونہی وہ میرے قریب پہنچا، ایک طرف ہٹ اور وہ اپنے زور میں آگے دوڑتا چلا گیا۔

تب اس نے پلٹ کر دوبارہ حملہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگائی۔ اس بار کوشش کے باوجود اس کا سینگ میرے جسم سے مس کر کے نکل گیا، لیکن میرے پاس اپنے زخم کی طرف متوجہ ہونے کا وقت نہ تھا کیونکہ سانڈ پلٹ کر تازہ حملے کے لیے بڑھ رہا تھا۔

سانڈ میدان میں چاروں طرف دوڑتا پھر رہا تھا۔ ناکامی کے بعد اس کے حملے کی شدت میں اضافہ ہوتا جا تھا۔ زیادہ دیر تک اس کا مقابلہ کرنا دشوار تھا۔ اندیشہ تھا میں نے ذرا بھی سستی کی، وہ مجھے سینگوں پر اٹھا کر پٹخ دے گا۔

لہٰذا جونہی اس کو ہلاک کرنے کا اشارہ ہوا، میں نے دو تین پے تلے وار کر کے اسے ٹھکانے لگا دیا۔

تماشائی بے ساختہ اٹھ کھڑے ہوئے اور سارا پنڈال تالیوں سے گونجنے لگا۔ فرنانڈو نے آگے بڑھ کر میری پیٹھ تھپکی، مقابلہ اس کی امید سے زیادہ کامیاب اور شاندار رہا تھا۔

میرے جسم کا رواں رواں خوشی سے ناچنے لگا۔ میں نے آخر کار "ثور افگن خاتون" کا لقب حاصل کر لیا تھا۔

جی ہاں......! شمالی امریکا کی پہلی ثور افگن خاتون۔

++

# ڈگی میں لاش

زین مہدی

کبھی کبھی زندگی ایسے تماشے بھی دکھاتی ہے جس پر کسی فلم کسی ڈرامے کا گمان ہوتا ہے کہ ایک کے بعد ایک پرت کھلتے ہیں تو نئی، بالکل نئی کہانی کھل کر سامنے آتی ہے۔ ایک معمولی سے قتل نے پورے شہر کو چونکا دیا تھا۔

**کسی الجھی ڈور کی طرح واقعات الجھ رہے تھے**

وہ ایک عام سا دن تھا۔ دن نے شام کا پیرہن پہننے کی پوری تیاری کر لی تھی۔ یہ وقت ہوتا ہے ٹہلنے کا۔ ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر واک کرنے کا۔ بچوں کو ٹہلانے کا۔ وہ عورت بھی بچے کو تازہ ہوا میں لے کر آئی تھی۔ سامنے سرکاری باغ تھا۔ وہ اسی باغ کی جانب بڑھ رہی تھی۔ اس نے ایک پرام کو تھام رکھا تھا۔ اس پرام میں ایک چھوٹا سا بچہ تھا جو ٹکر ٹکر ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا۔ سامنے سے ایک دوسری عورت آ رہی تھی۔ نزدیک آتے ہی وہ بولی۔ ”ارے کھلی تم...... کیسی

آسٹر کا نمبر لے کر اسے فون کرو۔" پھر کچھ سوچ کر بولا۔
"بلکہ کوئی آسٹر کے گھر بھیجو اور تم اس کا نمبر ٹرائی کرتی رہو۔ اگر بیگم کی ہی آسٹر ہے تو ابھی پتا چل جائے گا۔"

ایریا مسلسل نمبر ڈائل کر رہی تھی۔ پھر شاید کسی نے اس کی کال ریسیو کر لی تھی کیونکہ اس نے کہا تھا۔ "مجھے مسٹر آسٹر سے بات کرنی ہے.... آپ ہی آسٹر ہیں.... جی جی.... کیا کہا.... آپ کی بیگم کا انتقال ہو گیا.... اوہ.... ٹھیک ہے ہم بعد میں کال کریں گے اپنا پتا بھی بتا دیں۔" ایریا نے پیڈ پر پتا نوٹ کر کے ہیری کی جانب بڑھا دیا۔

فون بند کر کے اس نے ہیری سے کہا۔ "مسٹر آسٹر کی بیگم کا انتقال ہو گیا ہے۔ وہ تدفین کے انتظامات میں مصروف ہیں۔"

"اوہ.... اچھا اٹھو چلو۔" کہہ کر وہ کھڑا ہو گیا۔

☆☆☆

وہ پہر ڈھل رہی تھی، ہیری اپنی عادت کے مطابق تیز رفتاری سے کار ہوا میں اڑاتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ اس کے برابر میں ایریا بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ بالکل خاموش تھی۔ دراصل اس نے عادت بنالی تھی کہ ڈرائیو کرتے وقت وہ ہیری سے کوئی بات نہیں کرتی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ اس طرح ہیری کی توجہ ڈرائیونگ سے ہٹ سکتی ہے۔ ادھر ادھر ہو سکتی ہے۔

ہیری کار دوڑاتا ہوا جس بنگلے میں داخل ہوا اس کا مرکزی دروازہ کھلا ہوا تھا۔ کچھ لوگ لان میں کھڑے ہوئے تھے۔ سب کے چہروں سے افسردگی ٹپک رہی تھی۔ اس کی کار اندر داخل ہوئی تو کئی ایک کے چہرے اس کی طرف مڑ گئے۔ دونوں طرف کا دروازہ ایک ساتھ کھلا تھا اور ایک طرف سے ہیری اور دوسری طرف سے ایریا اترے تھے۔ انہوں نے ایک نظر میں اندازہ لگا لیا تھا کہ سوگواریت کی محفل ہے۔ یقیناً قبرستان جانے کی تیاری ہو رہی ہے۔ تمام لوگوں کی توجہ ان دونوں کی طرف تھی۔ ہیری لان میں کھڑے بیٹھے لوگوں کی طرف بڑھا۔ نزدیک پہنچ کر اس نے پوچھا۔ "آپ میں سے مسٹر آسٹر کون ہے؟"

"جی میں ہوں آپ کون؟" ایک بارعب شخص نے آگے بڑھ کر کہا۔

"ہمارا تعلق اسپیشل فورس سے ہے۔" ہیری نے کارڈ شو کر کے کہا۔

"جی فرمائیں.... ایسی کیا بات ہو گئی کہ پولیس کو مجھ سے کام پڑ گیا۔" آسٹر نے مشفق لہجے میں کہا۔ "ویسے تو میں ایک قانون پسند اور پرامن شہری ہوں۔"

"جی ہاں آپ کا ریکارڈ بے داغ ہے۔ بس سلسلے میں بات کی معلومات کرنی تھی اس لیے ہم آئے ہیں۔"

"جی فرمائیں۔ قانون کی مدد کر کے مجھے خوشی ہو گی۔"

"صرف اتنا معلوم کرنا ہے کہ آپ کی کار کہاں ہے؟"

"ایک تو وہ سامنے کھڑی ہے اور دوسری جو گھر میں رہتی ہے وہ کل ڈرائیور لے کر گیا ہے تو واپس نہیں آیا۔ اکثر اپنے کسی کام کو نمٹانے کے لیے کار استعمال کرتا ہے۔"

"ڈرائیور کا کیا نام ہے؟"

"ایلیٹ فوسٹر، وہ ایرپورٹ کا رہنے والا ہے۔ بہت ایماندار ہے۔ تقریباً دس سال سے ہمارے ہاں ملازم ہے۔ اس لیے اسے جب بھی ضرورت پڑتی ہے بغیر بولے بھی کار لے کر چلا جاتا ہے۔"

"ایلیٹ فوسٹر کا پتا؟" ہیری نے پوچھا۔

"میں لکھ کر دے دیتا ہوں۔" کہہ کر آسٹر نے جیب سے پاکٹ ڈائری نکالی اور اس پر قلم سے پتا لکھا پھر وہ ورق پھاڑ کر ان کی جانب بڑھا دیا۔

"آپ کی کار تھانے میں جمع ہے۔ اس کی ڈگی سے ایک لاش نکلی ہے۔" ہیری کی آواز دھیمی تھی پھر بھی کئی لوگوں نے سن لیا اور وہ سب پوری طرح ان لوگوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔

"لاش.... کس کی لاش؟" آسٹر کے لہجے میں حیرت تھی۔

ہیری نے اپنا موبائل اس کے آگے کر کے پوچھا۔
"کیا آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

"جی نہیں.... کون ہے۔" آسٹر نے نفی میں سر ہلا کر کہا۔

"اسی لڑکی کی لاش کار کی ڈگی سے نکلی ہے.... اچھا دیگر ملازمین کو بلائیں، شاید کوئی اسے پہچانتا ہو۔"

"کیلے ادھر آؤ۔" آسٹر نے ایک شخص سے کہا۔ اس کے نزدیک آنے پر بولا۔ "یہ پولیس ڈپارٹمنٹ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے سوالوں کا جواب ٹھیک ٹھیک دینا۔"

"تم اس لڑکی کو پہچانتے ہو؟" ہیری نے اسے تصویر دکھائی۔

اس نے تصویر دیکھ کر جواب دیا۔
"جی نہیں۔"

"اور اسے؟" کہہ کر ہیری نے موبائل پر ایک اور تصویر اسے دکھائی۔

"نہیں یہ کون ہے؟" کیلے کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے۔ ہیری نے موبائل آسٹر کے سامنے کر دیا۔ "آپ اسے پہچانتے ہیں؟"

"نہیں، یہ کون ہے؟"

"یہی کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس وقت اسپتال میں بے ہوش پڑا ہے۔"

"یہ نہیں کون ہے اور میری کار اسے کہاں ملی، کس نے دی۔ ڈرائیور ہی اس راز سے پردہ اٹھا سکتا ہے کہ اس نے میری کار ایک اجنبی کو کیوں دی؟"

ہیری نے آسٹر کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ کی بیگم کا انتقال کیسے ہوا؟"

"وہ ہارٹ پیشنٹ تھی۔ دل کا دورہ خطرناک ثابت ہوا۔"

"نرسنگ والے آ رہے ہیں۔ ان کے چیک کرنے کے بعد ہی آپ ڈیڈ باڈی لے جائیں گے۔" پھر کیلے کی طرف مڑ کر اس سے بولا۔ "یہ بتاؤ کل تم نے کتنے بجے ڈیوٹی ختم کی تھی؟"

"کل ہمارا بچہ اسپتال میں تھا.... شام کو میڈم سے چھٹی لے کر گھر چلا گیا تھا۔"

"میری بیوی طبعی موت مری ہے اور آپ اس کے کفن دفن میں رخنہ ڈال رہے ہیں۔ نرسنگ والے میت لینے آتے ہی ہوں گے۔"

"قانون کے نام پر میں آپ سے تعاون کی درخواست کرتا ہوں کیونکہ آپ کی بیگم کل رات تک ٹھیک تھیں۔ ان کی عمر بھی زیادہ نہیں تھی پھر یکایک وہ کیسے مر گئیں۔ اس سوال کا جواب ہم تلاش کریں گے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے میری بیگم کا مرڈر ہوا ہے جو اس طرح تفتیش کریں گے؟ آپ لوگ صرف پریشان کرنا جانتے ہیں۔" آسٹر کا لہجہ تند ہو گیا تھا۔

"قانون کے نام پر ہم نے صرف تھوڑا سا وقت مانگا ہے۔" ہیری نے شائستہ لہجے میں کہا پھر ایریا کی طرف مڑ کر بولا۔ "ان کے فون کی کال لسٹ سی ڈی آر سے منگوا لو۔" پھر اس نے آسٹر کی جانب دیکھ کر کہا۔ "پلیز آپ

ہسٹری چیک کی ہے۔ اس کا کرمنل ریکارڈ موجود ہے۔" اس نے تشویش بھری آواز میں کہا۔ "کئی بار جیل جا چکا ہے۔ گاڑیاں اسمگل کرتا ہے۔"

☆☆☆

وہ سب ہیری کے کمرے میں بیٹھے ہوئے تھے۔ نیٹی اور ایرینا سامنے والے صوفے پر تھیں جب کہ ہیری اپنی ٹیبل پر بیٹھا کچھ کاغذات کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ایڈورڈ کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی کہا۔ "سر پوسٹ مارٹم کی رپورٹ آگئی..... اس میں ایک عجیب بات ہے۔"

"لاؤ۔" کاغذ لے کر ہیری نے دیکھا پھر بولا۔

"واقعی عجیب بات ہے۔"

"لڑکی کے گلے پر چاقو کا زخم تو ہے مگر کسی کا فنگر پرنٹ نہیں ہے۔" ایڈورڈ بولا۔

"میں نے تو پہلے ہی کہا کہ چاقو دور سے پھینک کر مارا گیا ہے۔" ہیری نے کاغذ پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی دیکھیں..... لڑکی اور بیگم آسٹر کی موت کا وقت ایک ہے اور دونوں کی آنکھوں میں خوف ہے۔ یعنی دونوں کی آنکھوں کی پتلیاں سکڑی ہوئی تھیں، یعنی خوف کا عالم تھا جب دل کی دھڑکن بند ہوئی۔"

"واقعی یہ تو عجیب بات ہے۔ موت کا وقت ایک۔ موت کے بعد کی حالت ایک یعنی پتلیاں سکڑی ہوئیں۔" نیٹی نے کہا۔

"اب اس کیس کو ایک نئے زاویہ سے دیکھنا پڑے گا اس لیے کہ چاقو اسی گھر سے ملا ہے۔ فورنزک رپورٹ کے مطابق اس پر لگا خون مقتولہ کا ہے یعنی قتل اسی گھر میں ہوا ہے۔"

"سر آسٹر بھی شک کے دائرے میں آرہا ہے۔" ایرینا بولی۔

"بالکل..... اسی لیے تو اس پر نظر رکھنے کو کہا ہے۔ اس کے فون کا مکمل ڈیٹا نکلواؤ۔"

☆☆☆

نیٹی دوبارہ سے اس علاقے میں آئی ہوئی تھی جہاں فوسٹر کا گھر تھا۔ وہ سیدھا اسی جنرل اسٹور پر پہنچی تھی جس سے وہ پہلے بھی مل چکی تھی۔ جیسے ہی وہ اس دکان میں داخل ہوئی اسے دکاندار نے پہچان لیا اور دکاندار نے ہی بولا۔ "صبح بخیر مس۔"

نیٹی نے جواب دے کر کہا۔ "کیا بات ہے آج بھی فوسٹر کا مکان بند ہے۔"

"وہ اس دن کے بعد سے آیا ہی نہیں۔" دکاندار نے جواب دیا۔

"اچھا یہ بتا سکتے ہو کہ وہ کس علاقے کا ہے۔"

"مجھ سے اس کی اتنی دوستی نہیں ہے مگر وہ دیکھیں۔" کہہ کر اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ادھر سے ایک آدمی آرہا تھا۔ "وہ مسٹر بیچرڈ ہیں۔ اس کے مکان مالک۔ وہی کچھ بتا سکیں گے۔"

نیٹی نے اس شخص کی طرف دیکھا اور دکان سے باہر آگئی۔ اتنی دیر میں وہ شخص نزدیک آچکا تھا۔ نیٹی نے اس سے کہا۔ "ہم انویسٹی گیشن برانچ سے آئے ہیں۔ آپ کا کرایہ دار ایلیٹ فوسٹر کہاں ملے گا؟"

"اس نے ایک ماہ سے کرایہ نہیں دیا ہے۔ میں خود اسے ڈھونڈ رہا ہوں۔ وہ بدبخت بتائے بغیر ایریزونا بھاگ گیا۔"

"اس کے شہر کا نام؟"

"وہ صرف ہمارا کرایہ دار تھا کوئی عزیز نہ تھا کہ اس کی زندگی میں جھانکنا شروع کر دیتے۔ بس اس شخص سے واجبی سا لگاؤ تھا۔ مل گئے تو ہائے ہیلو کر لی۔ دور سے کوئی بات نہیں۔" اس شخص نے جواب میں کہا۔ "میرے پاس اتنا وقت ہی نہیں کہ کسی ایسے ویسے کے بارے میں پوچھوں۔ وہ ماہ پہلے آیا تھا ایڈوانس دیا اور رہنے لگا۔"

"کچھ تو اندازہ ہوگا وہ کہاں کا تھا۔"

"ہاں یاد آیا وہ ایریزونا کا تھا۔ کوئی چالیس میل اندر کہیں رہتا تھا۔"

"جی شکریہ۔ ابھی آپ اس کے گھر کو کھولیں گے نہیں۔ فورنزک والے اس کو چیک کریں گے۔ اگر کھول لیا تو آپ بھی ملزم کے شریک کار سمجھے جائیں گے۔ اس پر قتل کا الزام ہے۔ ہم نے اس کی تصویریں ہر ریاست کے پولیس اسٹیشنوں میں بھیج دی ہیں۔"

"اچھا وہ قاتل بھی ہے۔ ہمیں قتل دنوں سے ازلی بیر ہے۔ اس گھر کو کھولنا تو دور کی بات ہے ہم ادھر جائیں گے بھی نہیں۔"

☆☆☆

ہیری کی کار فل اسپیڈ سے بھاگ رہی تھی۔ پنجر سیٹ پر ایرینا اور پچھلی سیٹ پر نیٹی بیٹھی تھی۔ وہ لوگ اس قسم کی ڈرائیو کی عادی ہو چکی تھیں اسی لیے زبان سے کچھ نہیں بولی تھیں مگر دل ان کا بھی ڈرا ہوا رہتا تھا۔ ایرینا نے کئی بار کہا بھی کہ سر آپ اس طرح کار چلایا نہ کریں۔ حادثہ پوچھ کر نہیں ہوتا۔ اس پر ہیری کا ایک ہی جواب ہوتا کہ میں اسپیڈ میں رہ کر بھی ہر طرح سے چوکنا رہتا ہوں پھر تم نے بھی دیکھا کہ میں نے کوئی سگنل توڑا ہو یا اوور ٹیک کیا ہو۔ جس سڑک پر جتنی اسپیڈ ضروری ہے۔ قانون کے دائرے میں ہے، اتنی ہی اسپیڈ رکھتا ہوں۔ لوگ کم رکھتے ہیں اس لیے میری اسپیڈ زیادہ لگتی ہے ورنہ تو یہ نارمل اسپیڈ ہے۔"

اس وقت بھی ایرینا کا دل کر رہا تھا کہ وہ اسے سمجھائے کہ کسی جگہ ٹریفک کا قانون ٹوٹ گیا تو پھر کیس لمبا کھنچ جائے گا کیونکہ ان کا کام قانون کی پاسداری ہے اور یہ خود قانون توڑ رہا ہے۔ ہیری کی بات میں دم ہوتا ہے۔ اپارٹمنٹ سات کلو میٹر تھا لیکن دوسرے لوگ تو چالیس پر چل رہے ہیں اس لیے ہیری کو بھی چالیس پر ہی چلنا چاہیے۔ لیکن وہ کسی کی سنتا کب تھا۔ اسی اسپیڈ میں وہ آسٹر کے گھر تک پہنچ گیا۔ مین گیٹ کھلا ہوا تھا، وہ اپنی کار اندر تک لیتا گیا۔ روش پر کار کھڑی کر کے وہ اترا۔

اسے دیکھ کر گارڈ اس کی کار کے نزدیک چلا آیا۔ ہیری نے کار سے نیچے قدم رکھتے ہوئے گارڈ سے کہا۔

"میں آج تم سے ملنے آیا ہوں۔"

"مجھ سے؟" اس کی آنکھوں میں حیرت تھی۔

"ہاں تم سے؟" ہیری نے مسکرا کر کہا۔

"پوچھیں!"

"جس لڑکی کی لاش ملی ہے وہ اس گھر میں آئی تھی اور یہیں اس کا قتل ہوا۔ اسے یہیں گاڑی کی ڈکی میں ڈالا گیا اور تم کہتے ہو اس لڑکی کو تم نے دیکھا ہی نہیں۔"

"جی میں نے اس کو نہیں دیکھا۔ ہم اس رات ڈیوٹی پر نہیں تھے۔ بچہ بیمار تھا..... اس کے ساتھ اسپتال میں تھا یہ پہلے بھی بتا چکا ہوں۔" گارڈ نے کہا۔

بھی نیٹی نے سرگوشی میں کہا۔ "ہم نے اس کے محلے میں اور اسپتال میں معلوم کیا۔ اس کا ماضی بے داغ ہے۔ وہ اس رات واقعی اسپتال میں تھا۔"

"او کے۔" ہیری نے بھی سرگوشی میں جواب دیا۔

"جس دن تم نہیں ہوتے تھے اس دن کون تمہاری جگہ پر ہوتا ہے؟" ایرینا نے سوال کیا۔

"فوسٹر۔ میں پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ میری غیر حاضری میں وہ گیٹ پر بیٹھ جاتا تھا..... اس دن بھی ہم نے اس کو چابی کا گچھا دیا۔ ضروری باتیں سمجھا دیں تاکہ اسے کوئی پریشانی نہ ہو۔"

ہیری نے لمبی سانس لے کر کہا۔ "ایرینا، نیٹی آؤ چلتے ہیں۔" پھر اس نے گارڈ کی طرف دیکھ کر کہا۔ "جب تک ہم نہ کہیں تم شہر سے باہر نہیں جاؤ گے۔"

اسی وقت آسٹر گھر سے باہر آتا نظر آیا۔ اسے دیکھ کر ہیری نے سیٹی بجانے کے انداز میں ہونٹوں کو سکوڑا پھر اس کی جانب بڑھ گیا۔

"آپ لوگوں کو میں نے کیمرے میں دیکھا۔ تب سے اندر ڈرائنگ روم میں انتظار کر رہا تھا۔ جب آپ لوگ اندر نہیں آئے تو میں خود باہر آگیا۔ آیئے اندر بیٹھتے ہیں۔"

"میں یہاں آیا تھا صرف گارڈ سے کچھ سوالات تھے اس کے لیے لیکن آپ نے بلا لیا تو چلیں ایک کپ کافی پی لیتے ہیں۔" ہیری نے کہا اور اس کی جانب قدم بڑھا دیے۔

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔" کہتے ہوئے آسٹر نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیے۔ دونوں آگے پیچھے اندر کی جانب بڑھتے چلے گئے۔ ان کے پیچھے نیٹی اور ایرینا تھیں۔

"میں ایک دو سوال آپ سے بھی کر لینا چاہتا ہوں۔" ڈرائنگ روم میں داخل ہوتے ہوئے ہیری نے کہا۔

"ہاں ہاں ضرور۔" آسٹر نے بیٹھتے ہوئے کہا۔

آسٹر اسی صوفہ پر بیٹھ گیا تھا جس پر ہیری بیٹھا تھا جب کہ نیٹی اور ایرینا سامنے والے صوفے پر بیٹھیں۔

"در اصل میں آپ سے ایک پرسنل سا سوال کرنا چاہتا ہوں۔" ہیری نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"جی ضرور پوچھیں۔" آسٹر نے کہا۔

"آپ دوسری شادی کب کر رہے ہیں؟" ہیری نے اچانک سوال کر دیا۔ اس سوال پر آسٹر چونک گیا۔

حیرت بھرے انداز میں آسٹر نے سوال دوہرایا۔ "دوسری شادی..... ابھی میری بیگم کے انتقال کو دن ہی کتنے ہوئے ہیں اور آپ دوسری شادی کا کہہ رہے ہیں؟"

"اس لیے پوچھا کہ آپ اتنی بڑی زندگی اکیلے کیسے گزاریں گے؟"

"گزر ہی جائے گی۔" اس نے مرے مرے لہجے میں کہا۔

"ہماری معلومات کے مطابق آپ نے اس فیکٹری

میں بطور پرچیزنگ آفیسر جوائننگ دی تھی۔ پھر اس فیکٹری کے مالک کی اکلوتی بیٹی نے آپ کو پسند کر لیا اور آپ نے اس سے کورٹ میرج کر لی۔ ایک ہی جھٹکے میں آپ اس فیکٹری کے مالک بن گئے۔"

"میں سمجھا نہیں...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"اگر میری باتیں جھوٹ ہیں غلط ہیں تو بتائیں...... ویسے آپ کے سسر صاحب کا انتقال کیسے ہوا تھا؟" ہیری نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔

"ہارٹ اٹیک سے اور اس وقت میں نیویارک میں تھا۔ پارٹی ڈیلنگ تھی۔"

"بالکل صحیح اسی لیے کسی کو شک نہیں ہوا کہ ان کی موت غیر طبعی ہے۔" ہیری نے انکشاف کرنے والے لہجے میں کہا تو آسٹر گویا اچھل پڑا۔

اس نے ہکلاتے ہوئے کہا۔ "یہ...... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"ارے یہ آپ کو پسینے کیوں آ رہے ہیں...... طبیعت تو ٹھیک ہے...... یہ لیجیے ٹشو۔" کہہ کر اس نے ٹشو کا پیک بڑھا دیا۔ آسٹر نے ایک ٹشو کھینچا اور پیشانی کو پونچھ کر اسے ڈسٹ بن میں پھینک دیا۔ اور نقاہت بھری آواز میں کہا۔

"دراصل میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔"

"ایسی کوئی بات تھی تو بتانا تھا...... میں ایسا کوئی سوال نہیں کرتا۔ خیر اب ہم چلتے ہیں۔ کافی کا شکریہ۔ ایک استدعا ہے کہ آپ شہر سے باہر جانے کی کوشش نہیں کریں گے اس لیے کہ اس مقتولہ کے متعلق کچھ پوچھنا پڑ سکتا ہے۔ اس کا قتل معما بنا ہوا ہے۔" کہتے ہوئے وہ کھڑا ہو گیا۔

اس کے اشارے پر نیتی نے کمال مہارت سے سب کی نظر بچا کر ڈسٹ بن میں پھینکا گیا ٹشو پیپر اٹھا کر اپنے بیگ میں رکھ لیا۔ ٹشو اٹھانے کے لیے نہایت پھرتی سے اس نے دستانے پہنے تھے۔ اور اب وہ ہیری اور آسٹر کے پیچھے پیچھے باہر کی جانب بڑھ رہی تھی۔

"چلو چلتے ہیں۔" اس نے اریبا اور نیتی سے کہا پھر گارڈ کی طرف دیکھ کر بولا۔ "میں پھر کہہ رہا ہوں کہ جب تک ہم نہ کہیں تم شہر سے باہر نہیں جاؤ گے۔"

باہر آ کر کار میں بیٹھتے ہوئے ہیری نے کہا۔ "کچھ بھی ہو گارڈ کو نظر میں رکھنا ہے۔"

"جی بہتر ہے۔" نیتی نے کہا۔

☆☆☆

ہیری اپنے گھر میں بیٹھا ایک فائل سے کچھ پڑھ رہا تھا۔ اس کے سامنے والے صوفے پر نیتی اور اریبا بیٹھی مدھم آواز میں باتیں کر رہی تھیں اس نے انہیں صبح ہی صبح فون کر کے بلالیا تھا۔ ان کی باتیں جاری تھیں کہ فون کی گھنٹی بجی۔ ہیری نے فون اٹھالیا۔ ادھر سے کہا گیا کہ ایڈم کو ایری زونا سے گرفتار کرلیا گیا ہے۔ اسے بھیجا جا رہا ہے۔

ہیری نے ان دونوں کی طرف دیکھ کر کہا۔ "ہری اپ اٹھو اور چلو۔ شاید کچھ نیا ہمارا انتظار کر رہا ہے۔"

کہہ کر اس نے ہینگر سے کوٹ اٹھایا...... اور سر پر ہیٹ لگا کر باہر کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں بھی اس کے ساتھ چل پڑیں۔ باہر آ کر وہ دونوں ہیری کی کار میں بیٹھ گئیں۔

کار اسٹارٹ کرتے ہوئے ہیری نے کہا۔ "تو سٹر کو بائی ایئر بھیجا گیا ہے۔ بس کچھ ہی دیر میں وہ پہنچ جائے گا۔"

ہیری عادت کے مطابق تیز رفتاری سے چلتا رہا۔ کچھ ہی دیر میں وہ سب ہیڈ آفس کی بلڈنگ میں پہنچ گئے۔

کار سے اتر کر وہ تینوں لفٹ کے ذریعہ فرانسک ڈپارٹمنٹ میں پہنچے۔ دروازہ کھولتے ہی سامنے ایک لیبارٹری کا منظر تھا۔ وہ ایک جدید لیبارٹری تھی۔ کئی ایک آدمی مختلف مشینوں پر تجربوں میں مصروف تھے۔ ہیری اور اریبا اندر داخل ہوئے۔ انہیں دیکھ کر تجربے میں مصروف افراد نے ایک نظر ان پر ڈالی اور پھر اپنے کام میں مصروف ہو گئے۔ وہ دونوں ایک بارعب شخص کی جانب بڑھے جو ایک اسکارف کو مائیکرواسکوپ کے نیچے رکھے کچھ دیکھ رہا تھا۔ نزدیک پہنچ کر ہیری نے کہا۔ "گڈ مارننگ مسٹر پارکس۔"

مسٹر پارکس نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا پھر مسکرا کر بولا۔ "میں ابھی آپ کو کال کرتا۔ اس اسکارف نے تو آدھا کیس حل کر دیا ہے۔"

"مجھے بھی یہی امید تھی۔ آپ جیسا زیرک آدمی ہمارے ساتھ ہو تو جرم کا گراف خود بخود کم ہوتا چلا جائے گا۔"

"اس اسکارف سے دو مختلف آدمیوں کے ڈی این اے ملے ہیں۔ رپورٹ میں تیار کر دوں گا۔ بس دو ایک ٹیسٹ اور کرلوں۔"

"میں آپ کی رپورٹ کا بے صبری سے منتظر ہوں۔"

"آپ نے جو حالات بتائے، اس کے مطابق تو



عورت کا مرض خطرناک اسٹیج پر تھا۔" پارکس نے کہا۔

"جی ہاں اس کے دفتر کے لوگوں نے اور پاس پڑوس کے گھروں میں کام کرنے والیوں نے بتایا کہ مسز آسٹر بہت زیادہ بدزبان اور چڑچڑی تھیں، ذرا ذرا سی بات پر اکڑ جاتی تھیں۔ کئی بار نوکرانیوں پر تیز غصہ بھی دکھا چکی ہیں۔"

"کیا وہ خوفزدہ بھی رہتی تھیں؟" پارکس نے پوچھا۔

"چوکیدار اور میڈ نے بتایا کہ وہ ماسیوں کو کام کرنے کا کہہ کر اپنے کمرے میں بند ہو جاتی تھیں...... پھر جب میڈ جانے لگتی تب وہ دروازہ کھولتی اور اس کے کام میں مین میخ نکالنے لگتی۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں کوئی میڈ زیادہ دن ٹکتی نہیں تھی۔ کئی نوکری دینے والی کمپنیوں نے ان سے بازپرس بھی کی تھی۔"

"بات کچھ کچھ سمجھ میں آ رہی ہے۔ دراصل وہ بیماری کا شکار تھیں۔ اس مرض کو میڈیکل ٹرم میں Agoraphobia کہتے ہیں۔ اپنے لوگوں کو بھیڑ سے ڈر لگتا ہے۔ عام طور سے مریض اس وقت سینے میں درد۔ دل کی دھڑکن کا تیز ہو جانا۔ تیزی سے پسینا آنا کی شکایت کرتا ہے۔ دھڑکن اگر بہت زیادہ تیز ہو جائے تو مریض مر بھی سکتا ہے مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔"

"تو کیا اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا ہوگا؟" ہیری نے پوچھا۔

"جب پوسٹ مارٹم رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اس کی موت دل کی حرکت رک جانے سے ہوئی ہے تو ایسا ممکن ہے۔ اس نے ایسا کچھ دیکھا کہ اس کی دھڑکن تیز ہوئی۔ اسی وقت کوئی اور بات ہوئی جس کا سیدھا اثر دل پر پڑا اور حرکت رک گئی۔"

"او کے ڈاکٹر...... آپ کا شکریہ...... جلد ایک بار پھر آپ کو تکلیف دیں گے۔ کچھ اور باتوں پر تبادلہ خیال کریں گے۔ فی الحال تو انویسٹی گیشن روم میں چلیں۔ ملزم کو لایا جا رہا ہے۔"

"ایسا کرو کہ اسے اسپیشل کمرے میں لے جاؤ میں وہیں آ جاؤں گا۔" اس بارعب شخص کی بات سنتے ہی وہ دونوں مڑ گئے۔ اس لیبارٹری سے باہر نکل کر انہوں نے کوریڈور میں قدم رکھا تھا کہ ان کی نظر سامنے سے آتے ڈیوڈ پر ٹھہر گئی۔ وہ تیز تیز قدموں سے انہی کی طرف بڑھا چلا آ رہا تھا۔ اس نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ "سر ملزم آ چکا ہے۔"

"اسے انویسٹی گیشن روم میں لے آؤ۔" کہہ کر وہ

## فارقلیط

انجیل مقدس میں رسول اکرمؐ کا نام۔ "ڈکشنری آف اسلام" میں لکھا ہے کہ یہ عبرانی لفظ "pardclete" کی عربی شکل ہے۔ اس لفظ کے معنی اور تشریح میں سخت اختلاف ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ اس کے معنی "ہمدرد" کے ہیں۔ موجودہ عیسائی اس کے معنی "روح القدس" لیتے ہیں۔ فرضیکہ یہ لفظ بحثوں اور مناظروں میں بہت کھینچاتانی کا موجب بنا ہوا ہے۔ اس بحث کا آغاز انجیل یوحنا کے چودھویں باب کی سولہویں آیت سے ہوتا ہے۔ وانا من الاب فیو طیکم فارقلیط "(ترجمہ: اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے) اس کے بعد سترہویں آیت ہے۔ "یعنی روح حق جسے دنیا حاصل نہیں کر سکتی۔" یہ ایک قابل غور حقیقت ہے کہ آیت سابق میں "فارقلیط" کا ترجمہ ہمدرد کیا جاتا ہے اور اگلی آیت میں اسی لفظ کا ترجمہ "روح القدس" کیا گیا ہے۔ "اردو انسائیکلوپیڈیا" کے مطابق "ایک اور نسخے میں اس کے معنی زندگی کی پاک روح کے لیے گئے ہیں جو انجیل 1907ء میں رائج تھی، اس میں سترہویں آیت تھی ہی نہیں۔ یہ آیت بعد میں تشریح کے طور پر بڑھائی گئی۔" مسلمان کہتے ہیں کہ فارقلیط کے معنی احمد کے ہیں۔ مسلمان مصنفین کا دعویٰ ہے کہ قرآن مجید کی سورۃ الصف کی چھٹی آیت میں جس رسول کی خوشخبری دی گئی ہے اور جس کا نام احمد بتایا گیا، وہ فارقلیط ہی ہے۔

مرسلہ: نازش گل، لاہور

سے کام لیا تھا مگر قسمت دھوکا دے گئی۔ اب بھی وقت ہے کہ سچ بتا دیں۔" ہیری نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

"پوچھیں کیا پوچھنا ہے۔" آسٹر نے مردہ لہجے میں کہا۔

"فنگر پرنٹ سے ڈی این اے ٹیسٹ تک سب آپ کو مجرم بتا رہے ہیں اس لیے سچ اگل دیں۔ آپ نے لڑکی کو کیوں اور کس طرح قتل کیا؟"

"میں تو لڑکی کو جانتا بھی نہیں تھا۔" آسٹر نے کہا۔

"وہ اتفاقیہ قتل ہوگئی۔"

"ایک انجان لڑکی کیسے قتل ہوگئی۔ کھل کر بتائیں کہ یہ سب ہوا کیسے؟ کس طرح؟"

"میری بیوی زبان کی بہت تیز تھی۔ میں نے زندگی خوشگوار بنانے کے لیے اس سے شادی کی تھی مگر......"

"شادی کے بعد آپ نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سسر کو راستے سے ہٹا دیا۔" ہیری نے چبھتے ہوئے لہجے میں کہا۔

آسٹر نے سر جھکا لیا۔

"آپ کو معلوم تھا کہ آپ کے سسر دل کے مریض ہیں اس لیے آپ نے نیویارک پہنچ کر سسر کو فون کیا کہ جرمن کی فرم نے کمپنی پر کیس دائر کر دیا ہے کہ کپڑے میں رنگائی کے لیے جو کیمیکل استعمال ہوا ہے وہ زہریلا ہے۔ فرم نے عدالت میں جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ وہ دو لاکھ ڈالر کا مطالبہ کرنے والے ہیں۔ یہ خبر سنتے ہی ان کا ہارٹ فیل ہوگیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔"

آسٹر کا سر مزید جھک گیا۔

"اب اس کمپنی کی مالک آپ کی بیوی تھی۔ آپ کو پوری امید تھی کہ اب یہ دولت آپ کی ہے مگر ہوا الٹا۔ بیگم سانپ بن کر بیٹھ گئی۔ وہ آپ کو گھر کا کتا سمجھنے لگی تھی اسی لیے آپ نے اسے بھی راستے سے ہٹانے کا طریقہ ڈھونڈنا شروع کر دیا...... ہے نا؟"

آسٹر نے اثبات میں سر ہلایا۔

"مگر اس لڑکی کا خون کیوں ہوگیا۔ اس پر آپ خود روشنی ڈالیں۔"

آسٹر نے گہری سانس لے کر کہا۔ "یہ بات سچ ہے کہ میری بیوی میری ہو کر بھی مجھ پر بادشاہت کر رہی تھی۔ اپنا غلام سمجھتی تھی۔ مجھے پتا تھا کہ Agoraphobia موروثی طور پر اس کو بھی ہے۔ باپ کی طرح یہ بھی انجانے خطرے کے شک میں مبتلا ہے اس لیے اگر اسے خوف دکھایا جائے تو اس کا ہارٹ بھی فیل ہو سکتا ہے۔ میں نے پلاننگ شروع کر دی۔ کچھ دنوں تک اسے سناتا رہا کہ کوئی مجرم ہمارے پیچھے پڑ گیا ہے۔ وہ دھمکی دے رہا ہے کہ اگر دو لاکھ ڈالر زاسے نہیں دیے گئے تو وہ ہمیں قتل کر دے گا۔ خوف سے وہ کمرے میں بند رہنے لگی تھی۔ پھر ایک دن جب گارڈ اپنے بیٹے کی بیماری کی وجہ سے اسپتال میں تھا۔ گھر بالکل خالی تھا۔ ڈرائیور گیٹ پر گارڈ کی کمی کو پورا کرنے کے لیے بیٹھا ہوا تھا۔ میں نے منصوبے پر عملدر آمد شروع کر دیا مگر مجھے خبر نہ تھی کہ آج سے بیوی نے ایک نئی میڈ رکھ لی ہے جو اندر صفائی کر رہی ہے۔ میں ہر جانب سے بے پروا چاقو کھولے بیوی کی طرف بڑھ رہا تھا اور بیوی خوف سے کانپتے ہوئے پیچھے ہٹ رہی تھی۔ میں دھمکی دیتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا کہ میں تجھے قتل کروں گا۔ لوگ یہی سمجھیں گے کہ دھمکی دینے والے نے تمہیں قتل کیا ہے۔ تبھی عقب سے آواز آئی۔ "میں اب جاؤں؟" میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ نئی میڈ تھی جو میرے ہاتھ میں چاقو دیکھ کر چیخنے لگی تھی۔ اس کی چیخ نے مجھے گھبرا دیا اور میں نے چاقو پھینک مارا۔ پھر مڑ کر بیوی کو دیکھا۔ وہ سینہ پکڑے گر رہی تھی۔ ادھر سے نظریں ہٹا کر میں نے مڑ کر میڈ کو دیکھا۔ چاقو اس کے گلے میں پیوست ہوگیا تھا۔ وہ زمین پر گری ہوئی چھٹ پٹا رہی تھی۔ میں تڑپتی ہوئی میڈ کے قریب گیا۔ سانس کی رفتار دیکھی پھر اسے گود میں اٹھا کر باہر لے آیا اور ڈکی میں رکھ کر ڈکی بند کر دی۔" آسٹر نے کہہ کر ایک اور گہری سانس لی پھر بولا۔

"میں میڈ کو ڈرانا چاہتا تھا۔ یہ اتفاق ہے کہ چاقو اس کی گردن میں لگ گیا اور وہ مر گئی۔ اس کی لاش کو چھپانے کے لیے میں نے فارم ہاؤس لے جانا مناسب سمجھا۔ ابھی لے جاتا کہ ڈرائیور کا خیال آگیا اور میں نے اس کے ذریعہ گاڑی بھجوا دی۔ وہ وہاں گاڑی کھڑی کر آتا۔ موقع دیکھ کر میں وہاں جاتا اور لاش کو وہیں دبا دیتا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔"

"مگر قسمت نے دھوکا دے دیا... کیونکہ جرم کبھی چھپتا نہیں ہے، جتنا چھپانے کی کوشش کریں گے اتنا ہی ابھر کر سامنے آئے گا۔ لاش تو ڈکی میں بند ہوگئی مگر گلے میں پھنسا چاقو جھاڑیوں میں گر گیا۔ باقی تفصیل عدالت میں سنائیے گا۔ سلاخیں آپ کو بلا رہی ہیں۔" کہہ کر اس نے اپنے ساتھی کو اشارہ دیا اور اس نے فوراً ہی آسٹر کے ہاتھ میں ہتھ کڑی پہنا دی۔

++

لیپاری سے فرار قریب ناممکن ہے۔ لوسو
روزلی اور تھیا پہلے قیدی تھے جو اس تنہا جزیرے سے فرار
ہونے اور اجنبی سرزمین پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے۔
افسوس کہ ہم آخری فراری تھے!

جولائی 1928ء کے وسط میں جب ہم اپنے فرار
کے منصوبوں پر سوچ بچار کررہے تھے تو ہمیں الفانسو مائیکل
اگنولی ایک نوجوان طالب علم، ماریو نیگری اینزیو کے نچن
کے ایک سپاہی، جیوانی کیپا ایک سابق فوجی افسر اور ڈوماچی

# قید سے فرار

فرزانہ نکہت

ایسے قیدی جو خطرناک ہوں ان کے لیے کسی دور دراز کے جزیروں پر خصوصی جیل بنائی جاتی تھی جیسے برصغیر کے قیدیوں کے لیے انڈیمان پر خصوصی جیل تھی۔ یورپ میں ایسی ہی ایک جیل لیپاری میں تھی جہاں سے فرار نا ممکن تھا۔ مگر چند قیدیوں نے ناممکن کو ممکن کردکھایا۔ اس طرح سے فرار ہوئے کہ جزیرے پر موجود چارسو سے زیادہ پہرے دار منہ دیکھتے رہ گئے۔

مہم جوئی کی کہانیاں پڑھنے والوں کے لیے دلچسپ کہانی

کے فرار کی کوشش نے چونکا دیا۔

انہیں سیاسی وجوہات کی بنا پر جلاوطنی کی سزا دی گئی تھی لیکن ڈوماچی کا معاملہ کچھ زیادہ ہی سنگین تھا۔ اسے حکومت کے خلاف سازش کرنے کے الزام میں پندرہ سال قید کی سزا سنائی گئی تھی۔ وہ خاموش طبع ذہین اور کم گو نوجوان تھا۔ اسے پہلے صرف ایک سال جلاوطنی کی سزا سنائی گئی تھی۔ جب وہ یہ سزا بھگت رہا تھا تو اس کی ماں جو روم میں رہتی تھی۔ شدید بیمار ہوگئی۔ اس نے مسولینی سے درخواست کی کہ اس سے قبل کہ وہ مرجائے اسے اپنے بیٹے سے خواہ ایک گھنٹے کی ہی کیوں نہ ہو، ملاقات کی اجازت دے دے۔ ڈوچے مسولینی نے اس کی درخواست مان لی اور ڈوماچی کو اپنی ماں سے آخری ملاقات کرنے کی اجازت دے دی لیکن لیپاری واپس کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اسے گرفتار کرلیا گیا اور روم واپس لایا گیا۔ اس پر الزام تھا کہ اپنی قریب المرگ ماں کے پاس گزارتے ہوئے وقت کے دوران وہ حکومت مخالف افراد سے ملاقاتیں اور حکومت کے خلاف سازشیں کرتا رہا تھا۔ یہ جرم ثابت ہونے پر اسے پندرہ سال قید کی سزا سنادی گئی۔ اسے لیپاری کے قلعے میں قید کردیا گیا۔ اس قلعے میں اس کی ملاقات منیاپا اور اکتوکی سے ہوئی۔ ان تینوں نے مل کر قلعے سے فرار کا منصوبہ بنایا اور پہلے ہی موقع پر اس پر عملدرآمد کا فیصلہ کرلیا۔ اس موقع پر ان کا چوتھا ساتھی ماریو میگری بھی ان سے آن ملا۔ وہ قلعہ روم میں گیبریل ڈی انیزیو کے نجی توپ خانے کا سابق کپتان تھا جس نے جنگ میں اپنی بے مثال شجاعت سے بڑی شہرت کمائی تھی لیکن پھر وہ ڈی انیزیو کے خبط عظمت، بے پناہ خود پسندی اور کرپشن سے بددل ہوکر اسے چھوڑ کر جنوبی اٹلی جا پہنچا تھا۔

اس کی مہم جویانہ طبیعت وہاں سے اسے مراکو لے گئی جہاں وہ غازی عبدالکریم ریفی کی فوج میں بھرتی ہوگیا جو ان دنوں ہسپانوی اور فرانسیسی افواج کے خلاف برسرپیکار تھے۔ اس نے غازی کے توپ خانے کی کمان اپنے ہاتھ میں لے لی اور کئی موقعوں پر اپنے آپ کو میدان شجاعت میں منفرد و ممتاز ثابت کیا اور عرب سرداروں کی داد و تحسین سمیٹی۔ وہ آخری معرکے تک عرب سرداروں کے ساتھ رہا۔ اس کے بعد وہ اٹلی چلا آیا۔

1921ء میں اسے میلان میں گرفتار کرلیا گیا۔ اس پر فاشزم کے خلاف ڈی انیزیو کے سپاہیوں کو بغاوت پر اکسانے کا الزام لگا تھا۔ جبکہ حقیقت یہ تھی کہ مسولینی کے پرانے حامی اب فاشزم کے خلاف ہوتے جارہے تھے۔ میگری اب بھی پونزا میں قید ہے۔

ایک رات یہ چاروں قیدی اپنی کوٹھری سے نکلے اور قلعے کے صحن کی بلند دیوار پر چڑھے اور رسیوں کی مدد سے جو انہوں نے اپنے بستروں کی چادروں سے پھاڑ کر بنائی تھیں۔ محافظوں کی نظروں سے بچ بچا کر دوسری طرف اتر گئے۔ میگری نے ایک راہب کا بھیس بدلا ہوا تھا جبکہ ڈوماچی نے عورتوں کے کپڑے پہن رکھے تھے۔ وہ مخفی دشمنوں سے بچتے بچاتے گاؤں سے گزر کر کھلی جگہ پر آن پہنچے۔ ان کا منصوبہ کوئی کشتی حاصل کرکے سسلی کے ساحل پر پہنچنے کا تھا۔

مگر بدقسمتی سے ان کی یہ جرأت مندانہ مہم جوئی ناکام ہوگئی۔ ان کے قلعے سے فرار ہونے کے فوراً بعد الارم بجنا شروع ہوگئے اور مسلح نگراں دستوں نے ان کی تلاش میں گاؤں اور آس پاس کے علاقوں کو کھوجنا شروع کردیا اور پولیس کی کشتیوں نے طاقتور سرچ لائٹوں سے جزیرے کے گرد چکر لگانے شروع کردیے۔

روزیلی، لوسو اور میں اپنے جزیرے سے فرار کے منصوبے کے بارے میں صلاح مشورہ کرتے ہوئے ہر چیز کا بغور جائزہ لے رہے تھے۔ ہم نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ جب الارم بجنا شروع ہوتے تھے تو پولیس والوں نے ہماری کوٹھریوں میں جھانکنا شروع کردیا تھا کہ آیا ہم وہاں موجود تھے یا نہیں۔ اس کا مطلب تھا ہم بھی اب ان کے نزدیک مشتبہ بن چکے تھے۔

پانچ دنوں تک جزیرے کے اندر ہی اندر چکراتے رہنے کے بعد ڈوماچی اور اس کے ساتھی پھر گرفتار ہوگئے۔

اس قبل از وقت کی ناتجربہ کارانہ کوشش سے ہمیں جو ایک سبق ملا وہ یہ تھا کہ ہم اگر کامیاب ہونا چاہتے ہیں تو ہمیں جلد از جلد اپنے منصوبے پر عملدرآمد کرڈالنا چاہیے کیونکہ فرار کی ہر کوشش محافظوں کو زیادہ سے زیادہ چوکنا اور ہوشیار کیے دے رہی تھی۔ سنتریوں کی تعداد دوگنی کردی گئی تھی اور پولیس کی کشتی لانچیں ہمیشہ جزیرے کے گرد چکر لگاتی رہتی تھیں۔ اکثر راتوں کو ہم اپنی کوٹھریوں میں نگرانوں کے اچانک داخل ہوجانے پر نیند سے بیدار ہوجایا کرتے تھے جو یہ دیکھنے آیا کرتے تھے کہ آیا ہماری گنتی پوری تھی یا نہیں۔ جزیرے کے گورنر نے بڑے سخت الفاظ میں وارننگ دے رکھی تھی کہ کوئی قیدی لیپاری سے فرار ہونے کی



کوشش نہ کرے ورنہ سخت سزا پائے گا۔

پھر بھی لوسو، روزیلی اور میں نے جزیرے سے فرار کے منصوبے کے بارے میں اپنی خفیہ کانفرنس جاری رکھیں۔ فرار کے اس منصوبے میں اب ایک چوتھا آدمی بھی شامل ہوچکا تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں اس کا نام نہیں بتاسکتا۔ کیونکہ یہ وہ آدمی تھا جو چند ماہ بعد ذاتی طور پر ہمیں اس جزیرے کی جیل سے رہا کروانے کے لیے بڑے بھیانک خطرات کا سامنا کرتا رہا تھا۔ ہم اسے "فورچونو" کہہ سکتے ہیں۔ وہ لیپاری میں دو سال سے تھا۔ وہ بے حد ذہین و فہیم اور اعلیٰ تصورات و تخیلات کا حامل تھا۔ عنفوان شباب میں وہ ایک مزدور ہوا کرتا تھا اور اطالوی پرولتاری بھی زندگی گزارا کرتا تھا۔ پھر اس نے بڑی محنت سے اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔ نیچرل سائنس، فلسفہ، تاریخ اور سوشل اکانومی جیسے مضامین پر اسے کامل دسترس حاصل تھی۔

اٹھارہ سال کی عمر میں وہ ایک جمہوری پارٹی میں شامل ہوگیا۔ اس پر اس نے سیاہ پوشوں سے خوب مار کھائی، اسے بار بار گرفتار کیا گیا اور طویل مدت کے لیے جیل میں جھونک دیا گیا۔ وہ شریف اور بہادر بھی تھا اور حلیم الطبع بھی۔

وہ وہاں اپنی جلاوطنی کے آخری دن گزار رہا تھا۔ اسے دسمبر 1928ء میں لیپاری سے رخصت ہوجانا تھا لیکن اس وقت وہ ہمارے ساتھ فرار کے منصوبے میں شامل ہوچکا تھا۔ اس کی ایسی سخت نگرانی نہ کی جاتی تھی اس لیے اس کے لیے ہمارے منصوبے پر محنت کرنا اور باہر کی دنیا سے رابطہ قائم کرنا زیادہ آسان تھا جو ہماری کامیابی کے لیے انتہائی ضروری تھا۔

1928ء کے موسم گرما میں رابطے کا یہ نظام جس کی تفصیلات میں اس لیے نہیں بتانا چاہتا کہ یہ دوسرے جلاوطنوں کے لیے فرار کی راہ آسان اور کامیاب بنادیں گے، انتہائی تسلی بخش طور پر کام کررہا تھا۔ پھر بھی ہم خوش اور خوف زدہ تھے کہ کہیں کوئی حادثہ ہماری مہینوں کی جاں گسل کوششوں پر پانی نہ پھیر دے اور ہمیں اور ہمارے ان دوستوں کو جنہوں نے ہماری مدد کا وعدہ کررکھا تھا، ہلاکت میں نہ ڈال دے۔

اپنے حتمی منصوبے پر عملدرآمد سے پہلے ہم نے مختلف اسکیموں پر غور و خوض کیا جن میں بعض کے بارے میں غالباً کبھی سوچا جاسکتا تھا۔ ایک اسکیم یہ تھی کہ ہم ہائیڈرو پلین (آبی ہوائی جہاز) کے ذریعے فرار ہوں۔ اس جہاز کو ہمارے دوست سمندر میں اس وقت اتار دیتے جب ہم وہاں غسل کررہے ہوتے۔ ہم تیزی سے تیرتے ہوئے اس جہاز تک پہنچ جاتے اور اس سے قبل کہ ہمارے محافظ اپنے بجرے سے باہر نکلتے ہم اس پر سوار ہوکر وہاں سے پرواز کرجاتے۔ محافظ جہاز پر فائرنگ کرسکتے تھے لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ اسے نشانہ بنانے میں کامیاب ہوسکتے۔ ہم نے سمندر پار اپنے دوستوں سے اس اسکیم کے بارے میں رابطہ کیا لیکن پھر اسے ترک کردیا۔

لوسو کے پاس اس کی بے خوف ہمت و جرأت سے مطابق ایک منصوبہ موجود تھا۔ وہ یہ کہ رات ہوتے ہی ہم بندرگاہ پر پہنچ جائیں اور وہاں موجود ایک پولیس موٹر بوٹ پر قبضہ کرلیں اور اس میں سوار ہوکر فرار ہوجائیں۔ اس نے کہا کہ ان کشتیوں کی بھی کسی گارڈ کے ذریعے نگرانی کی جاتی تھی۔ جنگ کے زمانے میں وہ ایسے ہی کئی کارنامے انجام دے چکا تھا اور اب اس نئی مہم کے لیے پُرجوش ہورہا تھا۔ مجھے اس کی اسکیم کے قابل عمل ہونے پر یقین تھا ہرچند کہ اس میں سنگین خطرات تھے لیکن جب ہمیں اٹلی میں موجود اپنے دوستوں کی طرف سے یہ خبر ملی کہ وہ ایک زبردست طاقت والی موٹر بوٹ لے کر ہمیں جزیرے سے فرار کروانے آرہے تھے تو ہم نے اس اسکیم کو چھوڑ دیا۔ انہوں نے ہمیں پیغام بھیجا کہ ہم انہیں اس جگہ کے بارے میں ٹھیک ٹھیک معلومات بہم پہنچائیں جہاں ہمیں ان کا انتظار کرنا تھا۔ نیز ساحل کی نگرانی کرنے والی پولیس کی کشتیوں اور جنگی جہازوں کے گشت کے بارے میں بھی درست اور صحیح معلومات مہیا کریں۔

ہم نے خفیہ ذرائع سے انہیں تمام مطلوبہ معلومات مہیا کیں اور جزیرے کا ایک بڑا سا نقشہ بھی انہیں بھجوادیا۔

یہ کام بے حد خطرناک اور مشکل تھا۔ ولکانو کے چھوٹے سے جزیرے پر جہاں لیپاری سے چند میل کی دوری پر ایک زندہ آتش فشاں پہاڑ موجود تھا۔ جزیرے کا ایک سگنل اسٹیشن بھی واقع تھا۔ وہاں سے لیپاری کی طرف جانے والے ہر جہاز کے بارے میں لیپاری میں واقع پولیس ہیڈکوارٹر کو اطلاع دی جاتی تھی۔ جزیرے کے قریب سے گزرنے والے ہر جہاز سے پولیس حکام کو سگنل بھیجے جاتے تھے۔ رات کے وقت ولکانو کی چوٹیوں سے ایک طاقتور سرچ لائٹ گھومتی ہوئی سمندر میں دور دور تک روشنی

دائی رہتی تھی۔

بندرگاہ میں موجود پولیس کشتیاں ایک لمحے کے نوٹس پر حرکت میں آجاتی تھیں جبکہ دوسری کشتیاں ساحل کی نگرانی کرتی رہتی تھیں۔ وہ اکثر کھائیوں میں پوشیدہ رہ کر ساحل پر نظر رکھتی تھیں۔ کسی بھی مشکوک آواز اور جزیرے کی طرف سے آنے والی ہر ماہی گیر کشتی کے بارے میں فوراً ہی پولیس ہیڈکوارٹر کو اطلاع دے دی جاتی تھی۔

ہم نے اپنے محافظوں کی نقل و حرکت اور طریق کار کا گہری نظروں سے نہایت صبر اور خاموشی کے ساتھ مطالعہ کرنا شروع کیا۔ فرار کے قیدیوں کے لیے یہ معائنہ نہایت اہم ہوا کرتا ہے۔ ہم ہر روز ہی تبدیلیوں کا جائزہ لیا کرتے تھے۔ جب کسی کشتی کو مرمت کے لیے لایا جاتا تو ہم نوٹ کرتے کہ اس دوران محافظ کتنی دیر کے لیے اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر رہتے تھے۔ پولیس اور ملیشیا کی گیریژن کو بھیجی جانے والی کمک خاص طور پر ہماری توجہ میں رہتی تھی۔ ہم نے تمام کشتیوں کی رفتار اور ان کے چکر کاٹنے کے عمل کے بارے میں بھی مکمل آگاہی حاصل کرلی۔

ہم نے اپنی حاصل کردہ ان تمام معلومات سے اپنے دور دراز کے دوستوں کو آگاہ کردیا۔ اس طرح انہیں اس جزیرے، اس کے باشندوں اور ان کے رسوم و رواج، گورنر اور اس کے افسروں کے کردار، اس کی بری اور بحری فوج کی قوت اور ان کے مدت قیام کے بارے میں مکمل معلومات حاصل ہوگئیں۔ ہماری تیاریاں 1928ء کے آخری مہینوں سے ہمارے فرار تک جاری رہیں۔

ہماری سب سے بڑی مشکل کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں ہم پوشیدہ رہتے ہوئے اپنے دوستوں کی آمد کا انتظار کرسکتے اور ان کی کشتی میں سوار ہوسکتے۔ یہاں دو اہم باتیں ہمارے پیش نظر تھیں۔ پہلی یہ کہ اگر ہمارے دوست ہم تک پہنچنے میں ناکام رہتے تو ہمیں شام کی رول کال سے پہلے پہلے اپنی کوٹھڑیوں میں واپس آجانا ضروری تھا۔ دوسرے یہ کہ ہمارے دوستوں کے لیے بغیر کوئی شک و شبہ پیدا کیے انتہائی تیز رفتاری سے ہم سے چھ سو گز کے فاصلے پر پہنچ جانا تھا۔

ہمارے خیال میں یہ بھی ممکن تھا کہ ہمارے دوست کسی وجہ سے بروقت مقام مقررہ پر نہ پہنچ سکیں تو ایسی صورت میں ہمارے لیے رات کے نگرانوں کے چکر لگانے سے پہلے پہلے اپنی کوٹھڑیوں میں پہنچ جانا تھا۔ اگر ہم آدھ گھنٹے بھی دیر سے پہنچتے تو الارم بجنا شروع ہوجاتے اور منصوبہ ظاہر ہوجاتا۔

ہمیں جو کچھ کرنا تھا پینتالیس منٹوں میں ہی کرنا تھا۔ ہمیں ساڑھے چھ بجے اپنی مہم کا آغاز کرنا تھا کیونکہ ہمارے دوستوں نے ساڑھے سات بجے جائے مقررہ پر پہنچنا تھا۔ اگر وہ وہاں پہنچنے میں ناکام رہتے تو ہمارے لیے ساڑھے سات بجے سے پہلے پہلے اپنی کوٹھڑیوں میں پہنچ جانا ضروری تھا۔

کشتی پارٹیاں پونے آٹھ پر اپنا چکر لگایا کرتی تھیں۔ موسم سرما میں اس شیڈول میں خفیف سی تبدیلی کی گئی۔ ہمیں پونے آٹھ پر جائے مقررہ پر پہنچنا اور ساڑھے نو بجے تک اپنے دوستوں کا انتظار کرنا تھا۔ ان کے وہاں بروقت نہ پہنچ سکنے کی صورت میں ہم ساڑھے نو بجے اپنی کوٹھڑیوں میں واپس آجاتے اور اپنی حاضری لگوا دیتے۔

یہ طے کیا گیا کہ ہمارے دوست جزیرے کو دیکھتے ہی کشتی میں گڑبڑ ہونے اور اسے ٹھیک کرنے کے بہانے سمندر میں ولسکانو اور دوسرے جزائر میں واقع سگنل اسٹیشنوں کی نظروں میں آئے بغیر رات ہونے تک رہیں۔ پھر پوری رفتار سے کشتی کو چلاتے ہوئے مقام مقررہ سے چھ سو گز کے فاصلے پر پہنچ کر اپنے انجن کو بند کردیں اور کشتی کو بے آواز چلاتے ہوئے اتنے فاصلے تک پہنچ جائیں کہ ہم تیرتے ہوئے ان تک پہنچ جائیں اور کشتی میں چڑھ جائیں۔

پہلے ہم نے سوچا کہ ہمیں جزیرے کے مخالف پہلو میں خود کو مخفی کرلینا چاہیے۔ وہاں لیپاری کے چھوٹے سے قصبے میں اس قلعے کے نیچے جہاں ہمیں رکھا گیا تھا، ساحل کا وہ حصہ تقریباً ویران ہی رہتا تھا اور وہاں پہاڑیوں میں ایسی بہت سی قدرتی غاریں تھیں جو ہمارے چھپنے کے لیے بہترین پناہ گاہیں ثابت ہوسکتی تھیں۔ مزید برآں اس جگہ کی زیادہ سختی سے نگرانی بھی نہ کی جاتی تھی لیکن وہاں تک پہنچنے کے لیے ہمیں سنتریوں کی اس قطار میں سے گزرنا پڑتا تھا جو ہمارے جائے مقررہ کو تقریباً گھیرے میں لیے ہوئے تھے اور اگر ہمارے دوست وہاں نہ پہنچتے تو ہم سنتریوں سے بچ بچا کر رول کال کے وقت اپنی کوٹھڑیوں میں واپس نہ پہنچ سکتے تھے۔ انہی وجوہات کی بنا پر ہم نے اس جگہ کو اپنے دوستوں سے ملاقات کی جائے مقررہ بنانے کا آئیڈیا ترک کردیا۔

ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنا [illegible]



معمولی جرأت سے کام لیتے ہوئے ایک جائے مقررہ پر سختی سے جم جانا چاہیے۔ ہمارے دوستوں نے بھی اس فیصلے پر صاد کیا۔ ہرچند کہ اس میں ان کے لیے زیادہ خطرات تھے۔ کیونکہ جس جگہ تک ہمیں گھومنے پھرنے کی اجازت تھی اس کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی اور ہمارے دوستوں کے لیے وہاں آکر ہمیں لے جانا عملاً شیر کے جبڑوں میں سر ڈالنے کے مترادف تھا۔

لیپاری کی چھوٹی سی بندرگاہ پر ایک بے حد پرانی سی عمارت تھی جو عرصے سے ویران چلی آرہی تھی۔ جزیرے کے باشندے اسے آسیب زدہ کہتے تھے۔ وہمی قسم کے ماہی گیر تو اس کے قریب نہ پھٹکتے۔ اس عمارت کی ایک ٹیرس سمندر تک پھیلی ہوئی تھی اور عمارت کی اونچی گھاس اگی دیواروں کے مقابل بنی ہوئی تھی۔ ہم نے اس عمارت پر نظریں جمادیں اور اس کی طرف جانے والی جگہوں اور محافظوں کی نظروں میں آئے بغیر اس تک پہنچنے کے امکانات کو نظر میں رکھتے ہوئے اس کے محل وقوع کا جائزہ لینے لگے۔ لیپاری کا عظیم قلعہ اس عمارت کے اوپر سایہ کیے ہوئے تھا اور یہ ہمارے منصوبے کے لیے سود مند بات تھی۔ ہمارے دوستوں کی کشتی وہاں آسکتی تھی اور تاریکی میں چٹانوں میں پوشیدہ رہ سکتی تھی اور ٹیرس سے رسیوں کے ذریعے پانی میں اتر کر تیرتے ہوئے ہم اس تک پہنچ سکتے تھے۔

لیکن سوال یہ تھا کہ اس عمارت میں آخر کیسے داخل ہوا جائے۔ اس کا مالک جلاوطنوں کو ہرگز اندر داخل ہونے کی اجازت نہ دے سکتا تھا۔ کچھ عرصہ قبل تک ایک بے گھر بے نوا جلاوطن وہاں رہ رہا تھا لیکن اسے پولیس پکڑ کر لے گئی۔ ہم نے کئی مرتبہ جاکر اس ”بھوت بنگلے“ کو دیکھا بھالا۔ اس کے خالی کمروں کا جائزہ لیا، ٹیرس کی بلندی ناپی اور بغیر نظروں میں آئے اس میں داخل ہونے اور باہر نکلنے کے طریقوں پر غور و خوض کیا۔ فورچونو نے اس موقع پر ہمیں اپنے مخصوص جرأتمندانہ مشورے دیے۔ ہم نے اپنے دوستوں سے رابطہ کیا اور اس عمارت اور اس کے محل وقوع کے بارے میں انہیں معلومات فراہم کرتے ہوئے اپنے منصوبے سے آگاہ کیا۔ یہاں تک سب ٹھیک جا رہا تھا۔

لیکن ہماری قسمت میں اس ”بھوت بنگلے“ کی ٹیرس سے چھلانگ لگا کر آزادی حاصل کرنا نہ لکھا تھا۔ ہم نے اس مہم کے لیے جتنے خطرات مول لیے تھے اور جتنی کوششیں کی تھیں وہ ناکام ثابت ہوگئیں۔ جس وقت ہم بڑی بے چینی سے اپنے دوستوں کی طرف سے ان کے آنے کے پیغام کا انتظار کررہے تھے تو جزیرے پر ایک واقعہ نے ہنگامہ بپا کردیا۔ پولیس کی دوڑیں لگوادیں اور ہمیں شدید خوف میں مبتلا کردیا۔

ایک نوجوان اطالوی جلاوطن سپاگرو غائب ہوگیا تھا اور یقین کرلیا گیا تھا کہ وہ جزیرے سے فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔

کئی دنوں تک پولیس اور سپاہی جزیرے کا چپہ چپہ چھانتے رہے۔ اس واقعے نے قیدیوں میں زبردست جوش و خروش کی لہر دوڑادی تھی۔ اس کا فرار ان کے لیے انتہائی حیرت ناک اور ناقابل یقین بات تھی۔ اس نے اس سلسلے میں کسی کو اعتماد میں نہ لیا تھا اور تن تنہا ہی یہ کارنامہ انجام دے گیا تھا۔ اس کی اس حرکت نے ہماری کامیابی کے امکانات کو دھندلا دیا تھا کیونکہ اس کے بعد قیدیوں کی اور بھی زیادہ سختی سے نگرانی کی جانے لگی تھی لیکن اپنی کامیابی کے بارے میں ہم پھر بھی پُرامید تھے۔

لیکن چند دنوں بعد بے چارہ سپاگرو فاشسٹ ملیشیا کی نگرانی میں ہتھکڑیاں لگوائے پھٹے ادھڑے لباس میں ادھ مرا سا واپس لے آیا گیا۔

یہ کچھ اس طرح ہوا تھا۔

نوجوان سپاگرو نہایت بہادر، جرأت مند اور جسمانی طور پر طاقتور اور توانا تھا۔ اپنی ان خصوصیات کا اظہار وہ فاشسٹوں کے خلاف کئی معرکوں میں کرچکا تھا۔ وہ ایک شام خاموشی سے اپنی کوٹھڑی سے نکلا تھا اور چلتا ہوا بھوت بنگلے کے قریب بندرگاہ پر جا پہنچا تھا۔ جہاں اس نے ایک کشتی کھڑی دیکھی تھی۔ اس قسم کی کشتیوں کو موسم گرما میں تفریحی مقامات پر سیر کرنے والے استعمال کرتے تھے۔ یہ کھلے سمندر کے لیے ہرگز نہ تھی۔ پھر بھی سپاگرو جس نے نہانے کا لباس پہن رکھا تھا اس کشتی میں سوار ہوگیا تھا اور تیزی سے پیڈل چلاتا ہوا رات کی تاریکی میں سسلی کے ساحل کی طرف بڑھتا چلا گیا تھا۔ اسے اپنے فولادی پٹھوں اور پُرسکون موسم پر مکمل بھروسا تھا۔

لیکن بدقسمتی سے خلیج کے باہر سمندر کی سطح پرسکون نہیں تھی۔ اس میں اونچی اونچی لہریں اٹھ رہی تھیں۔ اس کی کشتی الٹ گئی اور اسے مجبوراً تیرتے ہوئے جزیرے کی طرف واپس آنا پڑا۔ ساحل کے ایک ویران حصے میں پہنچ کر وہ

کو سبق بھی دے رہی تھیں۔

فیصلہ کن مرحلہ آن پہنچا تھا۔ موسم بہار اپنے ساتھ پھولوں کی مہک اور ہوائیں حیران کن خبریں لائیں۔

نور چونیہ نے ہمیں اطلاع بھیجی کہ ہمارے فرار کی تیاریاں تیزی سے تکمیل کے مراحل طے کر رہی تھیں۔ اس نے ہمیں یہ نصیحت بھی کی کہ ہم اپنی ہمت اور حوصلے بلند رکھیں اور صبر سے انتظار کریں۔ ہمارے لیے ایک ایسے رفیق زنداں کی طرف سے جس سے ہمارا چند ماہ ہی ساتھ رہا تھا ایسے حوصلہ افزائی کے الفاظ حیران کن تھے۔

اپریل اور مئی کے مہینے گزر گئے۔ ہر صبح جب ہم بیدار ہوتے تو ہمارے ذہن میں ایک ہی خیال ہوتا کہ شاید آج ہماری مہم کا آغاز ہوگا۔

ایک دن بالآخر اطلاع آن ہی پہنچی۔ ان پُراسرار ذرائع نے جو ماضی میں ہمارے لیے اُمید اور حوصلہ افزائی کے پیغامات لاتے رہے تھے ہمیں نہایت اچھی خبر پہنچائی۔ وہ یہ کہ ہمارے دوست جولائی کے پہلے عشرے میں ایک شام ہمیں لینے پہنچ جائیں گے۔

ہم نے بڑے جوش و خروش سے اپنی حتمی تیاریاں کرنی شروع کر دیں۔ خفیہ میٹنگز کے سلسلوں میں، جو بڑی جاں گسل احتیاط سے ترتیب دی جاتی تھیں، ہم نے منصوبے کی عمل پر اس طرح ریہرسل کی جیسا کہ جنگ کے دنوں میں پیش قدمی سے پہلے فوجی کیا کرتے تھے۔ ہر نکتے پر بحث و تمحیص کی گئی۔

روزلی گاؤں کے انتہائی کنارے پر واقع گھر میں رہتا تھا۔ یوں وہ جائے مقررہ سے بہت دور تھا۔ "زیرو آور" سب سے پہلے اس کے لیے مخصوص کیا گیا تاکہ اس کی آمد ہماری آمد کے مطابق ہو جائے۔ ہمیں جائے مقررہ پر پہنچنے میں کم ہی وقت لگتا تھا۔

چونکہ لوسو کی کڑی نگرانی کی جا رہی تھی اس لیے اسے ہم سے زیادہ سنگین خطرات مول لینے تھے۔ چار سو پولیس والوں یا فاشسٹ ملیشیا میں سے ایک بھی اسے دیکھ لیتا تو ہماری تمام تدبیروں پر پانی پھر جاتا۔ اگر اسے گلی میں بھی پھرتے دیکھ لیا جاتا تو اس کا تعاقب شروع کر دیا جاتا۔ ویسے بھی وہ جب بھی گھر سے نکلتا تو چار جاسوس اس کے پیچھے پیچھے ہو لیتے تھے۔ حکام اس کے روز مرہ کے معمولات سے بخوبی آگاہ تھے کہ وہ صبح گیارہ تا بارہ بجے تک اور شام ساڑھے سات سے ساڑھے آٹھ بجے تک گھر سے باہر رہتا ہے۔ اگر وہ خلاف معمول کسی وقت اپنے محافظوں کے بغیر گھر سے باہر دیکھ لیا جاتا تو اسے روک لیا جاتا یا منزل مقصود تک اس کا تعاقب کیا جاتا اور یہ دونوں صورت حال ہوتی۔

طے کیا گیا کہ لوسو اپنی معمول کی سیر کو جائے اور معمول کے مطابق ہی ساڑھے آٹھ بجے واپس گھر آ جائے۔ اس کے محافظ اسے اندر داخل ہوتے ہوئے دیکھیں گے پھر یہ اطمینان کر کے کہ وہ رات کو کہیں نہیں جائے گا اور گھر ہی رہے گا واپس چلے جائیں گے۔ لوسو بھیس بدلنے کے لیے کسان کا لباس پہنے گا اور بالکونی کی ایک کھڑکی کے ذریعے نیچے صحن میں اتر جائے گا جو گھر کے عقبی حصے میں واقع تھا۔ صحن سے وہ ویران اور تاریک باغیچے میں چلا جائے گا۔

ہم نے لوسو کے کردار کی کئی مرتبہ ریہرسل کی۔ اس نے بوڑھے مچھیرے کا بھیس بدلا تھا۔ اس کے لیے ضروری اشیا بڑی احتیاط سے تھوڑی تھوڑی کر کے خفیہ طور پر اس کے گھر لائی جاتی رہی تھیں۔ اس نے اپنا کردار نہایت قابل توصیف انداز میں ادا کیا۔ پرانا خراب سا لبادہ پہنے، گلے میں پھٹا پرانا اسکارف لپیٹے، سر پر بوسیدہ سا ہیٹ پیشانی تک جھکائے منہ میں پائپ لیے سیدھی کمر کو کمان کیے وہ ہمیں قریب سے دیکھنے پر بھی بالکل اجنبی شخص معلوم ہوتا تھا۔

میرا کام سب سے آسان تھا۔ میری کوئی خصوصی نگرانی نہ کی جاتی تھی اس لیے میرے لیے بغیر بھیس بدلے کم استعمال ہونے والی سڑک پر ہو لینے میں کوئی خطرہ نہ تھا۔

بالآخر وہ خاص دن بھی آن پہنچا جو ہر دن کی طرح گزر گیا۔ ہر کام معمول کے مطابق ہوتا رہا۔ ہم بڑی بے چینی اور اضطراب کے عالم میں شام ہونے کا انتظار کرتے رہے۔ پھر جب شام ہوئی تو ہم ٹھیک وقت پر اکٹھے ہونے کی جگہ پر پہنچ گئے۔ یعنی بندرگاہ کی طرف اور بہت پیچھے کے مخالف سمت جیسا کہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔ ہم نے بندرگاہ کے جس پہلو کو منتخب کیا تھا وہ ایک مختصر سا گھاٹ تھا جہاں پرانے گودام بنے ہوئے تھے۔ دن کے وقت وہاں اکثر جہازوں کے مزدور سامان چڑھانے اتارنے کا کام کرتے دکھائی دیتے تھے اور کبھی کبھار ماہی گیر بھی لیکن رات کے وقت یہ گھاٹ بالکل ویران و سنسان ہوتا تھا اور خوش قسمتی سے یہاں مکانات کے سایوں میں تھا جو اس کے عقب میں بلند پہاڑی ڈھلوانوں پر بنے ہوئے تھے اور یہ سب مکانات خالی تھے۔

اس گھاٹ تک پہنچنا ایک مشکل مرحلہ تھا کیونکہ راستے میں ہر وقت ادھر اُدھر پھرنے والے مسلح فاشسٹوں سے آمنا سامنا ہونے کا خطرہ تھا لیکن اس شام کی سیاہی نے ہمیں نہ



دیکھا نہ ہمارے گھاٹ تک پہنچنے میں کوئی چیز مزاحم ہوئی۔ ایک سرگوشی میں کہے ہوئے لفظ کے بعد ہم نے گھاٹ کے سرے میں اترے ہوئے حصے میں جا کر اپنے کپڑے اتارے اور خاموشی سے سیاہ پانیوں میں اتر گئے۔

ہر ممکنہ حد تک خاموشی سے ہم ڈیڑھ سو میٹر تک چٹانی ساحل کے ساتھ ساتھ تیرتے رہے اور بالآخر ایک بلند چٹان تک جا پہنچے۔ یہی ہماری جائے مقررہ تھی۔ اسی جگہ ہمارے نجات دہندگان نے پہنچنا تھا۔ یہاں ہم گردن گردن تک پانی میں کھڑے ان کا انتظار کرنے لگے۔

منٹ پر منٹ گزرتے گئے۔ پردۂ تاریکی کو کسی چیز نے چاک نہ کیا۔ ہر سو گہری خاموشی کی چادر تنی رہی۔ ہمارے منتظر کانوں نے کوئی دبی ہوئی آواز نہ سنی۔ آہستہ آہستہ ہماری پہلی کامیابی کی خوشی ماند پڑنے لگی اور شکوک و شبہات میں ڈھلنے لگی۔ ہم دل شکستہ سے ہونے لگے۔ ہم نے اپنے حصے کا کام بخیر و خوبی انجام دے دیا تھا۔ مگر ہمارے دوست کہاں تھے؟

انتہائی جانی اذیت کے عالم میں ہم ساڑھے نو بجے تک انتظار کی سولی پر لٹکے رہے۔ ہم اگر کچھ دیر مزید وہاں ٹھہرے رہتے تو ہماری تلاش شروع ہو جاتی۔ پانی میں کھڑے کھڑے ہوئے ہم نے سرگوشیوں میں کچھ دیر اور انتظار کرنے کا فیصلہ کیا۔ اگلے دس منٹ تک جاں گسل انتظار کے بعد بھی وہاں کوئی نہ آیا تو ہم جتنی تیزی سے تیرتے ہوئے گھاٹ کی طرف واپس ہو لیے۔ وہاں پہنچ کر ہم نے تیزی سے اپنے کپڑے پہنے اور اپنے ٹھکانوں کی طرف چل پڑے۔ اپنے پلان کی ناکامی پر ہمارے دل دکھ سے بوجھل ہو رہے تھے اور اسی خوف سے ٹھٹھرے جا رہے تھے کہ ہم ضرور دھر لیے جائیں گے جس کے بعد ہماری فرار کی راہیں ہمیشہ کے لیے بند ہو جائیں گی۔

لیکن اس مرتبہ بھی اللہ کی مدد شامل حال رہی۔ میں اور لوسو جسم سے چپکے ہوئے گیلے کپڑوں میں بغیر کسی روک ٹوک کے گھر پہنچ گئے۔ اس کے ٹھیک تین منٹ بعد گشتی پارٹی ہمارے گھر کے سامنے گزری۔ "اندر؟" انہوں نے پکارا۔ "حاضر!" ہم نے بجھے ہوئے دلوں سے کھوکھلی آواز میں انہیں جواب دیا۔

وہ رات میری زندگی کی سخت ترین رات تھی۔ اپنے دوستوں کے جاں گسل انتظار، ان کے نہ پہنچنے پر جان لیوا فکر اور پریشانی، جزیرے سے فرار کے مکمل اور محفوظ ترین منصوبے کی ناکامی پر حد درجہ دل شکستگی اور رنج و کرب سے بھرپور رات...... ان تین برسوں بعد آزادی کی جو اُمید پیدا ہوئی تھی وہ خاک میں مل گئی تھی۔ اب ہمیں لپاری میں جانے کتنے مہینے اور قید و بند کی سختیاں جھیلنی تھیں۔

روزلی کے بارے میں ہمیں معلوم ہوا کہ وہ بھی کشتی پارٹی کے پہنچنے سے چند منٹ پہلے اپنے ٹھکانے پر پہنچ گیا تھا۔ خوش قسمتی سے اسے کسی پاگل آدمی کی طرح جنونی انداز میں کھیتوں اور میدانوں میں دوڑتے ہوئے نہ دیکھا تھا۔ اس دوڑ میں اس کی ایک آنکھ کے نیچے ایک لمبا سا زخم آ گیا تھا۔

"میں مختصر راستہ اختیار کرنے کے لیے انگوروں کے ایک باغ میں سے گزر رہا تھا۔ دوڑتے دوڑتے میں بیلوں کو سہارا دینے والے ایک لکڑی کے کھمبے سے جا ٹکرایا۔ جس کا ایک کیل باہر نکلا ہوا تھا۔ میں اگر ایک انچ اوپر ہوتا تو یہ کیل میری آنکھ ہی نکال لیتی۔ لیکن خوش قسمتی سے ایسا نہ ہوا۔" اس نے ہمیں بعد میں بتایا تھا۔

ہماری سب سے بڑی خوش قسمتی تو یہ ہوئی تھی کہ پولیس کو ہم پر ذرہ بھر بھی شک نہ ہوا تھا۔ کم از کم ہم پہلے کے مقابلے میں ٹھیک ہی نکلے تھے۔ بعد میں ہمیں اپنے اطلاعی نظام سے معلوم ہوا کہ سمندر کے بگڑے تیوروں کے سبب ہمارے دوست ہم تک نہ پہنچ سکے تھے۔ وہ پروگرام کے عین مطابق ہم پر روانہ ہوئے تھے اور جزیرے سے آدھے فاصلے تک پہنچ گئے تھے کہ سمندر میں تلاطم ہونا شروع ہو گیا تھا۔ اس کے تلاطم میں اضافہ ہی ہوتا گیا تھا جس پر انہیں واپس ہونا پڑا تھا۔ واپسی کا سفر ان کے لیے بے حد مشکل ثابت ہوا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے سمندر کی بپھری لہروں سے لڑتے بھڑتے واپس پہنچنے میں کامیاب ہوئے تھے۔

کچھ دنوں بعد ہمیں ان کی طرف سے ایک اور پیغام موصول ہوا۔ کشتی تیار تھی۔ سمندر پُرسکون اور موسم موافق تھا اور انہوں نے مقررہ وقت پر جائے مقررہ پر پہنچ جانا تھا۔

27، جولائی 1929ء کی وہ رات میری زندگی کی ایک یادگار رات تھی۔ وسط شام ہم تینوں لوسو، روزلی اور میں ایک دوسرے سے جدا ہو گئے۔ ہم نے سوچا تھا کہ اگر کوئی گڑبڑ ہو گئی تو شاید ہمارے لیے ایک دوسرے کو پھر بھی دیکھ لینے کا یہ آخری وقت ہوگا۔ اگر قسمت یاوری کرتی تو ہم ساڑھے آٹھ بجے سمندر میں ایک دوسرے سے آن ملتے۔

وقت کاٹنے کے لیے یونہی گاؤں کی گلی کوچوں میں آوارہ گردی کرتا رہا ایسے جیسا کہ اب تک سب قیدیوں کا معمول چلا آ رہا تھا۔ ادھر اُدھر پھرتے، واقف کاروں میں

ملک، سیلیک اور اموال بری کے بعد میں "ہمارے" کیفے میں داخل ہو گیا۔ یہ ایک اچھی اور صاف ستھری جگہ تھی۔ اس کا مالک جزیرے ہی کا باشندہ تھا۔ یہ کیفے "قیدیوں کا کیفے" مشہور تھا کیونکہ وہاں صرف قیدی ہی آیا کرتے تھے۔ دوسرے لوگ اس میں کبھی قدم نہ رکھتے تھے۔ ان کے لیے اس کیفے سے کچھ دوری پر ایک اور کیفے تھا جس میں قیدیوں کا داخلہ قطعاً ممنوع تھا۔"

اس کیفے میں اپنے دوستوں کے ساتھ خوش گپیاں کرتا رہا۔ یہاں تک ساڑھے آٹھ بج گئے۔

"شب بخیر دوستو!" میں نے ان سے کہا۔ "میں تھک گیا ہوں اس لیے گھر جارہا ہوں۔ تم سے اب کل ملاقات ہوگی۔"

مجھے اُمید واثق تھی کہ اگلے دن میری ان سے ہرگز ملاقات نہ ہوگی لیکن اگر ان میں سے کوئی بھی ایسے ہی حالات سے دوچار ہوتا تو پولیس ہی دروغ بیانی سے کام لیتا۔

کیفے سے نکل کر میں انتہائی سست قدمی سے چلتا ہوا اپنے ٹھکانے کی سمت ہو لیا۔ آدھے راستے تک پہنچ کر میں نے ایک دم ہی اپنا راستہ تبدیل کر لیا اور یہ دیکھتے ہوئے کہ کوئی بھی مجھ پر نظر رکھے ہوئے نہیں تھا تیزی سے چلتا ہوا بندرگاہ کی سمت ہو لیا۔ ہر چیز خاموش تھی۔ شام کے دھندلکے پھیلتے اور گہرے ہوتے جارہے تھے جو مجھے کشتی پارٹیوں کو بچ دینے اور گھاٹ تک پہنچنے میں مدد دے رہے تھے۔

لیکن گھاٹ کے سرے پر میں نے نہ لوسو کو پایا نہ روزلی کو لیکن یہ کوئی پریشانی اور فکر کی بات نہیں تھی کیونکہ ہم نے آپس میں یہ بات طے کی تھی کہ ہم میں سے اگر کوئی پہلے وہاں پہنچ جائے تو وہ باقیوں کا انتظار کرنے کے بجائے اپنا ہی سوچے۔

چنانچہ میں نے اپنے کپڑے اتارے اور جائے مقررہ کی طرف تیرنا شروع کیا۔ وہ جگہ اب بالکل بن چکی تھی۔ میں ہر ممکنہ خاموشی سے تیرتا رہا اور کوشش کرتا رہا کہ پانی کے چھینٹوں کی آواز نہ بلند ہو۔

منزل مقصود پر پہنچ کر میں پہاڑی چٹانوں کے سائے میں گلے گلے تک پانی میں کھڑا ہو گیا۔ اس جگہ سے مجھے بندرگاہ کا ایک حصہ اور گھاٹ پر چلتا ہوا ماہی گیر دکھائی دے رہے تھے۔ ساحل پر ایک فاسٹ گروپ اور کچھ بچے کھیلتے دکھائی دے رہے تھے۔ یہ سب نظارے ہم تاریکی میں واضح طور پر دکھائی دے رہے تھے۔

یکایک موٹر کی آواز سنائی دی لیکن میں کچھ نہ دیکھ سکا۔

آواز قریب سے قریب آتی گئی۔ پھر وہ بند ہو گئی۔ اس کا مطلب تھا انہوں نے سائلنسر لگا لیا تھا۔ پھر ایک دم ہی تاریکی میں ایک سیاہ ہیولا نمودار ہوا اس کی صورت ایک سگار جیسی تھی جو پانی میں ابھرا ہوا تھا۔

یہ میرے دوست تھے! اس میں اب کوئی شک وشبہ باقی نہ رہا تھا۔ میں اس کشتی کی نشانیاں پہچانتا تھا۔ اس وقت وہ شاید بیس میٹر کی دوری پر تھی۔ اس پر کوئی روشنی نہ ہو رہی تھی۔ مجھے ایک دم ہی ایک خوف ناک خیال نے آن لیا۔ کہیں یہ پولیس کی کشتی نہ ہو؟ کوئی دھوکا نہ ہو...... نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ یہ ہماری کشتی ہی ہو سکتی تھی جو بالکل ٹھیک وقت پر ٹھیک مقررہ جگہ پر پہنچ رہی تھی۔

پھر کشتی کے ہیولے کے قریب تھوڑا سا اوپر روشنی کا ایک نقطہ نمودار ہوا اور جلنے بجھنے لگا۔ یہ سگنل تھا۔ اب کوئی شک وشبہ باقی نہ رہا تھا۔ میں تیزی سے تیرتے ہوئے کشتی کی طرف بڑھنے لگا۔ اس دوران موٹر کی آواز بند ہو گئی تھی۔ میں ان کے دیکھنے سے پہلے کشتی تک پہنچ گیا۔ پھر ان کی طرف سے مسرت بھری آوازیں بلند ہوئیں اور انہوں نے مجھے کشتی پر اوپر گھسیٹ لیا۔ میں نے فوراً ہی "ایکس" کو پہچان لیا۔ جس نے جہاز کی ترا کیب تشکیل دی تھیں۔ پیارا دوست! بہادر آدمی! پھر مجھے تاریکی میں "زیڈ" کے خدوخال دکھائی دیے۔ ذہانت و توانائی سے بھرپور شخص ایک تجربہ کار جہاز ران۔ پہلے وہ بحریہ میں افسر تھا لیکن اب جلاوطنی جھیل رہا تھا۔

کیبن سے ایک تیسرا شخص نمودار ہوا جس نے خاموشی سے میرا ہاتھ گرمجوشی سے اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ تین سچے دوست جنہوں نے ہماری آزادی کے لیے اپنی زندگیاں خطرے میں ڈالی تھیں!

"کیا تم اکیلے ہو؟" ایک نے دبی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ "دوسرے کہاں ہیں؟"

"میں مقام مقررہ پر پہنچنے والا پہلا آدمی ہوں۔ میں وہاں ان کا انتظار کرتا رہا مگر وہ وہاں نہ پہنچے لیکن وہ ضرور آئیں گے میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں۔"

میرے دانت بج رہے تھے۔ جنونی انداز میں تیرنے کی کوشش کی وجہ سے سانسیں اکھڑ رہی تھیں۔ مجھے کوٹ اوڑھا دیا گیا اور حلق میں برانڈی اتاری گئی جس سے میرے ہوش کچھ ٹھکانے آئے۔

روزلی اور لوسو اس وقت کہاں ہو سکتے تھے؟ رات کے ساڑھے نو بج رہے تھے۔ میں بے حد پریشان و متوحش تھا۔



"اس وقت تو ہم واپس پر ہوتے۔" آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے پر ہمیں ساحل پر کوئی نقل وحرکت نہ دکھائی دے رہی تھی۔ کیا ہوا تھا آخر؟ کیا وہ گرفتار کر لیے گئے تھے؟ اگر ایسا ہوا ہوتا تو جزیرے پر ہنگامہ برپا ہو جانا ابھی کی بات تھی۔

زیڈ ہمارے ساتھ کھڑا بندرگاہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کھلی بندرگاہ میں روشنیوں کی قطاریں، سسلی کی ماہی گیر کشتیوں کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ بندرگاہ کی روشنیوں میں ماہی گیر اپنے صبح کے کام کی تیاریاں کرتے دکھائی دے رہے تھے۔ وہاں پولیس بھی موجود تھی۔

"ہمارے دائیں طرف وہ سرخ روشنی کیا ہے؟" زیڈ نے پوچھا۔

"یہ کسٹم ہاؤس افسران کی کشتی ہے۔"

"اور ہمارے سامنے وہ سفید روشنی؟"

"وہ ایک ماہی گیر کشتی ہے جو......" میری سرگوشیانہ وضاحت ادھوری ہی رہ گئی۔ ہمیں ایک دم ہی اس شدید خطرے کا احساس ہوا جو ہمیں لاحق ہونے والا تھا۔ پانی کا ایک تیز دھارا ہمیں سیدھا بندرگاہ کی طرف دھکیل رہا تھا اور ہماری کشتی سایوں سے نکل کر بندرگاہ کی روشنیوں سے روشن حدود میں داخل ہو رہی تھی۔ ہم چند ہی میٹر کی دوری پر وہاں لوگوں کو چلتے پھرتے دیکھ رہے تھے۔ پولیس اور ملیشیا کی وردیاں بھی وہاں دکھائی دے رہی تھیں اور قریب ہی گھاٹ پر ایک کشتی کھڑی دکھائی دے رہی تھی۔

میرے دوستوں نے ہر ممکنہ تیزی سے کام لیتے ہوئے کشتی کو واپس سایوں میں دھکیلنے کی کوشش شروع کر دی لیکن وہ اس میں ناکام رہے۔ ہم انچ انچ کر کے روشنیوں کی طرف بڑھتے رہے۔ یہ بہت نازک لمحات تھے۔ کیا ہمیں موٹریں چلا دینی چاہئیں اور وہاں سے فرار ہو جانا چاہیے؟ اس کا مطلب ہوتا اپنے ساتھیوں سے بےوفائی۔ ہم ایسا سوچ بھی نہ سکتے تھے لیکن یہاں کامیابی ہماری گرفت میں تھی اور ناکامی کے خوف ناک امکانات کا مطلب تھا موت...... جو ہم سے چند قدم ہی دور تھی۔

ان انتہائی جان لیوا اور سنسنی خیز لمحات میں اللہ کی رحمت ہمارے شامل حال رہی۔ ہماری کشتی ساحل پر موجود سینکڑوں لوگوں کی نظروں کے سامنے تھی لیکن تاریکی میں اس کے غیر نمایاں خدوخال اور اس کا پانی میں سست اتار چڑھاؤ لوگوں کو شک وشبہ میں مبتلا کر سکتا تھا لیکن کوئی بھی اس کی طرف متوجہ نہ ہوا۔ سپاہیوں نے بھی غالباً ہماری کشتی کو اپنی ہی کشتی سمجھا تھا۔ مزید برآں انہیں یقین تھا کہ لیپاری سے کسی قیدی کا کشتی کے ذریعے فرار ناممکن تھا۔

ہماری اس نازک پوزیشن پر بھی "زیڈ" کی حس مزاح برقرار رہی۔

"اس وقت سے بیس منٹ بعد......" اس نے مسکراتے ہوئے سرگوشی کی۔ "ہم کیفے میں بیٹھے اپنا جام صحت پی رہے ہوں گے۔"

اب ساڑھے نو بجنے والے تھے۔ چند منٹوں بعد کشتی پارٹیوں نے ہمارے کوارٹروں کا چکر لگانا شروع کر دینا تھا اور ہماری خاص کر میری غیر حاضری فوراً ہی ان کے نوٹس میں آجاتی پھر الارم بجنے لگتے۔ میں اپنے دوستوں کو سرگوشی میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ "ایکس" نے ایک دم ہی میرا بازو سختی سے پکڑ لیا۔

"وہ دیکھو! وہاں اس طرف!" اس نے کشتی کی پچھاڑی کی طرف اشارہ کیا۔ دو سائے پانی کی سطح پر تیرتے ہوئے ہماری طرف آرہے تھے۔ یہ روزلی اور لوسو تھے۔

"لو ہم آن پہنچے!" ایک سرگوشی نما آواز ہماری سماعت سے ٹکرائی۔ ہم نے جلدی سے انہیں اوپر کشتی میں گھسیٹ لیا۔

"موٹریں چلاؤ جلدی سے!" زیڈ نے حکم دیا۔

اب مزید فکر و پریشانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہمارے جہاز کا دارومدار تیز رفتاری پر تھا۔

فوراً ہی مشین گن کے چلنے جیسی آوازوں کے ساتھ کشتی کی موٹریں جاگ اٹھیں۔ اس کا رخ کھلے سمندر کی طرف موڑ لیا گیا اور وہ پوری رفتار سے پانی چیرتی جھاگ اڑاتی جزیرے سے دور سے دور تر ہونے لگی۔

ہمارے پیچھے جزیرے پر الارم بجنے لگا۔ سسلی کے "شیطانی جزیرے" پر زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا۔ ایک پولیس کشتی ہمارے تعاقب میں اڑتی چلی آنے لگی لیکن اس کی موٹر کھانس بھی اور وہ رک گئی۔

"کوئی بات نہیں!" زیڈ میرے کان میں چیخا۔ "انہیں آنے دو۔ وہ ہماری تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکتے!"

لیکن کوئی بھی ہمارے تعاقب میں نہ آیا۔ ہماری کشتی تاریکی میں سفر کرتی رہی۔ سوائے ہمارے انجنوں کے کوئی آواز نہ سنائی دی۔ پھر شیطانی جزیرے کے خدوخال بھی دکھائی دینے بند ہو گئے۔ ہم اب آزادی کی فضاؤں میں پہنچ چکے تھے۔ ہم اب آزاد تھے!

++

خوشنود زہرا

انگریزی کی چند مشہور کہانیوں میں سے ایک۔ اگر اس پر Truestory نہ لکھا ہوتا تو میں افسانہ سمجھ لیتا لیکن افسانے بھی تو حقائق سے جنم لیتے ہیں۔ ایک ایسا سچ جسے عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا۔

**پُراسرار ادب پسند کرنے والوں کے لیے دلچسپ کہانی**

رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔ ہر طرف ہو کا عالم تھا سناٹے کا راج تھا۔ جب ٹرین گاؤں کے اسٹیشن پر پہنچی پہلے رفتار کم ہوئی تو وہ ہوشیار ہو گیا پھر دھیمی ہوتی ٹرین کی رفتار کے ساتھ اس نے اپنا مختصر سامان سمیٹا اور گاڑی رکتے ہی اتر گیا۔

یہ ایک مضافاتی چھوٹے سے قصبے کا ریلوے اسٹیشن تھا جو اس وقت تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا اور سب سے حیران کن بات یہ تھی کہ اس کے سوا اسٹیشن پر کوئی مسافر موجود نہ تھا۔ اس نے ایک اچٹتی نظر رکی ہوئی ٹرین پر ڈالی اور تیز چلتا ہوا اسٹیشن کی حدود سے باہر نکل آیا تاکہ قصبے تک جانے کے لیے کوئی ٹیکسی یا کار لے سکے۔

ایک ٹیکسی والے سے کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنا سامان رکھا اور سفر شروع ہو گیا۔

"کیا کوئی ہوٹل یا قہوہ خانہ کھلا ہو گا قصبے میں؟ میں کچھ تھکن محسوس کر رہا ہوں، اگر چائے یا کافی مل جاتی تو تازہ دم ہو جاتا۔" اس نے ڈرائیور سے کہا۔

"نہیں جناب یہاں رات جلدی ہو جاتی ہے۔ زیادہ تر کسان آباد ہیں، وہ سویرے اٹھتے ہیں تو سوتے بھی جلد ہیں۔ اسٹیشن پر ایک دو دکانیں ہیں جہاں چائے وغیرہ مل جاتی ہے۔" اس خوش شکل نوجوان ڈرائیور نے مسکرا کر تفصیل سے بتایا۔

ابھی گفتگو جاری تھی کہ ایک لڑکی بیچ سڑک پر بھاگتے



ہوئے گاڑی سے ٹکرائی اور دور جا گری۔ اس اچانک افتاد پر ولیم کی ساری سستی ہوا ہو گئی اور وہ بجلی کی رفتار سے سیٹ پر اچھل پڑا، لگ رہا تھا دل حلق کے راستے منہ کو آرہا ہے۔ سفر کی ابتدا ہی اتنی نحوس ہو گی یہ تو اس نے سوچا بھی نہ تھا۔

ڈرائیور نے گھبرا کر گاڑی کی رفتار مزید بڑھا دی اور جیسے ہوا سے باتیں کرانے لگا۔ گھبراہٹ اور بدحواسی چہرے سے عیاں تھی۔ اچانک ولیم چیخا۔ "رک جاؤ۔ کیا پاگل ہو گئے ہو کیا؟ روکو گاڑی۔"

لیکن ڈرائیور تو جیسے بہرا ہی ہو گیا تھا۔ ولیم کی بات ان سنی کرتے ہوئے اس نے ایکسلیٹر پر دباؤ بڑھائے رکھا۔

"رک جاؤ۔" ولیم نے اس کے کاندھے جھنجھوڑے تو جیسے وہ ہوش میں آیا۔ "موڑو گاڑی کو اس عورت کو دیکھو اسے اسپتال لے جانا ہو گا۔" ولیم نے چیخ کر کہا۔

"سر میں گاڑی نہیں روکوں گا وہ لڑکی نہیں بدروح ہے قصبے میں سب جانتے ہیں۔" ڈرائیور نے سہمے ہوئے لہجے میں بتایا۔

"کیا بکواس ہے یہ؟" ولیم غصے میں چیخا۔ "پیچھے لو گاڑی ورنہ مجھے اتار دو۔ میں خود دیکھ لوں گا جا کر۔"

"سر میں آپ کو بھی نہیں اتار سکتا۔ نہ جانے وہ بدروح آپ کے ساتھ کیا کرے۔"

"ایسا کچھ نہیں ہوتا، گاڑی روکو میں ان باتوں پر یقین نہیں کرتا۔"

"اچھا میں بھی آپ کے ساتھ چلوں گا، مہمان کو مشکل میں تنہا چھوڑنا ہمارے قصبے کی روایت ہے۔" ڈرائیور نے گاڑی ریورس کر کے اسی مقام پر روکی، لیکن حیرت انگیز طور پر وہاں کوئی زخمی عورت نظر نہ آئی۔

"سر میں نے کہا تھا کہ وہ بدروح ہے، دیکھیں کہیں نہیں ہے۔" ولیم بھی چونک گیا تھا لیکن وہ اپنا خوف ڈرائیور پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

"میں یہاں ہوں۔" ایک نسوانی قہقہہ گونجا تو ان کی چیخ سی نکل گئی۔ آواز کی سمت ولیم اور ڈرائیور نے دیکھا تو وہی لڑکی کھڑی تھی جو کچھ دیر پہلے گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ حیرت انگیز طور پر کہیں سے زخمی نظر نہیں آرہی تھی۔

سفید لمبے چوغے نما لباس میں حسین سی وہ دوشیزہ مسکرا کر انہیں ہی دیکھ رہی تھی۔ سفید لباس پر جگہ جگہ سرخ دھبے نظر آرہے تھے اور ماتھے پر خون بھی جما ہوا تھا۔ "آگئے تم ولیم؟

تمہیں آنا ہی تھا میرے مسافر!" وہ زوردار کھردری آواز میں ہنسی۔ "تمہیں مار کر آج میرے دو جنم پورے ہو جائیں گے۔" وہ پھر سے جارحانہ انداز میں آگے بڑھی تو ولیم کے پسینے چھوٹ گئے۔

"سر بھاگیں یہ بدروح نہیں چھوڑے گی آپ کو۔ مسافر اس کا شکار ہیں۔" ڈرائیور نے اس کا بازو کھینچا تو وہ بھی تیزی سے گاڑی کی طرف دوڑا اور سیٹ پر بیٹھ کر ہانپنے لگا۔

ڈرائیور نے گاڑی تیزی سے اسٹیشن کی طرف موڑی۔ "سر جس ٹرین سے آپ اترے تھے وہ آدھے گھنٹے کے لیے رکی ہے۔ ابھی دس منٹ باقی ہیں آپ کو اس گاڑی پر سوار ہونا ہی ہے۔ آپ واپس اس گاڑی میں بیٹھ کر کہیں اور اتر جائیں۔ جلدی کریں۔"

ولیم پسینے میں شرابور ہو چکا تھا۔ اسٹیشن کی عمارت نظر آنے لگی تو ولیم کی جان میں جان آئی۔ اسٹیشن پر رکتے ہی ولیم سامان اٹھا کر دوڑا۔ ٹرین چل پڑی تھی اور آہستہ رفتار میں چل رہی تھی کہ ولیم ڈبے میں سوار ہو گیا اور سیٹ سے ٹکرا کر اوندھے منہ گر پڑا پھر اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اسے ابھی بھی اس لڑکی کے قہقہے کی آواز آرہی تھی۔

وہ بند ہوتے دماغ کے ساتھ دھپ سے گرا تھا اچانک کسی نے شانے پر ہاتھ رکھا تو اسے ہوش سی ہوئی۔ وہ غائب دماغی سے سامنے والے کو تک رہا تھا۔ "آپ سوتے میں سیٹ سے نیچے گر پڑے تھے۔" یہ کہتے ہوئے اس مسافر نے اسے اٹھا کر واپس سیٹ پر بٹھایا۔

ولیم پسینے میں نہایا ہوا تھا اور سانس پھولی ہوئی تھی۔

"شاید آپ کوئی خواب دیکھ رہے تھے اور چیخ رہے تھے کہ روکو تیز بھگاؤ گاڑی۔" ولیم نے پسینے سے بھیگا چہرہ تھپتھپایا کیا میں واقعی خواب دیکھ رہا تھا۔

"آپ چائے پی لیں گرما گرم ہے اس سے شاید بہتر محسوس کریں۔" اس مسافر نے سامنے کھڑے چائے والے سے چائے لے کر ولیم کو پکڑائی۔

ولیم نے چائے کا کپ بھرتے ہوئے چائے والے کو دیکھا تو چائے کا کپ ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ ٹیکسی ڈرائیور اسے چائے پیش کر رہا تھا اور اس کے ہاتھ میں وہی اسکارف لپٹا ہوا تھا جو اس بدروح کے بالوں میں بندھا تھا۔

++

# روسیاہ

عاطر شاہین

وہ ایک معصوم سا سیدھا سادا نوجوان، غربت کی گود میں پلا بڑھا، خوابوں کی دنیا ہی اس کا مسکن تھا کہ اسے سبق سکھانے کے لیے اس کی بہن کو اغوا کرلیا گیا اور تب اسے آنکھیں آہنوش کرنی پڑیں۔ مصائب کی دلدل کو پار کرتا ہوا وہ آگے بڑھا تو اس پر آشکار ہوا کہ تقدس کے ملمع چڑھے چہروں کے عقب میں مکروہ چہرے ہیں۔ وہ ان کے چہروں سے نقاب ہٹانا چاہتا تھا مگر بھول گیا تھا کہ زمینی خدا بن بیٹھے مقدس ظالموں کی قوت ناقابل شکست ہے۔

## (گزشتہ اقساط کا خلاصہ)

پھروں نے علی کا بہت برا حشر کر دیا تھا۔ بالآخر وہ پھروں کو برداشت نہ کرتے ہوئے بے ہوش ہو گیا تھا۔ ہوش آیا تو وہ اسپتال میں تھا۔ بارڈے صاحب ہی علی کو اسپتال لائے تھے۔ انہوں نے علی کو بتایا کہ رتن کمار ان کی کسٹڈی میں ہے۔ علی نے رتن کمار کی حالت دیکھی تھی۔ پھروں نے کاٹ کاٹ کر اس کا بھی برا حال کر دیا تھا۔ بارڈے صاحب نے رتن کمار کا ہوٹل حاصل کرنے کے لیے اسے زندہ رکھا ہوا تھا لیکن علی اسے فوراً ہی مارنا چاہتا تھا۔ بعد ازاں علی کو پتا چلا کہ بارڈے صاحب، رتن کمار کو تہہ خانے سے نکال کر لے گئے تھے تو وہ حیران رہ گیا۔ رادھا اور گھوشال شرما نے علی کو اغوا کر لیا تھا۔ رادھا اس سے رتن کمار کے بارے میں پوچھنا چاہتی تھی۔ ساتھ ہی انہوں نے بارڈے صاحب کی سوتیلی بیٹی روزی کو بھی اغوا کر لیا تھا۔ رادھا اور علی پستول کی چھینا جھپٹی میں گولی چل گئی جو گھوشال شرما کو لگی تھی۔ رادھا روزی کو لے کر چلی گئی اور علی نے بڑی مشکل سے رہائی حاصل کی تھی۔ اس نے آنند کو باخبر کر دیا تھا۔ اس کے سیل فون پر رادھا کی کال آئی جو حالات کے بارے میں پوچھ رہی تھی۔ علی نے آنند کی آواز میں بتایا کہ سب کچھ ٹھیک ہے تو رادھا نے آنے کا عندیہ دے دیا تھا۔

## (اب آگے پڑھیں)

مجھے ایک ایک لمحہ صدیوں پر محیط لگ رہا تھا۔ اگر روزی، رادھا کے قبضے میں نہ ہوتی تو میں وہاں سے نکلنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہ کرتا۔ رادھا میرے لیے وبالِ جان بن گئی تھی۔ تقریباً دس منٹ کے بعد ہی مجھے قدموں کی آوازیں سنائی دیں تو میں ہوشیار ہو گیا اور کھڑکی کی جھری سے دیکھا، وہ رادھا ہی تھی جو کھڑکی کے سامنے سے گزر رہی تھی۔ اس کے ساتھ اور کوئی نہیں تھا۔ وہ اکیلی ہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں شکر ادا کیا۔ اس طرح رادھا پر قابو پانے کا بہترین موقع مل گیا تھا۔ رادھا اسی کمرے میں آ گئی تھی جس میں ارجن بندھا ہوا تھا۔ میں تیزی سے کمرے سے باہر نکل کر دروازے کی طرف بڑھا۔ اندر جانے کی بجائے میں دیوار کے ساتھ چپک کر رادھا کے باہر آنے کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یقین تھا کہ رادھا جب ارجن کو بندھا ہوا دیکھے گی تو وہ بدحواس ہو کر باہر آئے گی اور میں اس پر قابو پا لوں گا۔

پھر میری توقع کے عین مطابق ہوا۔ رادھا بدحواس ہو کر کمرے سے نکلی اور میری مخالف سمت جانا ہی چاہتی تھی کہ میں نے اس کے سر پر ریوالور کا دستہ رسید کر دیا۔ وہ ہلکی سی آواز میں کراہی اور گھومتی ہوئی میری طرف مڑی ہی تھی کہ میں نے اس کے سر پر دوبارہ ریوالور کا دستہ رسید کر دیا۔ وہ اس بار بغیر کراہے دیوار کے ساتھ گھسٹتی ہوئی فرش پر ڈھیر ہو گئی۔

میں نے ریوالور جیب میں رکھا اور رادھا کو دونوں بازوؤں سے پکڑے گھسیٹتا ہوا کھڑکیوں والے کمرے میں لے آیا۔ میں نے اس کی نبض چیک کی تو میرے اندازے کے مطابق وہ دو گھنٹے سے پہلے ہوش میں آنے والی نہیں تھی۔ میں پہلے اپنے طور پر روزی کو تلاش کرنا چاہتا تھا اس لیے میں کمرے سے نکل کر روزی کو تلاش کرنے لگا۔

میں نے پوری عمارت میں دیکھ لیا لیکن مجھے روزی کسی بھی کمرے میں دکھائی نہ دی۔ میں نے سوچا کہ یقیناً رادھا نے اسے کسی خفیہ جگہ پر چھپایا ہو گا۔ میں بے نیل و مرام واپس اسی کمرے میں آ گیا جہاں رادھا کو چھوڑ گیا تھا۔ میں نے دروازے کو کنڈی لگائی اور رادھا کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اسے ہوش میں لانے لگا۔ میں نے اس کا ناک اور منہ بیک وقت بند کر دیا تو چند لمحوں کے بعد اس کے جسم میں حرکت کے آثار پیدا ہوئے۔ میں پیچھے ہٹ گیا۔

چند ہی لمحے لگے کہ رادھا ہوش میں آ گئی۔ پہلے وہ خالی خالی نظروں سے چھت کو گھورتی رہی، پھر وہ کسمساتے ہوئے اٹھی اور اپنا سر سہلانے لگی۔ جیسے ہی اس کی نظر مجھ پر پڑی تو وہ بے ساختہ دہل گئی۔

''تت... تت... تم۔'' اس کے منہ سے بہ مشکل ہی یہ الفاظ نکلے۔ میں نے ریوالور اس کی پیشانی سے لگا دیا تو اس کے چہرے پر خوف کے تاثرات ابھر آئے۔

''مجھے دیکھ کر حیران ہو گئی ہو؟''

جواباً اس نے بے ساختہ سر ہلا دیا۔

''زیادہ حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے سانپ کی سی آواز میں پھنکارتے ہوئے کہا۔ ''روزی کہاں ہے؟''

جواب دینے کی بجائے وہ دہشت زدہ انداز میں ریوالور کو تکتی رہی۔ نصف منٹ گزرا اور اس نے جواب نہ دیا تو میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''میں کچھ پوچھ رہا ہوں روزی کہاں ہے؟ نہیں بتاؤ گی تو جان سے جاؤ گی۔''

''تم... تم ہتیارے ہو۔'' دفعتاً اس نے ترش روئی سے کہا۔

''میں...؟'' میں نے اپنی طرف اشارہ کرتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں دریافت کیا۔

''ہاں... تم۔'' وہ جواباً غصے سے بولی۔ ''تم ہتیارے ہو۔''

''میں نے کس کی ہتیا کی ہے؟'' میں نے دریافت کیا۔ ''میں نے کسی کی ہتیا نہیں کی۔'' مجھے اسے حالانکہ صفائی دینے کی قطعی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ مسلسل مجھے ہتیارا قرار دے رہی تھی۔

''تم نے گھوشال شرما کی ہتیا کی ہے۔'' وہ بولی۔

''بکواس کر رہی ہو۔'' میں نے چراغ پا ہوتے ہوئے کہا۔ ''میں نے گھوشال شرما کی ہتیا نہیں کی۔''

''تم نے ہی اس کی ہتیا کی ہے۔'' وہ بھی بضد تھی۔

''پستول تمہارے ہاتھ میں تھا۔'' میں نے صراحت کی۔ ''اور لبلبی پر تمہاری انگلی تھی۔ اب فیصلہ کر لو لبلبی کس نے دبائی تھی؟''

میری بات پر رادھا لاجواب تو ہو گئی تھی لیکن ماننے کو تیار نہیں تھی۔ برافروختہ ہوتے ہوئے بولی۔ ''جو بھی ہو... تم پستول نہ چھینتے تو شاید گولی نہ چلتی۔ تمہاری ہی وجہ سے گھوشال شرما کی ہتیا ہوئی ہے۔ اور کھور جیت شرما تمہیں زندہ نہیں چھوڑے گا۔ وہ تمہارے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔''

''ہونہہ...'' میں نے ہنکاری بھری۔ ''میں نے بڑے بڑے سورما دیکھے ہیں۔ اسے بھی دیکھ لوں گا۔''

''تم کتے کی موت مرو گے۔'' رادھا تیکھے چتونوں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔

''فی الحال تو تم موت کے دہانے پر ہو رادھا جی۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''روزی کے بارے میں بتاؤ گی تو بچ جاؤ گی۔ جان پیاری ہے تو بتا دو، ورنہ میں تمہیں بھی گھوشال شرما کے پاس بھیج دیتا ہوں۔ کیا کہتی ہو۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے ریوالور کی لبلبی پر ہلکا سا دباؤ بڑھایا تو رادھا بے اختیار بول اٹھی۔

''رر... رک جاؤ۔'' اس کے لہجے میں خوف صاف ظاہر تھا۔

''موت سے کتنا ڈرتی ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔'' اس نے بے ساختہ کہا۔

''تو پھر کب مرنا پسند کرو گی؟ بہرحال تمہارے پاس تین منٹ ہیں۔'' میں نے مصمم ارادے سے کہا۔ ''اگر تم نے تین منٹ سے پہلے تک روزی کے بارے میں نہ بتایا تو میں گولی مارنے میں تاخیر نہیں کروں گا۔ ویسے بھی مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ میں گنتی شروع کر رہا ہوں۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں نے رک رک کر گنتی بھی شروع کر دی۔ رادھا کے چہرے پر اب کی بار خوف کے سائے لہرائے تھے۔ جب میں تین گننے ہی لگا تھا کہ رادھا ایک بار پھر بول اٹھی۔

''بتاتی ہوں... بتاتی ہوں۔ رک جاؤ۔ گولی مت چلاؤ۔ رک جاؤ... پپ... پلیز...''

''ہوں... بتاؤ۔'' میں نے کہا۔

''پہلے ریوالور ہٹاؤ۔'' اس نے کہا تو میں نے ریوالور ہٹا لیا۔

''کوئی چالاکی مت دکھانا۔'' میں نے اسے تنبیہ کی۔ ''نقصان تم ہی اٹھاؤ گی۔''

''وہ تہہ خانے میں قید ہے۔'' رادھا نے روزی کے بارے میں جانکاری دیتے ہوئے کہا تو میں چونکا۔

''تہہ خانہ کہاں ہے؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ''میں تلاش کر لوں گا۔''

''تہہ خانہ تمہیں نہیں ملے گا۔'' رادھا نے جواباً کہا۔

''کیوں؟''

''وہ... وہ خفیہ بنا ہوا ہے۔''

''تو پھر دیر کیوں کر رہی ہو۔ اٹھو اور مجھے تہہ خانے میں لے چلو۔'' میں نے اسے اٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے کہا تو وہ چند لمحوں تک عالمِ تذبذب میں مجھے دیکھتی رہی پھر بادلِ نخواستہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

میں اسے ریوالور کی زد پر کمرے سے باہر لے آیا۔ وہ راہداری کی طرف بڑھ گئی۔ وہ آگے تھی اور میں پیچھے چل رہا تھا۔ مجھے اس سے کسی قسم کی اچھائی کی امید نہیں تھی۔ وہ ایک عیار لومڑی تھی۔ اس سے کسی بھی حرکت کی توقع کی جا سکتی تھی۔ میں بے حد چوکنا تھا۔ وہ مختلف بھول بھلیوں سے ہوتی ہوئی ایک دیوار کے پاس جا کر رک گئی۔ اس نے پہلے میری طرف دیکھا پھر دیوار پر ایک مخصوص جگہ پر ہاتھ مارا تو ہلکی سی گڑگڑاہٹ کی آواز کے ساتھ ہی دیوار دوسری سائیڈ [illegible]

میں نے دیوار پر دیکھنا مناسب نہ سمجھا کہ اس نے کس جگہ ہاتھ مارا تھا۔ وقت بے حد کم تھا اور میں جلد سے جلد روزی کو لے کر وہاں سے نکلنا چاہتا تھا۔

میں نے رادھا کو دروازہ کھولنے کا اشارہ کیا تو اس نے ترچھی چتونوں سے مجھے دیکھتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔ دوسری طرف اندھیرا تھا۔ رادھا نے آگے بڑھ کر دیوار پر موجود سوئچ بورڈ پر بٹن دبایا تو یکدم روشنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا، سیڑھیاں گولائی کی صورت میں نیچے جا رہی تھیں۔ سیڑھیوں کے ساتھ ہی لوہے کی گرل لگی ہوئی تھی۔

میں نے تہہ خانے میں داخل ہو کر دروازہ بند کیا اور رادھا کو لیے سیڑھیاں اترا۔ تہہ خانے کے کونے میں سنگل بیڈ پر روزی عالم بے ہوشی میں پڑی تھی۔ میں نے غیظ و غضب بھری نظروں سے رادھا کو دیکھا تو وہ سہم گئی۔

"کیا یہ بے ہوش ہے؟" میں نے کرخت لہجے میں رادھا سے استفسار کیا۔

جواباً وہ سر ہلاتے ہوئے بولی۔ "ہاں۔"

"تم نے اسے بے ہوش کیوں کیا تھا؟" میں نے دانتوں کو کچکچاتے ہوئے پوچھا۔

"یہ۔۔۔۔ یہ بہت شور کر رہی تھی۔" رادھا نے صفائی پیش کی۔ "اور مجھ پر حملہ بھی کیا تھا۔ مجبوراً میں نے اسے بے ہوش کر دیا۔"

میں نے غصیلی نظروں سے رادھا کو گھورا تو وہ سہم گئی۔ اس کی یہ کیفیت میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ پہلے جب اس سے مڈبھیڑ ہوئی تھی تو تب وہ اتنی خوفزدہ نہیں ہوئی تھی جتنا کہ اب ہو رہی تھی۔ میرا دل کیا کہ اس کے منہ پر ایک جھانپڑ رسید کر دوں لیکن میں نے خود کو باز رکھا۔

"م۔۔۔۔ م۔۔۔۔ مجھے کچھ مت کہنا۔" وہ خوف بھرے لہجے میں بولی۔

"دل تو چاہ رہا ہے کہ میں تمہیں ابھی موت کی نیند سلا دوں، لیکن۔۔۔۔" میں نے دانت کچکچاتے ہوئے کہا۔ "لیکن میں تمہیں اس لیے چھوڑ رہا ہوں کیونکہ میں خواہ مخواہ کے خون خرابے کا قائل نہیں ہوں، میری تم سے کوئی دشمنی نہیں ہے۔ تم نے ایک پاپی کا ساتھ دیا اور اس کے اشاروں پر ناچتی رہی۔ تمہارا بھائی دیکھ لو اپنے انجام کو پہنچ چکا ہے۔ تم بھی کسی کے ہاتھوں انجام کو پہنچ جاؤ گی۔ ایک بات اپنے دماغ میں محفوظ کر لو۔ اس بار میں تمہیں زندہ چھوڑ کر جا رہا ہوں، اگر تم دوبارہ میرے راستے میں حائل ہوئی تو میں تمہیں مارنے میں ایک لمحے کی بھی تاخیر نہیں کروں گا۔ کوشش کرنا میرے سامنے مت آنا۔"

میرے لہجے میں بے پناہ کرختگی اور مضبوطی تھی جس کی وجہ سے رادھا کا چہرہ لٹھے کی مانند سفید ہو گیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی بات کرتی، میں نے بلا تاخیر اس کے سر پر ریوالور کا دستہ رسید کر دیا۔ اس بار ضرب خاصی کارگر ثابت ہوئی تھی۔ رادھا کے منہ سے کراہ نکلی اور وہ لہراتی ہوئی فرش بوس ہو گئی۔ میں نے اسے گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ ڈالا اور روزی کے پاس پہنچ گیا۔ میں نے ریوالور جیب میں ٹھونسا اور روزی کی طرف بڑھا۔

اس کے چہرے پر سرخ نشان بھی تھے جس کا واضح مطلب تھا کہ رادھا نے اس کے چہرے پر تھپڑ بھی مارے تھے۔ میں نے سب کچھ ذہن سے جھٹک کر روزی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی۔ "روزی! ہوش میں آؤ۔ اٹھو۔ ہم نے فوری طور پر نکلنا ہے۔ روزی۔ کیا تم مجھے سن رہی ہو؟"

روزی پر شاید گہری بے ہوشی طاری تھی اس لیے وہ میری آواز پر ہوش میں نہ آئی۔ تہہ خانے میں پانی بھی موجود نہیں تھا جس سے میں روزی کو ہوش میں لاتا۔ درحقیقت مجھے رنجیت شرما کی پریشانی تھی۔ وہ گھوشال شرما کا بیٹا تھا اور جب گھوشال شرما گولی لگنے سے زخمی ہوا تھا تو رنجیت شرما اسے اسپتال لے گیا تھا۔ مجھے کچھ اور نہ سوجھا تو میں نے جلدی سے روزی کو کندھے پر اٹھایا اور تیزی سے سیڑھیاں چڑھتا ہوا تہہ خانے سے باہر آ گیا۔ جاتے وقت میں تہہ خانے کا دروازہ سائنسی طریقے سے بند کرنا نہیں بھولا تھا۔

عمارت سے باہر نکلتے ہی میں تیز تیز چلتا ہوا آبادی کی طرف بڑھا۔ وہ نیم سنسان اور جنگل نما علاقہ تھا۔ جس جگہ گھوشال شرما کی عمارت موجود تھی وہ آبادی سے ہٹ کر تھی۔ روزی کا سر ڈھلکا ہوا تھا اور اس کے بازو ہوا میں لہرا رہے تھے۔ گو روزی ایک دھان پان سی اور ہلکی پھلکی لڑکی تھی لیکن اس وقت حالات ایسے تھے کہ اسے اٹھائے درختوں والے حصے تک پہنچتے پہنچتے میرا سانس پھول گیا تھا۔ وہ درختوں والا حصہ عمارت سے قدرے دور اور عمودی سائیڈ پر تھا۔ عمارت سے ہمیں دیکھ لینا آسان نہیں تھا۔

میں تھوڑی دیر تک روزی کو اٹھائے چلتا رہا۔ بالآخر جب ہمت جواب دے گئی تو میں نے روزی کو ایک درخت کے پاس گھاس پر لٹا دیا اور لمبے لمبے سانس لینے کے ساتھ ساتھ قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ جب میرا سانس معتدل ہوا تو میں نے روزی کو ہوش میں لانے کی کوشش کی تاکہ وہ ہوش میں آ کر میرے ساتھ ہی چلے۔ روزی نے شاید ہوش میں نہ آنے کی قسم کھائی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ دل نے کہا کہ میں روزی کو یہیں چھوڑ کر چلا جاؤں لیکن دماغ نے دل کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ یہ خود غرضی ہوتی جو میں کسی صورت نہیں کر سکتا تھا۔

میں نے ایک بار پھر روزی کو اٹھایا اور چل پڑا۔ جانتا تھا اگر رنجیت شرما عمارت میں پہنچ گیا اور اسے علم ہو گیا کہ میں رادھا کو بے ہوش کر کے روزی کو لے کر نکل گیا ہوں تو وہ بھوکے کتے کی طرح اپنے کماشتوں کے ساتھ میری تلاش شروع کر دے گا۔

مجھے چلنے میں خاصی دقت ہو رہی تھی۔ اگر روزی ہوش میں ہوتی یا زخمی ہوتی تو اسے لے کر چلنے میں مشکل نہ ہوتی۔ بے ہوش یا مردہ انسان کا وزن بڑھ جاتا ہے۔ یہی حال روزی کا تھا۔ ایک بار پھر مسلسل چلنے کے باعث میں تھک گیا تھا اس لیے ایک بار پھر میں نے روزی کو درخت کے سائے میں لٹا دیا اور گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر قرب و جوار کا جائزہ لینے لگا۔ ابھی تک فضا میں گہرا سناٹا طاری تھا۔ سورج غروب ہونے کے لیے اپنی منزل کی جانب گامزن تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اندھیرا پھیل جاتا تھا۔ میں اندھیرا ہونے سے پہلے ہی روزی کو لے کر نکل جانا چاہتا تھا۔ میں روزی کو دوبارہ ہوش میں لانے کی تگ و دو کرنے لگا۔

"روزی۔۔۔۔ روزی۔۔۔۔ پلیز ہوش میں آؤ۔۔۔۔ روزی۔" میں نے اس بار روزی کے نرم رخساروں کو تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

میری تشویش بڑھتی جا رہی تھی۔ میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں روزی کی بے ہوشی کی حالت میں ڈیتھ نہ ہو گئی ہو، آخر وہ ہوش میں کیوں نہیں آ رہی تھی۔ اسی خیال کے تحت میں نے اس کی نبض ٹٹولی۔ اگلے ہی پل میرے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر بڑھ گئی۔ صد شکر کہ روزی کی نبض چل رہی تھی لیکن اس کی رفتار دھیمی تھی۔ مجھے لگا کہ اس کی زندگی خطرے میں ہے اور اسے ہوش میں لانا ضروری ہے۔ معاً میری نظر وہاں سے گزرتے ایک بچے پر پڑی۔

اس بچے کی عمر بارہ تیرہ برس کے آس پاس تھی۔ اس نے سادہ رنگ کا لنگوٹ پہنا ہوا تھا۔ اس کی رنگت گہری سانولی تھی۔ اس کے پیروں میں ٹوٹی پھوٹی چپل تھی۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلتا ہوا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر میرے اندر امید کی ایک کرن جاگی۔ میں نے اسے آواز دی۔ "سنو بچے....."

میری آواز اس بچے کی سماعت میں پڑی تو اس نے رک کر گردن موڑی اور میری طرف دیکھا۔ میں نے اسے اشارے سے اپنے پاس بلایا تو وہ دوڑا چلا آیا۔ قریب آتے ہی اس نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ "نمستے بابو....." اس کے ماتھے پر بھی تلک تھا۔

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "بچے! کیا تمہارا گھر یہیں قریب ہی میں ہے؟"

"ہاں بابو..... وہ پاس میں ہے۔" کہنے کے ساتھ ہی بچے نے ایک جانب اشارہ بھی کر دیا تھا۔

"بچے! ایک گلاس پانی تو لا دو۔" میں نے بچے سے منت بھرے لہجے میں کہا۔

"ابھی لے کر آیا بابو....." کہنے کے ساتھ ہی بچہ ایک سمت دوڑ گیا۔ اس کے جاتے ہی میں روزی کی طرف دیکھنے لگا۔

کچھ ہی دیر کے بعد بچہ پانی سے بھری پلاسٹک کی ایک بوتل لے آیا۔ بوتل خاصی بڑی تھی۔ میں نے بوتل لے کر اس کا ڈھکن کھولا، پانی کے چھینٹے روزی کے چہرے پر مارے۔ صد شکر کہ اس عمل سے روزی کے ہوش میں آنے کے آثار پیدا ہو گئے اور چند لمحوں کے بعد اس نے کسمساتے ہوئے آنکھیں کھول دیں۔ وہ چند سیکنڈ تک گو مگو کی کیفیت میں مبتلا رہی پھر اس نے گردن موڑ کر میری طرف دیکھا تو وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"م..... م..... میں کہاں ہوں؟" اس نے سرسراتی آواز میں استفسار کیا۔ کہنے کے ساتھ ہی اس نے درختوں پر بھی نظر دوڑائی تھی۔

"شکر ہے تمہیں ہوش تو آیا۔" میں نے متشکرانہ لہجے میں کہا۔ پھر میں نے بوتل کو ڈھکن لگا کر اسے بچے کو پکڑائی اور مسکراتے ہوئے کہا۔ "دھنیہ واد بچے۔"

"میرا نام ونود ہے بابو۔" بچے نے کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ بچہ بوتل لے کر وہیں کھڑا رہا تھا۔ شاید اس کا خیال تھا کہ میں پانی لانے کے بدلے اسے کچھ دوں گا لیکن میری جیب خالی تھی۔ مجھے شرمندگی بھی ہو رہی تھی لہٰذا میں شرمندہ ہونے پر مجبور تھا۔

میں نے روزی سے کہا۔ ''سوال بعد میں کر لینا ابھی یہاں سے فوری طور پر نکلنا ہے۔''

''وہ..... وہ رادھا.....''

میں نے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ سمجھ گئی اور پھر جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ میں نے بچے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''بچے! اس وقت میری جیب خالی ہے۔ اگر کبھی اس طرف آیا تو تمہیں ڈبل پیسے دوں گا۔'' کہنے کے ساتھ ہی میں روزی کو لیے ایک سمت بڑھ گیا۔ بچہ عجیب نظروں سے ہمیں دیکھ رہا تھا۔

کچھ ہی دور جانے کے بعد ہمیں ایک کچی سڑک دکھائی دی تھی۔ سڑک کے راستے جانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے میں نے درختوں والے جھنڈ کے راستے کو ترجیح دی تھی۔ اس طرح ہم محفوظ طریقے سے اس علاقے سے نکل سکتے تھے۔ روزی متذبذب تھی اور مجھ سے کچھ پوچھنا چاہتی تھی لیکن میں نے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کر دیا تھا۔ ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ عبور کیا تھا کہ کسی جیپ کی آواز گوش رسیدہ ہوئی۔ ہم دونوں بے اختیار چونک کر رک گئے۔ جیپ کی آواز سے محسوس ہوا تھا کہ وہ کہیں قریب میں ہی موجود ہے۔

اگلے ہی پل میں روزی کو بازو سے پکڑ کر تیزی سے جھاڑیوں کی اوٹ میں ہو گیا تھا کیونکہ مجھے سڑک سے آتی ایک جیپ دکھائی دی تھی۔ اگر ہم بروقت جھاڑیوں کی اوٹ میں نہ ہوتے تو جیپ میں سوار افراد ہمیں دیکھ لیتے۔ میرے اندازے کے مطابق اس جیپ میں رنجیت شرما اور اس کے گماشتے سوار تھے۔ جیپ جھاڑیوں کے سامنے سے گزرتی ہوئی عمارت کی طرف گئی تھی۔ پھر جب اس کی آواز قدرے دور ہوتی گئی تو میں نے روزی کو چلنے کا اشارہ کیا۔ جیپ کی آواز آہستہ آہستہ کم اور پھر معدوم ہو گئی تھی۔ ہم دوبارہ آگے بڑھے۔

''کیا تم نے رادھا کو مار دیا ہے؟'' روزی نے پھر زبان کھولی۔

''نہیں.....'' میں نے اتنا ہی کہا۔

''کیوں؟ تم نے اسے زندہ کیوں چھوڑ دیا؟'' اس نے استفسار کیا۔ ''اس نے مجھے تھپڑ مارے تھے۔ مجھ پر تشدد کیا تھا۔''

''جانتا ہوں لیکن اسے مار کر ہمیں کچھ حاصل نہیں ہوتا۔''

ہوا تھا۔'' میں نے جواباً کہا۔

''میرا سیل فون بھی اسی کے پاس تھا۔'' اس نے کہا تو میں نے ہونٹ بھینچ لیے۔

''مجھے یاد نہیں رہا تھا ورنہ اس سے لے لیتا۔'' میں نے کہا۔ ''کوئی بات نہیں۔ تم نیا سیل فون لے لینا۔''

''میری ممی بہت پریشان ہوں گی۔'' روزی کے لہجے میں تفکر تھا۔ ''میں ان کو اطلاع کرنا چاہتی تھی۔''

''اب کیا کیا جا سکتا ہے۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ جواباً اس نے خاموشی اختیار کر لی۔

ابھی ہم نے تھوڑا ہی فاصلہ عبور کیا تھا کہ دفعتاً جیپ کی آواز سمع خراش ہوئی اور میں سمجھ گیا کہ جیپ دوبارہ اسی طرف آ رہی ہے جدھر ہم موجود ہیں۔ شاید رنجیت شرما کو ہم دونوں کے فرار کا علم ہو گیا تھا۔ میں نے سوچا۔

''اوہو..... جیپ واپس آ رہی ہے۔'' روزی نے خوف بھرے لہجے میں کہا۔

''شاید رنجیت کو ہمارے فرار کا پتا چل گیا ہے۔'' میں نے کہا تو روزی چونکی۔

''یہ رنجیت کون ہے؟'' اس نے حیرت بھرے لہجے میں استفسار کیا۔

''گھوشال شرما کا بیٹا۔'' میں نے بتایا۔ ''گھوشال شرما کی وفات ہو گئی ہے۔''

''اوہ واقعی.....'' روزی حیران ہوئی۔

''ہاں.....'' میں نے گردن ہلائی۔ ''وہ مجھے اپنے باپ کا ہتیارا سمجھتا ہے۔ شاید مجھ سے انتقام لینے کی خاطر آیا ہے۔''

''اوہو۔'' روزی کو تشویش ہوئی۔ ''پستول تو رادھا کے ہاتھ میں تھا۔ شاید گولی بھی اسی سے چلی تھی۔''

''شاید نہیں یقیناً۔'' میں نے تصحیح کی۔ ''گولی اسی سے چلی تھی لیکن وہ نہیں مانتی۔''

''ظاہر ہے وہ کیسے مانے گی۔'' روزی نے خیال ظاہر کیا۔ ''لیکن اب ہم یہاں سے کیسے نکلیں گے۔ اگر ہم سڑک پر پہنچے تو رنجیت شرما ہمیں دیکھ لے گا۔''

''ہاں۔ یہ امکان موجود ہے۔'' میں نے اس کی بات کی تائید کی۔

''پھر.....'' وہ بولی ہی تھی کہ میں نے بجلی کی سی تیزی سے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا کیونکہ اچانک ہی ہمارے سامنے وہ جیپ آ رکی تھی۔



میں روزی کو لیے تیزی سے جھاڑیوں میں دبک گیا۔ جیپ سڑک پر رک گئی تھی اور اس میں سے تین لوگ اترے تھے۔ ایک نے سفید رنگ کا پاجامہ اور ہلدی رنگ کا کرتہ پہنا ہوا تھا۔ اس کی کلائیوں میں کڑے تھے اور دھاگے بندھے ہوئے تھے جبکہ باقی دو پتلونوں اور شرٹوں میں ملبوس تھے۔ ہلدی رنگ کرتے والا گھوشال شرما کا ہمشکل تھا۔ اسے دیکھ کر میں سمجھ گیا کہ وہ رنجیت شرما ہے۔ میں اسے پہلی بار ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ میرا ہی ہم عمر تھا لیکن وہ اپنے چہرے سے موالی ہی دکھائی دیتا تھا۔

رنجیت شرما اپنے گماشتوں سے کہہ رہا تھا۔ ''ان دونوں کو ڈھونڈو۔ وہ یہیں ہوں گے۔ اتنی جلدی یہاں سے نہیں نکل سکتے۔ مجھے وہ دونوں ہر صورت جندہ (زندہ) چاہئیں..... سن رہے ہو جندہ کا مطلب جندہ۔'' کہنے کے ساتھ ہی اس نے پستول نکال لیا تھا۔

''ٹھیک ہے رنجیت بابو۔'' ایک نے جواباً کہا تھا۔

''تم فکر مت کرو۔''

''چلو پھوٹو یہاں سے اور ان (غلیظ گالی) کو تلاش کرو۔'' رنجیت شرما نے ہم دونوں کو غلیظ گالی سے بھی نوازا تھا۔ اس کے گالی دینے پر میرا دماغ کھول اٹھا تھا۔ پورے وجود میں آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ بے چاری روزی گالی سن کر شرمسار ہو گئی تھی۔

دونوں گماشتے اپنا اپنا ریوالور سنبھالے ہماری تلاش میں درختوں والے جھنڈ میں داخل ہو گئے تھے۔ روزی نے بھی ان دونوں کو دیکھ لیا تھا تبھی اس کے چہرے پر خوف کے مارے زردی کھنڈ گئی تھی۔ اس کے وجود پر کپکپاہٹ بھی طاری ہو چکی تھی۔ میں نے سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔

''گھبراؤ نہیں، کچھ نہیں ہو گا۔ میں ہوں تمہارے ساتھ۔''

''لیکن وہ تین ہیں اور تم اکیلے۔''

''میں ان تینوں پر اکیلا بھی بھاری ہی ہوں۔'' میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا۔ ''بس تم نے چپ رہنا ہے۔ اور دیکھتی جاؤ میں ان کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔''

روزی خاموش ہو گئی تھی۔ جس طرح فلموں میں اکیلا ہیرو تین تین موالیوں پر بھاری پڑ جاتا ہے تو میں بھی ان تینوں کے لیے اکیلا ہی کافی تھا۔

وہ دونوں بڑے چوکنے انداز میں قدم بہ قدم چلتے ہوئے اِدھر اُدھر پھیل گئے تھے۔ گو جھاڑیاں گھنی تھیں لیکن [illegible]

کے پاس ہی چوکنے انداز میں کھڑا تھا۔ اس نے اپنے آستین اوپر چڑھا لیے تھے جیسے مقابلے پر آنے کے لیے تیار ہو۔

''ہم بری طرح پھنس چکے ہیں مورس۔'' دفعتاً روزی نے سرسراہٹ کی۔

''کچھ نہیں ہو گا۔ بس تم چپ رہو۔'' میں نے اسے ڈانٹتے ہوئے کہا۔ ''میں سب سنبھال لوں گا۔''

اس کا بولنا مجھے اچھا نہیں لگا تھا کیونکہ ایک گماشتہ ہمارے قریب پہنچ چکا تھا۔ روزی کی آواز اس کے کانوں میں پڑ سکتی تھی اور یوں وہ تینوں ہی ہم پر دھاوا بول سکتے تھے۔ میری ڈانٹ پر روزی خاموش ہو گئی لیکن خوف اس کے چہرے سے مترشح تھا۔ پھر وہ دوبارہ بولی۔ ''مجھے..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔''

مجھے روزی پر غصہ آنے لگا تھا وہ میری توجہ ان مشٹنڈوں سے ہٹا رہی تھی تاہم میں نے اپنے غصے پر بڑی مشکل سے قابو پایا تھا۔ میں نے دیکھا کہ ایک شخص ہماری جھاڑیوں کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا۔ شاید اسے ہماری موجودگی کا احساس ہو گیا تھا۔ اس سے نمٹنے کے لیے میں بالکل تیار تھا۔ جھاڑیوں کے قریب پہنچ کر اس کی نظر مجھ پر پڑی تو اس کے چہرے پر حیرت کے تاثرات پھیلے۔ قبل اس کے کہ وہ چیخ کر اپنے ساتھیوں کو متوجہ کرتا، میں نے برق رفتاری سے جھاڑیوں سے نکل کر اس پر حملہ کر دیا۔ حملہ کرتے ہوئے میں نے اس کے ناک پر گھونسا مارا تھا جیسا کہ میں دوسروں کو بھی مارتا رہا تھا کیونکہ یہ میرا خطرناک وار تھا۔ اس وار سے مدمقابل کا دماغ یقیناً جھنجھنا اٹھتا تھا۔ گھونسا کھاتے ہی اس مشٹنڈے کے حلق سے دبی دبی چیخ نکلی اور اس نے ریوالور پھینک کر اپنے ناک پر ہاتھ رکھ لیا تھا۔

میں نے اسے سنبھلنے کا موقع نہیں دیا تھا۔ گھونسا مارنے کے بعد میں پتلون کی جیب سے ریوالور نکال چکا تھا چنانچہ میں نے ریوالور کا رخ اس کی ٹانگ کی طرف کر کے لبلبی دبا دی۔ میرا ریوالور بے آواز تھا۔ گولی کی آواز تو نہ گونجی لیکن اس مشٹنڈے کے منہ سے نکلنے والی چیخ سے رنجیت شرما اور اس کا ساتھی ہماری طرف متوجہ ضرور ہو گئے تھے۔

''اسے کیا ہوا تمہیں؟'' دفعتاً رنجیت شرما کی تشویش بھری آواز گونجی۔

''وہ..... وہ.....'' اسے کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ میں نے [illegible]

کے بل گرا اور کراہنے لگا۔ میں اسی لمحے اچھلے کا دوسرا ساتھی دوڑتا ہوا میری طرف آیا۔ میں اس کے لیے بھی تیار تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی گولی چلا دی تھی۔ میری خوش بختی تھی کہ گولی میرے سر کے بالوں سے دو انچ اوپر سے ہوتی ہوئی فضا میں گم ہو گئی تھی۔ اللہ نے مجھے بال بال موت کے منہ میں جانے سے بچا لیا۔ دوسرا موقع دینا خود کو موت کے حوالے کرنے کے مترادف تھا۔ میں نے بجلی کی سی تیزی سے زمین پر دایاں گھٹنا کے بل بیٹھتے ہوئے تاک کر اچھلے کے ساتھی پر گولی چلا دی۔ پتا نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا کہ میں ایکشن میں آ گیا تھا جس پر میں خود بھی حیرت زدہ تھا۔ دراصل اس وقت زندگی اور موت کا کھیل چل رہا تھا۔ اگر میں انہیں گولیاں نہ مارتا تو انہوں نے مجھے اور روزی کو کوئی رعایت دیے بغیر گولیوں سے بھون ڈالنا تھا۔

میری چلائی ہوئی گولی اچھلے کے ساتھی کی دائیں ٹانگ میں لگی تھی اور وہ دردناک انداز میں کراہتا ہوا وہیں ڈھیر ہو گیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں پستول دبا ہوا تھا اور اس نے شاید ایک اور کوشش کرنی چاہی تھی۔ اس نے اٹھتے ساتھ ہی مجھے نشانے پر لینے کی کوشش کی تھی لیکن میں نے اسے موقع نہ دیا تھا۔ میری چلائی ہوئی گولی اس کے ہاتھ پر لگی اور اس کے حلق سے نکلنے والی چیخ سے فضا مرتعش ہو گئی۔

پستول اس کے ہاتھ سے نکل کر زمین پر گر چکا تھا۔ وہ خود بھی اب زمین پر پڑا تڑپ رہا تھا۔

''سجاش..... سجاش۔'' دفعتاً رنجیت شرما نے اپنے دوسرے زخمی ساتھی کو آواز دی تھی۔ ''تو ٹھیک تو ہے؟''

سجاش نامی وہ شخص اس قابل ہی نہ تھا کہ رنجیت شرما کو جواب دے پاتا۔ میں نے تیزی سے جھاڑیوں میں دیکھتے ہوئے رنجیت کی طرف دیکھا۔ وہ بھی ایک درخت کی آڑ لے چکا تھا اور اندھا دھند گولیاں چلا رہا تھا۔ شاید اسے اندازہ نہیں تھا کہ میں کس طرف چھپا ہوا ہوں۔ مجھ سے تھوڑے فاصلے پر روزی دبکی ہوئی تھی۔ وہ ہراساں ہرنی کی مانند دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اسے اشارہ کر دیا کہ وہ دبکی رہے۔ جواباً اس نے اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

''بزدلوں کی طرح چھپ کر وار کر رہے ہو رنجیت۔'' میں نے للکارتے ہوئے اسے تاؤ دلایا۔ ''مرد ہو تو سامنے آ کر مقابلہ کرو۔''

''میں تمہارا لہو (خون) پی جاؤں گا۔'' رنجیت شرما نے غراتے ہوئے کہا۔ ''تو میرے چاچا کا ہتیارا ہے میں تجھ سے اپنے چاچا کے لہو کا بدلا لوں گا۔''

''کیا درخت کے پیچھے چھپ کر خون پیو گے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''سامنے آؤ..... اور ہاں میں نے تیرے چاچا کی ہتیا نہیں کی۔ تیرے چاچا کی ہتیا رادھا نے کی ہے۔ پستول اسی کے پاس تھا۔''

''بکواس بند کر۔'' وہ گرجا۔ ''رادھا نردوش ہے جبکہ تو نے ہتیا کی ہے..... تو ہتیارا ہے۔''

''پھر سامنے آ کر مجھ سے بدلا لو۔'' میں نے ایک بار پھر اسے للکارا۔ ''گیدڑ مت بن۔''

جواب میں رنجیت شرما نے درخت کی اوٹ سے نکل کر مجھ پر گولی داغ دی۔ شاید اس نے اب کی بار اندازہ لگا لیا تھا کہ میں کس طرف موجود ہوں۔ گولی میرے بجائے عقب میں موجود ایک درخت میں پیوست ہو گئی۔ جس طرح اندھا دھند وہ گولیاں جھونک رہا تھا اس طرح مجھے یا روزی دونوں میں سے کسی کو بھی گولی لگ سکتی تھی اسی لیے میں نے فوری طور پر فیصلہ کیا۔ میں نے زمین پر لیٹتے ہوئے سانپ کی طرح ایک درخت کی طرف رینگنا شروع کر دیا۔ روزی سہمی ہوئی اور جھکی میری طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے روزی سے کہا۔ ''چلو میرے ساتھ۔''

روزی میری بات سمجھ گئی تھی اس لیے وہ بھی جھکی جھکی میری طرف بڑھی۔ وہ قریب پہنچی تو میں برق سرعت سے اٹھا اور روزی کا ہاتھ پکڑ کر آناً فاناً ایک درخت کی اوٹ میں ہو گیا۔ عین اسی لمحے رنجیت شرما نے ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ کی تھی۔ میں تو محفوظ رہا تھا لیکن روزی کے بازو سے گولی رگڑ کھاتی ہوئی نامعلوم سمت کی جانب گامزن ہو گئی تھی۔ روزی کے منہ سے دردناک چیخ نکلی اور اس نے اپنے بازو پر ہاتھ رکھ لیا۔

رنجیت شرما نے ایک بار پھر گولیاں چلائی تھیں لیکن اس بار ہم درخت کی اوٹ میں ہو کر محفوظ ہو چکے تھے۔ روزی کی آستین خون سے تر بتر ہو گئی تھی۔ اس کے چہرے پر کرب کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔ مجھے اس کی فکر لاحق ہوئی۔ میں نے اس کے زخم کا جائزہ لیا۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا لیکن اسے فوری طور پر طبی امداد کی ضرورت تھی۔

''تم میرے عقب میں آ جاؤ۔'' میں نے کچھ سوچ کر روزی کی حفاظت کے پیش نظر اس سے کہا۔ ''میں اسے سنبھالتا ہوں۔''



روزی فوراً ہی میرے عقب میں آ گئی تھی۔ مجھے اب اس کی طرف سے کوئی پریشانی نہ تھی۔ اس کی حفاظت کرنا مجھ پر فرض بھی تھا اور قرض بھی۔ میں نے درخت کی اوٹ سے رنجیت شرما کی طرف دیکھا۔ وہ بدستور درخت کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ میں نے ریوالور سے نشانہ سیٹ کر لیا۔ مجھے رنجیت شرما کے سامنے آنے کا انتظار تھا۔ چند سیکنڈ ہی گزرے تھے کہ مجھے رنجیت شرما درخت کی اوٹ سے نکلتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے وقت ضائع کیے بغیر اس پر گولی چلا دی۔

گولی رنجیت شرما کے بازو میں لگی اور اس کے منہ سے دلخراش چیخ نکل گئی۔ مارے غصے کے اس نے ہماری طرف اندھا دھند گولیاں برسانی چاہیں تو دو گولیوں کے بعد ہی اس کا ریوالور خالی ہو گیا تھا۔ اس نے ریوالور وہیں پھینکا اور وہاں سے فرار ہو گیا۔

میں اس کے پیچھے جانا چاہتا تھا لیکن روزی کی وجہ سے نہ جا سکا۔ رنجیت شرما نے فرار ہونے میں ذرا بھی دیر نہ لگائی تھی۔ میری نظر میں وہ عقل کا اندھا تھا جو اپنی جیپ میں زر ہونے کے باوجود پیدل ہی بھاگ گیا تھا۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟'' میں نے روزی سے پوچھا جو مسلسل اپنا زخمی بازو تھامے ہوئے تھی۔

''ہاں۔ میں ٹھیک ہوں۔'' اس نے جواباً کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آؤ۔'' میں نے کہا۔

میں روزی کو لے کر جیپ کی طرف بڑھا۔ ہمیں وہاں سے نکلنے کے لیے جیپ میسر آ چکی تھی۔ رنجیت شرما کے دونوں ساتھی فرش خاک پر پڑے اپنی اپنی ٹانگیں پکڑے کراہ رہے تھے۔ میں نے روزی کو فرنٹ سیٹ پر بٹھایا اور خود ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ صد شکر کہ اگنیشن میں چابی موجود تھی۔ میں نے جیپ اسٹارٹ کر کے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ جیپ کا رخ پہلے ہی مین سڑک کی طرف تھا اس لیے مجھے کوئی پریشانی نہ ہوئی تھی۔

میں نے بیک مرر میں عقب کا جائزہ لیا۔ پیچھے گرد کا طوفان اڑ رہا تھا۔ میں انتہائی مہارت سے جیپ چلا رہا تھا۔ مین روڈ پر پہنچتے ہی میں نے اس کی اسپیڈ میں اضافہ کر دیا۔ روزی زخمی بازو پکڑے ہوئے تھی اور اس کے چہرے پر تکلیف کے آثار نمایاں تھے۔ شاید اس نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ زندگی میں کبھی اس کا ایسے حالات سے پالا پڑ سکتا ہے۔ میں نے ڈیش بورڈ کھولا تو مجھے ایک رومال مل گیا۔

میں نے رومال روزی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''اسے اپنے زخم پر باندھ لو۔''

اس نے رومال لے کر اپنے زخم پر باندھ دیا۔ میں نے ایک بار پھر بیک مرر میں دیکھا تھا۔ ہمارے تعاقب میں کوئی نہ آیا تھا۔

''یہ لوگ کون ہیں اور پاپا سے کیا چاہتے ہیں؟'' دفعتاً روزی نے میری طرف دیکھتے ہوئے استفسار کیا۔

لمحاتی توقف کی خاموشی کے بعد میں نے کہا۔ ''شاید کاروباری مسئلہ ہے۔''

''مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' بے یقینی اس کے لہجے سے عیاں تھی۔

''کیوں؟'' میں مستفسر ہوا۔ ''تمہیں یقین کیوں نہیں؟''

''میرا دل کہہ رہا ہے کہ کوئی اور بات ہے۔'' روزی نے کہا تو میں نے ٹھنڈی سانس اپنے اندر اتاری۔ لمحاتی توقف کے بعد روزی دوبارہ مستفسر ہوئی۔ ''میرا خیال ہے تم جانتے ہو لیکن بتانا نہیں چاہتے۔''

''بتایا تو ہے کہ.....''

اس نے میری بات سرعت سے کاٹی۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

میں نے کندھے اچکائے لیکن خاموشی اختیار رکھی۔ شام کا اندھیرا پھیل رہا تھا اس لیے میں نے جیپ کی ہیڈ لائٹس آن کر دی تھیں۔ سڑک پر کافی گاڑیاں آ اور جا رہی تھیں۔

''اب ہم کہاں جا رہے ہیں؟''

''تمہارے گھر۔''

''ہوں۔'' اس نے ہنکاری بھری اور کہا۔ ''کیا تم میرے گھر کا راستہ جانتے ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''پہلے میں کسی مناسب جگہ پر جیپ چھوڑ دوں گا۔ پھر ہم کسی سواری کے ذریعے تمہارے گھر پہنچیں گے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آدھے گھنٹے کے بعد ہم پُررونق جگہ پر پہنچ گئے تو میں نے فٹ پاتھ کے قریب خالی جگہ پر جیپ روک دی اور انجن بند کر دیا۔

''آ جاؤ۔''

کچھ ہی فاصلے پر تین چار آٹو رکشے موجود تھے۔ ہم آٹو رکشے میں سوار ہو کر روزی کے گھر روانہ ہو گئے۔ اب اگر رجیت شرما یا اس کا کوئی گماشتہ ہماری تلاش میں آ بھی جائے گا تو بھی وہ ہماری گرد کو بھی نہ پا سکے گا۔

روزی نے ڈرائیور کو راستہ سمجھا دیا تھا۔ جب ہم کوٹھی پر پہنچے تو ساڑھے سات بج رہے تھے۔ دن بڑے تھے اور راتیں چھوٹی تھیں اس لیے وقت گزرنے کا پتا ہی نہ چل رہا تھا۔ میں نے ڈرائیور کو وہیں رکنے کا کہا اور روزی کو لے کر جہازی سائز گیٹ کی طرف بڑھا۔ یہ ہاروے صاحب کی ہی کوٹھی تھی کیونکہ میں پہلی بار یہاں آیا تھا۔

میں نے بیل بجائی تو چند لمحوں کے بعد ستون پر نصب اسپیکر سے ایک مردانہ آواز سنائی دی۔ "کون؟"

"میں...... مورس۔" میں نے جواب دیا۔

"کون مورس...... کس سے ملنا ہے؟" دوبارہ پوچھا گیا۔

"ڈینیل بابا! دروازہ کھولو۔ میں ہوں روزی۔" میرے جواب دینے سے پہلے ہی روزی نے تکلیف بھرے لہجے میں کہا۔

"اوہ اچھا۔ روزی بے بی آئی ہے۔ اچھا ٹھیک ہے۔ میں آتا ہوں۔" جواب میں ڈینیل کی بوکھلائی ہوئی آواز سنائی دی اور پھر چٹک کی آواز کے ساتھ ہی گیٹ کا لاک کھل گیا۔ چند لمحوں کے بعد گیٹ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر نکل آیا۔ وہ بھی اینگلو انڈین تھا۔ روزی کو دیکھ کر وہ خوش ہو گیا تھا۔ عین اسی لمحے ہاروے صاحب اور ان کی مسز بھی باہر آ گئیں۔ روزی کو دیکھ کر مسز ہاروے والہانہ انداز میں اس کی طرف بڑھیں جبکہ ہاروے صاحب میرے پاس آ گئے۔

"مورس! تم ٹھیک ہو؟" انہوں نے تفکر آمیز لہجے میں دریافت کیا۔

"جی ہاں، میں ٹھیک ہوں۔" میں نے پرسکون لہجے میں کہا۔ "روزی زخمی ہے۔"

"اوہ...... کیا ہوا ہے اسے؟" ہاروے صاحب کے چہرے پر تفکرات کے تاثرات چھا گئے تھے۔

"اسے گولی لگی ہے۔" میں نے صراحت سے کہا۔ "لیکن گولی اس کے بازو کو چھو کر نکل گئی تھی۔ معمولی سا زخم ہے۔"

"ڈینیل بابا! ڈرائیور کو کرایہ دے دو۔" دفعتاً روزی نے ڈینیل سے کہا تو وہ سر ہلاتا ہوا رکشا کی طرف بڑھ گیا جبکہ ہم سب اندر چلے گئے۔

ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی روزی کو صوفے پر بٹھا دیا گیا۔ مسز ہاروے بھی بہت پریشان تھیں۔ ہاروے صاحب نے فوراً ہی ڈاکٹر کو کال کر دیا تھا جو آ رہا تھا۔ مسز ہاروے روزی کے ساتھ تھیں اور اسے تسلی دے رہی تھیں۔

"اسے گولی کیسے لگی ہے...... اور کیا تم بھی گھنشام شرما کی قید میں تھے؟" ہاروے صاحب نے پوچھا تو میں نے اختصار کے ساتھ بتا دیا۔ ہاروے صاحب غصے سے ہونٹ بھینچ کر رہ گئے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے دائیں ہاتھ کا مکا بنا کر بائیں ہاتھ پر بھی مارا تھا۔

پندرہ منٹ ہی گزرے تھے کہ ڈاکٹر اپنا میڈیکل باکس لے کر وہاں پہنچ گیا۔ اس کی عمر لگ بھگ پینتیس سال ہو گی۔ رنگت قدرے سفید تھی۔ وہ کلین شیو تھا۔ وہ ہندو تھا۔ اس کا نام دلیپ تھا اور ہاروے صاحب کا فیملی ڈاکٹر تھا۔ اس نے روزی کے زخمی بازو کی بینڈیج کی اور اسے ایک انجکشن لگا دیا...... پھر وہ ہاروے صاحب کی طرف متوجہ ہوا۔

"ہاروے صاحب! زخم زیادہ گہرا نہیں ہے۔ یہ دو تین دن میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ فی الحال انہیں آرام کی ضرورت ہے۔" ڈاکٹر دلیپ نے کہا تو ہاروے صاحب نے مطمئن ہو کے سر ہلا دیا۔ ڈاکٹر دلیپ کے جانے کے بعد مسز ہاروے میری طرف متوجہ ہو گئیں۔

"تمہارا شکریہ مورس بیٹا۔" وہ تشکر آمیز لہجے میں بولیں۔ "تم نے میری بیٹی کی جان بچائی۔ جب اس عورت کا فون آیا تھا تو میں بے حد ڈر گئی تھی۔"

"شکریہ کی کوئی بات نہیں۔" میں نے کھلے دل سے کہا۔ "میری جگہ اگر کوئی اور ہوتا تو وہ بھی یہی کرتا۔"

"اچھا تم فریش ہو جاؤ۔" ہاروے صاحب نے کہا۔ "باقی باتیں کھانے کے بعد ہوں گی۔"

میں نے سر ہلا دیا۔

ایک ملازم میرے لیے نیا سوٹ لے آیا۔ جسے لے کر میں ایک کمرے کے اٹیچ واش روم میں گھس گیا۔ حالت جنگ میں رہنے کے باعث میری حالت بھی دگرگوں تھی۔ بال گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ شیو بڑھ چکی تھی۔ لباس بھی میلا کچیلا ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ میری رنگت بھی خاصی متاثر ہو چکی تھی۔

شاور لینے سے میری ساری کسل مندی اور جسم کی کثافت دور ہو گئی تھی۔ میں کافی دنوں کے بعد نہایا تھا۔ میں



نہا کر اور نیا سوٹ پہن کر واش روم سے باہر آیا تو میں خود کو بے حد ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا۔

کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ایک ملازم نے آ کر بتایا کہ کھانا لگ چکا ہے اور آپ کا انتظار کیا جا رہا ہے۔ میں ملازم کی معیت میں چلتا ہوا ڈائننگ روم میں پہنچ گیا۔ وہاں ہاروے صاحب، مسز ہاروے کے علاوہ روزی بھی موجود تھی۔ بینڈیج ہونے کے باعث اس کی حالت قدرے بہتر تھی۔ وہ ممنون اور پسندیدگی کی نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ میں نے اسے صرف نظر کیا اور ہاروے صاحب کے ساتھ والی خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ پھر خوش گوار ماحول میں کھانا کھایا گیا۔

میں نے محسوس کیا کہ روزی کھانا کھانے کے ساتھ ساتھ میری طرف بھی دیکھ لیتی تھی۔ شاید وہ میری لڑائی بھڑائی کے انداز سے کچھ زیادہ ہی متاثر ہو گئی تھی۔ ایسا فلموں میں ہوتا دکھایا جاتا ہے لیکن یہاں حقیقت تھی۔

"ممّا آپ یقین کریں مورس دشمنوں کے ساتھ یوں لڑ رہا تھا جیسے فلموں میں ہیرو کو دشمنوں سے لڑتے دکھایا جاتا ہے۔" دفعتاً کھانا کھانے کے دوران روزی مسز ہاروے سے مخاطب ہوئی۔ "وہ مناظر ابھی تک میری آنکھوں کے سامنے چل رہے ہیں۔"

ہاروے صاحب اور مسز ہاروے کے چہروں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ میں بھی ہلکا سا مسکرا دیا۔ تبھی روزی مجھ سے مخاطب ہوئی۔ "تم فلموں میں کام کیوں نہیں کرتے؟ تم کسی ہیرو سے کم دکھائی نہیں دیتے۔ میرا مشورہ ہے کہ تم فلموں میں کام کرو۔ سب ہیروز کو پیچھے چھوڑ جاؤ گے۔"

"مجھے فلموں میں کام کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔" میں نے نرم لہجے میں کہا۔

"حیرت ہے۔"

"اس میں حیرت کی کیا بات ہے بیٹا۔" دفعتاً ہاروے صاحب نے مداخلت کی۔ "ہر انسان کی اپنی چوائس ہوتی ہے۔ کچھ لوگ خوب صورت اور ہینڈسم ہونے کے باوجود فلموں میں کام کرنا پسند نہیں کرتے اور کچھ لوگ بھدے ہونے کے باوجود فلموں میں کام کرنا چاہتے ہیں۔"

"تو آپ نے سچ کہا پاپا۔" روزی قائل ہو گئی تھی۔ "مجھے بھی فلموں میں کام کرنے کا شوق ہے لیکن چانس ہی نہیں ملتا۔"

اس کی بات پر ہم سب ہی مسکرا دیے۔ کھانا کھانے کے بعد میں ہاروے صاحب کے ساتھ ڈرائنگ روم میں چلا گیا جبکہ مسز ہاروے روزی کو اس کے کمرے میں لے گئیں۔ روزی کا میری طرف جھکاؤ مجھے پسند نہیں آیا تھا۔ بہرکیف میں نے اس کے بارے میں سوچنا مناسب نہ سمجھا تھا۔ درحقیقت میں رتن کمار کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین تھا۔ اس دوران مجھے مناسب نہیں لگا تھا کہ میں ہاروے صاحب سے اس کے بارے میں بات چیت کرتا۔

ڈرائنگ روم میں پہنچتے ہی میں نے ہاروے صاحب سے کہا۔ "ہاروے صاحب...... وہ رتن......"

"مجھے معلوم ہے کہ تم رتن کمار کے بارے میں جاننے کے لیے بے چین ہو۔" انہوں نے زیرلب مسکراتے ہوئے میری بات کاٹ دی۔

"جی بالکل۔" میں نے بے ساختہ کہا۔

ہاروے صاحب نے چند لمحے خاموشی اختیار کی پھر گہرا سانس بھر کر بولے۔ "جو خبر تمہیں سنانے جا رہا ہوں وہ تمہارے لیے غیر متوقع ہو گی۔"

مجھے تعجب ہوا۔ "میں سمجھا نہیں...... کیسی خبر؟"

"خبر رتن کمار کے حوالے سے ہے۔" ہاروے صاحب بغور مجھے دیکھتے ہوئے بولے۔

"کیا ہوا ہے اسے؟" میں چونکا۔ "کہیں وہ آپ کی کسٹڈی سے فرار تو نہیں ہو گیا؟"

"نہیں۔" ہاروے صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "اس کی ڈیتھ ہو چکی ہے۔"

"کیا؟" میں صوفے پر بیٹھے بیٹھے اچھل پڑا تھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟"

"یہ سچ ہے مورس۔" ہاروے صاحب نے لمبی سانس لے کر سر ہلایا۔

"لیکن کیسے...... کیسے اس کی ڈیتھ ہو گئی؟" میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے استفسار کیا۔

"اسے ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ میں نے اسے اسپتال پہنچایا تھا لیکن اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس کی ڈیتھ ہو گئی تھی۔ ہارٹ اٹیک اس کے لیے جان لیوا ثابت ہوا تھا۔" ہاروے صاحب نے جواب دیا۔

میرے کانوں میں سائیں سائیں کی آوازیں گونجنے لگیں اور میں صدمے کی حالت میں ہاروے صاحب کو دیکھتا رہ گیا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ رتن کمار کی ڈیتھ

"...چکی ہے۔" میں نے استفسار کیا۔ "اس کی ڈیتھ کس دن ہوئی ہے؟"

"دو دن پہلے۔" ہارورے صاحب نے کہا۔ "رات کے دو بجے۔"

"اوہ۔ یہ کیا ہو گیا۔" میں نے مٹھیاں سختی سے بھینچیں اور اضطراری کیفیت میں صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ میں دو قدم چلا اور ہارورے صاحب سے کہنے لگا۔ "اسے نہیں مرنا چاہیے تھا انکل۔ آپ اسے نہ مرنے دیتے۔ میں اسے اپنے ہاتھوں سے جہنم واصل کرنا چاہتا تھا۔"

ہارورے صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے اور میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ناصحانہ لہجے میں بولے۔ "اس میں نہ تمہارا قصور ہے نہ میرا۔ شاید رتن کمار کی موت تمہارے یا میرے ہاتھوں لکھی ہی نہیں تھی۔ گاڈ کو منظور نہیں تھا۔ ویسے اچھا ہے تم نے اس کے ناپاک خون سے اپنے ہاتھ نہیں رنگے۔"

میرے دل میں خدشہ ابھرا کہ کہیں ہارورے صاحب مجھ سے جھوٹ نہ بول رہے ہوں کیونکہ میں ان کے ارادے سے واقف تھا۔ ہارورے صاحب نے شاید میرے چہرے کے ذریعے میرے دل میں آئی بات پڑھ لی تھی۔ تبھی انہوں نے ایک ملازم کو بلایا اور کل کا اخبار لانے کا کہا۔ ملازم انگریزی اخبار لے آیا اور میں رتن کمار کے متعلق پڑھنے لگا۔ لکھا تھا۔ "معروف بزنس مین اور سماجی رہنما رتن کمار ہارٹ اٹیک کے باعث چل بسے۔ تفصیل کے مطابق نصف شب انہیں ہارٹ اٹیک آیا تھا۔ انہیں فوری طور پر اسپتال پہنچایا گیا لیکن وہ جاں بر نہ ہو سکے۔ انہوں نے سوگواروں میں اپنی ماں کے علاوہ ایک بیٹی چھوڑی ہے۔" خبر کے ساتھ ہی رتن کمار کی تصویر بھی تھی۔

خبر پڑھنے کے بعد میں لمبی لمبی سانسیں لے کر خود کو پرسکون کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

☆☆☆

مجھے ہارورے صاحب کے پاس رہتے ہوئے دو دن ہو گئے تھے۔ میں جس مقصد کے لیے انڈیا آیا تھا وہ قدرت نے خود ہی پورا کر دیا تھا اس لیے اب میرا انڈیا میں رہنا بلا جواز تھا۔ میں جلد سے جلد وطن لوٹ جانا چاہتا تھا۔ مجھے اپنی ماں، بہن، شانزے، حیدر الماس اور ہادیہ شدت سے یاد آ رہے تھے۔ انسان کا جب مقصد پورا ہو جاتا ہے تو پھر اسے اپنا گھر اور اپنے لوگ ہی یاد آتے ہیں۔

میں نے ہارورے صاحب سے ایک فون بھی مانگ لیا تھا تاکہ میں مرینہ سے بات کر کے واپس پاکستان پہنچنے کی خوش خبری دے دوں۔ فون میں سم ایکٹو تھی اور اس نمبر کے ذریعے میں دنیا کے کسی بھی حصے میں بیٹھے اپنے جاننے والے سے بہ آسانی بات کر سکتا تھا۔

ڈنر کرنے کے بعد میں نے مرینہ کو کال کی۔ دوسری طرف گھنٹی بجتی رہی پھر تیسری گھنٹی پر مرینہ نے کال ریسیو کر لی لیکن وہ بولی کچھ نہیں۔ میرے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ بے وقوف نے نمبر بھی صحیح طرح سے نہیں دیکھا تھا کہ وہ نمبر مقامی نہیں بلکہ کسی دوسرے ملک کا ہے۔ جب وہ کچھ نہ بولی تو میں نے دھیمے لہجے میں کہا۔ "ہیلو۔"

"کون؟"

"آئسکریم۔" میں نے مذاقاً کہا۔ مجھے یاد ہے میں بچپن میں بھی اسے ایسے ہی تنگ کرتا تھا۔ جب میں شام کو تھکا ہارا گھر جاتا تھا اور دروازہ بجاتا تو مرینہ دروازے پر آ کر پوچھتی کہ کون، جواباً میں کہتا تھا آئسکریم۔ جیسا کہ میں نے اب کہا تھا۔

شاید مرینہ سمجھ گئی تھی کہ اسے فون کرنے والا اس کا بھائی علی ہے۔ تبھی اس کی خوشی سے معمور آواز مجھ تک پہنچی۔ "بھائی۔"

وہ اتنے زور سے بولی تھی کہ میں نے فون کان سے چار انچ دور کر دیا تھا۔ مجھے اپنے پردے پھٹتے ہوئے محسوس ہوئے تھے۔

"کیا میرے کان پھاڑنا چاہتی ہو؟" میں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

"بھائی! آپ کیسے ہیں..... اور کہاں ہیں؟" اس نے میرے غصے کی پروا نہیں کی تھی۔

"میں انڈیا میں ہوں۔" میں نے جواباً کہا۔

"واپس کب آئیں گے؟" مرینہ نے استفسار کیا۔

"ہم آپ کے بغیر بہت اداس ہیں۔ امی بار بار آپ کا پوچھتی ہیں۔ شانزے بھی کئی بار آپ کا پوچھ چکی ہیں۔"

"بس دس بارہ دنوں میں واپس آ رہا ہوں۔" میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کہا۔

"سن کر بہت خوشی ہوئی ہے۔"

"کیا امی سے بات ہو سکتی ہے؟"

"امی سو رہی ہیں۔" مرینہ نے بتایا۔ "کہیں تو انہیں جگا دوں؟"

"نہیں۔ انہیں بے آرام نہ کرو۔" میں نے مرینہ کو روک دیا۔ "میں گھر آ کر ان کو سرپرائز دوں گا۔ ان کی طبیعت کیسی ہے؟"

"اللہ کے فضل سے اب بہت بہتر ہیں اور نارمل زندگی گزار رہی ہیں۔" مرینہ نے کہا تو مجھے اپنے وجود میں سکون کی ایک لہر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

"حیدر صاحب ہیں؟" میں نے حیدر الماس کے بارے میں پوچھ لیا۔ سوچا کہ وہ ہوں گے تو ان سے بات چیت کر لوں گا۔

"نہیں بھائی۔ وہ بھی گھر پر نہیں ہیں۔ وہ کسی کام سے باہر گئے ہوئے ہیں۔" مرینہ نے جواباً کہا۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" میں نے گہری سانس بھری۔ "شانزے کا نمبر مجھے اسی نمبر پر واٹس ایپ کر دو۔"

"جی ٹھیک ہے۔"

مرینہ سے مزید چند باتیں کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ پانچ منٹ کے بعد میں نے واٹس ایپ اوپن کیا تو مرینہ کا میسج آ گیا تھا۔ اس نے شانزے کا نمبر سینڈ کر دیا تھا۔ میں نے شانزے کا نمبر ملایا تو دوسری طرف بیل جاتی رہی۔ چند لمحوں بعد اس نے فون اٹھا لیا۔ "ہیلو۔" وہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"کیا مس شانزے سے بات ہو سکتی ہے؟" میں نے حتی الامکان آواز بدل کر بات کی۔

"جی بول رہی ہوں۔" شانزے کی حیرت میں ڈوبی آواز سنائی دی۔ "آپ کون بول رہے ہیں؟"

"حیرت ہے آپ مجھے بھول گئی ہیں۔" میں نے جان بوجھ کر حیرت کا اظہار کیا۔ "سوچیں..... میں کون ہو سکتا ہوں۔"

دوسری طرف چند لمحے خاموشی چھائی رہی پھر شانزے کی خوشی سے بھری آواز سنائی دی۔ "ارے تم..... علی۔"

"شکر ہے تم نے پہچان تو لیا۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"تمہاری آواز تو میں لاکھوں میں پہچان سکتی ہوں لیکن تم آواز بدل کر بول رہے تھے اس لیے میں پہچان نہ پائی۔" شانزے نے جواباً کہا۔

جواباً میں بھی ہنس پڑا۔

"کیسی ہو شانزے۔"

"میں بالکل ٹھیک ہوں۔" شانزے نے کہا۔ "میرا یہ والا نمبر کس سے لیا۔ شاید ریشہ سے لیا ہوگا کیونکہ میں نے اس سے کہا تھا کہ جب بھی علی سے رابطہ ہو تو اسے میرا نمبر دے دینا۔"

"تمہارا اندازہ درست ہے۔"

"واپس کب آرہے ہو؟" شانزے نے استفسار کیا۔

"بہت جلد۔" میں نے کہا اور اختصار کے ساتھ ساری بات بتادی۔

"مجھے روزینہ کی موت کا بے حد دکھ ہے۔" شانزے افسردہ لہجے میں بولی۔ "لیکن اس کا قاتل بھی اذیت ناک موت کا شکار ہوا ہے۔"

"ہاں۔" میں نے کہا۔ "میں اسے اپنے ہاتھوں سے مارنا چاہتا تھا...... خیر تم سناؤ۔ تمہارے بابا ابھی تک لندن میں ہی ہیں یا......"

"بابا ابھی تک لندن میں ہیں۔" شانزے افسردہ لہجے میں بولی۔ "اور مستقبل قریب میں بھی ان کے آنے کے چانسز نہیں ہیں۔"

"تو کیا تمہارے بابا کے بغیر ہماری شادی ہو جائے گی۔" میں نے شوخ لہجے میں پوچھا تو دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔ میں شانزے کے جواب کا منتظر تھا۔

"پتا نہیں۔" لمحاتی توقف کے بعد شانزے نے جواب دیا تو میں قہقہہ لگانے پر مجبور ہو گیا۔

"جب میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "خیر یہ تو بعد کی باتیں ہیں۔ میں......"

اس سے پہلے کہ میری بات مکمل ہوتی ونڈو کھڑکی کا شیشہ چھناکے کی آواز کے ساتھ ہی چکنا چور ہو گیا اور ایک گولی سنسناتی ہوئی آواز کے ساتھ میرے سر سے تقریباً چار انچ سے گزرتی ہوئی بیڈ کراؤن میں پیوست ہو گئی تھی۔ میں ایک بار پھر بال بال بچ گیا تھا۔ میں نے کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی کا پردہ ایک سائیڈ پر سرکا ہوا تھا۔

کمرے میں داخل ہوتے وقت میں نے کھڑکی کی طرف توجہ نہیں دی تھی اور مجھے ٹارگٹ کرنے والے نے شاید اسی بات کا فائدہ اٹھایا تھا۔ بیڈ کھڑکی کے بالکل ہی سامنے تھا اور کھڑکی کی دوسری طرف سے بیڈ پر بیٹھے یا سوئے وجود کو بہ آسانی دیکھا جا سکتا تھا۔ اگلے ہی پل صورت حال کو سمجھتے ہوئے میں نے قلابازی کھاتے ہوئے قالین پر چھلانگ لگا دی تھی اور عین اسی لمحے ٹھک کی آواز کے ساتھ ہی دوسری گولی بیڈ کراؤن میں لگی تھی۔ ایک لمحہ، صرف ایک لمحہ کی تاخیر سے میں بچ گیا تھا۔

قالین پر گرتے ہی میں سانپ کی طرح تیزی سے رینگتا ہوا کھڑکی والی دیوار کی طرف بڑھا۔ اگلے ہی پل باہر فضا میں گولیاں چلنے کی آوازیں گونجنے لگیں۔ یوں لگتا تھا جیسے دو گروپوں میں اچانک جنگ چھڑ گئی ہو۔ قدرت کو میری زندگی مقصود تھی اس لیے میں بچ گیا تھا۔ دیوار کے پاس پہنچتے ہی میں دیوار کے ساتھ چپک کر بیٹھ گیا تھا۔ فون آن تھا اور دوسری طرف سے شانزے متوحش ہو کر پوچھ رہی تھی۔

"علی...... تم ٹھیک ہو...... یہ گولیاں چلنے کی آوازیں کیسی ہیں...... علی...... کیا تم مجھے سن رہے ہو...... علی...... پلیز جواب دو۔"

"میں تمہیں بعد میں کال کرتا ہوں۔" میں نے سیل فون کان سے لگاتے ہوئے کہا۔

"علی...... میری بات سنو۔" شانزے نے کہنا چاہا لیکن میں نے کال منقطع کر دی۔

دو طرفہ فائرنگ مسلسل جاری تھی، یہ سلسلہ تقریباً آٹھ دس منٹ تک جاری رہا تھا پھر یکدم خاموشی چھا گئی۔ جیسے دونوں گروپوں کے پاس گولیاں ختم ہو گئی ہوں۔ میں دم سادھے بیٹھا تھا اور میری نظریں کھڑکی پر جمی ہوئی تھیں۔ قالین پر ٹوٹا شیشہ بکھرا پڑا تھا۔ عین اسی لمحے دروازہ کھلا اور ہاروے صاحب ریوالور تھامے کمرے میں آگئے۔ ان کے چہرے پر تشویش کے تاثرات ابھرے ہوئے تھے۔

مجھے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر اطمینان کے تاثرات چھا گئے۔ میں بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ مطمئن لہجے میں بولے۔ "تھینک گاڈ...... تم ٹھیک ہو۔"

"قسمت اچھی تھی کہ گولی قریب سے گزر گئی۔" میں نے زیر لب مسکراتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک کہا۔"

"کیا رنجیت شرما کے آدمی تھے؟"

"ہاں...... ایک آدمی تھا۔ وہ میرے ایک آدمی کا بھیس بدل کر کوٹھی میں گھس آیا تھا۔" ہاروے صاحب نے کہا۔ "اس کا اصل ٹارگٹ تم تھے۔"

"کیا وہ بھاگ گیا؟"

"نہیں۔ میں نے اسے مار ڈالا ہے۔"



میں نے سکون کی سانس لی۔ "لیکن رنجیت شرما کے آدمی کو کیسے پتا چلا ہوگا کہ میں یہاں ہوں۔" میں نے پرسوچ لہجے میں کہا۔

"ممکن ہے اس نے میرے جس آدمی کو اغوا کیا ہے اسی سے معلومات لی ہوں۔" ہاروے صاحب نے جواباً کہا تو میں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن تمہاری زندگی کو ابھی بھی خطرہ لاحق ہے۔" ہاروے صاحب نے سلسلۂ کلام جوڑا۔ "اس لیے تمہیں فوری طور پر کسی محفوظ مقام پر منتقل ہونا ہوگا۔"

"کہاں؟" میں نے بے ساختہ پوچھا۔

"آؤ میرے ساتھ۔" ہاروے صاحب نے کہا اور دروازے کی طرف بڑھ گئے۔

میں بھی سیل فون پتلون کی جیب میں ٹھونستا ہوا ان کے پیچھے بڑھا۔ پوری کوٹھی میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ مجھے گزشتہ روز ہی ہاروے صاحب نے بتایا تھا کہ ان کی مسز اور اکلوتی بیٹی روزی کو انہوں نے اپنے دوسرے گھر پہنچا دیا تھا۔ اب اس کوٹھی میں صرف میں اور ہاروے صاحب ہی رہ رہے تھے۔

میں ان کی معیت میں کوٹھی کی عقبی طرف پہنچا جہاں ایک چھوٹا سا لوہے کا مضبوط دروازہ تھا۔ دروازے پر تالا لگا ہوا تھا۔ انہوں نے چابی سے تالا کھولا اور ہم دونوں باری باری دوسری طرف پہنچ گئے۔ دوسری طرف چند بیس فٹ چوڑی گلی تھی جو اندھیرے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس گلی میں مکانات تھے لیکن شاید کسی نے ابھی رہائش نہیں رکھی تھی۔

ہاروے صاحب نے شاید گلی میں آنے سے پہلے ہی کسی کو فون کر کے گاڑی سمیت بلا لیا تھا کیونکہ گلی میں ایک کار ڈرائیور سمیت موجود تھی۔ ہاروے صاحب نے مجھ سے کہا۔ "موریس! کار میں بیٹھو، ڈرائیور تمہیں ایک جگہ لے جائے گا۔ میں تم سے خود رابطہ کروں گا۔ تم نے مجھے فون نہیں کرنا۔ سمجھ گئے؟"

"جی سمجھ گیا ہوں۔"

"گڈ...... اب جاؤ۔"

میں نے ان کی ہدایت پر عمل کیا۔ میں کار میں بیٹھا تو ڈرائیور نے کار آگے بڑھا دی۔ مین سڑک پر پہنچتے ہی ڈرائیور نے نہ صرف ہیڈ لائٹس آن کر دی تھیں بلکہ کار کی اسپیڈ میں بھی اضافہ کر دیا تھا۔ ڈرائیور بھی شاید اینگلو انڈین تھا۔ سارا راستہ اس نے مجھ سے کوئی بات نہ کی تھی۔

تقریباً پچیس منٹ کے سفر کے بعد اس نے کار ایک مضافاتی آبادی میں موڑ دی اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے کار کئی گلیوں سے گزارنے کے بعد ایک کوٹھی کے گیٹ پر جا کر روک دی۔ جیسے ہی کار گیٹ پر پہنچی تو فوراً ہی ذیلی دروازہ کھل گیا اور ایک ادھیڑ عمر آدمی باہر آ گیا۔

"تم جاؤ۔" ڈرائیور نے پہلی بار منہ کھولتے ہوئے لب کشائی کی۔ میں سر ہلاتا ہوا کار سے اتر کر ادھیڑ عمر کی طرف بڑھا۔ اس دوران ڈرائیور کار موڑ کر چلا گیا تھا۔

"تمہارا نام؟" ادھیڑ عمر نے میرا نام پوچھا۔

"موریس۔"

"تم کیسے ہو؟" ادھیڑ عمر آدمی نے خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے میری خیریت دریافت کی اور ساتھ ہی اس نے مصافحے کے لیے میری طرف ہاتھ بھی بڑھا دیا۔ اسے میرا نام معلوم تھا اس کا مطلب تھا کہ ہاروے صاحب نے آدمی کو میری آمد کا بتا دیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں انکل۔ آپ کیسے ہیں؟" میں نے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں بیٹا، آؤ۔"

وہ مجھے اندر لے گئے۔ وہ پانچ کمروں، ایک ڈرائنگ روم اور ایک شاندار انداز میں سجے کچن پر مشتمل گھر تھا۔ ہر کمرے کے ساتھ واش روم اٹیچ تھا۔ ڈرائنگ روم سامان آرائش سے سجا ہوا تھا۔ اس ادھیڑ عمر آدمی کا نام پیٹر تھا اور وہ بھی اینگلو انڈین تھا۔

مجھے حیرت تھی کہ اینگلو انڈینز کی خاصی تعداد ہاروے کے ساتھ کام کرتی تھی۔ مقامی لوگ بھی ان کے ساتھ کام کرتے تھے جن میں ہندو اور مسلم شامل تھے۔ یہ بات میں نے خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ہاروے صاحب اپنی کمیونٹی کے افراد کو زیادہ اہمیت دیتے تھے۔

رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ انکل پیٹر نے مجھ سے کھانے پینے کے بارے میں پوچھا تھا لیکن میں نے انکار کر دیا تھا۔ میں آرام کرنا چاہتا تھا اس لیے انکل پیٹر مجھے ایک شاندار انداز میں سجے کمرے میں چھوڑ گیا تھا۔

بیڈ پر لیٹتے ہی میں اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملے کے بارے میں سوچنے لگا۔ میں اللہ کا بے حد شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے یقینی موت سے بچا لیا تھا۔ مجھے ٹارگٹ

کرنے والے نے پہلے دیکھا ہوگا کہ میں کمرے میں موجود ہوں یا نہیں۔ موجود ہوں تو کس پوزیشن میں ہوں۔ اس نے مجھے فون پر باتیں کرتے ہوئے دیکھ لیا ہوگا اس لیے مجھے دوسری طرف متوجہ پا کر اپنا کام کر دیا تھا۔
اللہ کو میری زندگی مقصود تھی اس لیے اس نے مجھے بچا لیا تھا۔ مجھے شانزے کی فکر تھی۔ وہ ابھی تک متفکر ہوگی اور یقیناً انتظار میں ہوگی کہ میں اسے کب فون کر کے صورت حال سے آگاہ کرتا ہوں۔ کچھ سوچ کر میں نے شانزے کا نمبر ملا دیا۔ پہلی ہی بیل پر اس نے کال ریسیو کر لی تھی۔ پھر چھوٹتے ہی جلدی سے بولی۔ "ہیلو علی..... تم کیسے ہو..... تمہارے ساتھ کچھ ہوا تو نہیں؟"
میرے لبوں پر مسکراہٹ عود آئی۔ میں نے تحمل سے جواب دیا۔ "الحمدللہ! میں ٹھیک ہوں۔ گولی پر میرا نام نہیں لکھا تھا اس لیے بچت ہوگئی۔"
فون سے مجھے اس کے لمبی سانس لینے کی آواز سنائی دی۔ لمحاتی توقف کے بعد بولی۔ "اللہ کا شکر ہے تم ٹھیک ہو..... ورنہ میں تو بہت ڈر گئی تھی۔"
"میری کال کا انتظار کر رہی تھیں؟"
"ہاں..." اس نے بے ساختہ کہا۔ "مجھے تمہاری بہت فکر ہو رہی تھی۔"
میری مسکراہٹ گہری ہوگئی۔ چند مزید باتیں کرنے کے بعد میں رابطہ منقطع کر کے سو گیا۔
مجھے وہاں رہتے ہوئے تین دن گزر گئے تھے لیکن ہاروے صاحب نے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا۔ مجھے ان کی بھی فکر تھی۔ جانے وہ کس حال میں تھے اور ان پر کیا بیتی تھی۔ کئی بار میں نے رابطہ کرنے کا سوچا لیکن پھر رک جاتا کیونکہ انہوں نے کہا تھا کہ میں خود تمہیں فون کروں گا۔ تم مجھے فون نہ کرنا اس لیے میں رک جاتا تھا۔
ان تین دنوں میں مجھے خاصی بوریت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ٹی وی پر مختلف پروگرام بھی دیکھ دیکھ کر میں اوب جاتا تھا کیونکہ ڈراموں، فلموں میں وہ اپنا کلچر دکھاتے تھے۔ سیاسی پروگراموں میں پاکستان کے خلاف زہر اگلا جاتا تھا۔ بالآخر میں نے ٹی وی دیکھنا ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے ہاروے صاحب کی کال کا انتظار رہتا تھا کہ وہ مجھے کب پاکستان واپس بھجوا رہے ہیں۔
یہ چوتھے دن کی بات تھی جب میں ناشتے سے فارغ ہو کر انگریزی اخبار کا مطالعہ کر رہا تھا کہ ہاروے صاحب کی کال آگئی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد کہنے لگے "سوری! میں ایک آدمی کو بھیج رہا ہوں۔ اس کا نام اشوک ہے۔ وہ تمہارا حلیہ بدل دے گا اور تصویر بنالے گا۔ اسی حلیے کے مطابق تمہارا پاسپورٹ بنواؤں گا۔"
"ٹھیک ہے ہاروے صاحب۔" میں نے سعادت مندی سے کہا۔ "ویسے کتنے دن لگ جائیں گے؟"
"کچھ دن تو لگ ہی جائیں گے۔" ہاروے صاحب نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ "زیادہ سے زیادہ پانچ چھ دن۔"
"آپ اتنے دن سے کہاں غائب تھے؟" میں مستفسر ہوا۔ "مجھے تو یہاں شدید بوریت ہو رہی تھی۔"
ہاروے صاحب نے قہقہہ لگایا اور بولے۔ "یار تمہارے ہی کام کے سلسلے میں دہلی جانا پڑا تھا۔ رات کو ہی واپسی ہوئی ہے۔"
"اوہ اچھا!" میں نے چونکتے ہوئے کہا۔
"اب تم فکر مت کرو۔" ہاروے صاحب نے کہا۔ "گاڈ نے چاہا تو ایک ہفتے کے بعد تم اپنے گھر ہوگے۔"
میں نے سکون کی سانس لی۔
"اچھا ٹھیک ہے، بعد میں بات کرتا ہوں۔" ہاروے صاحب نے مزید کہا اور پھر رابطہ منقطع کر دیا۔ مجھے ایک ہفتہ مزید انتظار کرنا تھا۔ سوچا کہ جہاں اتنا عرصہ انتظار کیا ہے، ایک ہفتہ اور سہی..... ایک ہفتہ انتظار بھی صدیوں پر محیط محسوس ہوا تھا جیسا کہ میں نے گزارا تھا۔
میں نے سیل فون میز پر رکھا اور دوبارہ اخبار کے مطالعے میں مصروف ہو گیا۔ انکل پیٹر لان میں پودوں کو پانی دینے میں مصروف تھا۔ شانزے اور مرینہ سے روزانہ ہی بات چیت ہو جاتی تھی۔ ایک بار حیدر الیاس صاحب سے بھی بات ہوئی تھی۔ وہ سب میری واپسی کے شدت سے منتظر تھے۔
کچھ ہی دیر گزری تھی کہ اشوک نامی آدمی آگیا۔ وہ پختہ العمر تھا۔ اس کا سر آدھا گنجا تھا۔ آنکھوں پر نظر کی عینک تھی۔ رنگ گندمی تھا اور قد درمیانہ۔ اس کے پاس ایک باکس تھا۔ رسمی تعارف کے بعد ہم ڈرائنگ روم میں آگئے۔ اشوک نے مجھے ایک کرسی پر بٹھایا اور باکس میں سے کریمیں، لوشنز اور کیمیکل نکال کر میز پر رکھے اور پھر میرے چہرے پر اپنی مہارت دکھانے لگا۔ میں آنکھیں بند کر کے پڑا رہا۔ اشوک تقریباً ایک گھنٹا میرے چہرے اور بالوں پر کام کرتا رہا تھا۔ جب وہ فارغ ہوا تو میں نے یوں طویل سانس لیا جیسے ایک قیدی جیل سے رہائی کے بعد باہر آ کر سانس لیتا ہے۔
"جان چھوٹی سو لاکھوں پائے۔" میں نے دل ہی دل میں سوچا۔
"مسٹر موری... آئینے میں اپنا بدلا ہوا حلیہ دیکھ لیں۔" اشوک نے کہا۔ "اگر کوئی کمی رہ گئی ہو تو مجھے بتا دیں، میں وہ بھی پوری کر دوں گا۔"
"بہتر..." میں نے کہا اور کرسی سے اٹھ کر آئینے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ جیسے ہی میں نے خود کو دیکھا تو حیرت کی شدت سے میری آنکھیں پھیلتی چلی گئیں۔ اشوک نے میرا حلیہ یکسر بدل دیا تھا۔ اس نے مجھے انگریز بنا دیا تھا۔
"یہ..... یہ مجھے کیا بنا دیا؟" میں نے اشوک کی طرف دیکھتے ہوئے دریافت کیا۔
"ہاروے صاحب کا حکم تھا۔" اشوک نے نرم لہجے میں کہا۔ "انہوں نے ہی کہا تھا کہ میں آپ کو انگریز بنا دوں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن کوئی خوب صورت سا انگریز تو بنا دیتے۔" میں نے منہ بناتے ہوئے کہا تو اشوک نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔
"مجبوری تھی مسٹر موری۔"
"ہم..." میں نے ہنکاری بھری پھر اس کی تعریف کرتے ہوئے بولا۔ "ویسے تمہارے ہاتھوں میں بڑی مہارت ہے اشوک۔"
"شکریہ۔" وہ خوش ہوتے ہوئے بولا۔ "میں بالی ووڈ کی کئی ہیروئنوں اور ہیروز کے میک اپ میں ہی کرتا ہوں۔ مستقل کانٹریکٹ ہیں۔"
"بہت خوب۔" میں نے کہا۔
"آپ یہاں بیٹھ جائیں، میں آپ کی تصویر بنا لوں۔" اشوک نے کرسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
میں خاموشی سے کرسی پر بیٹھ گیا تو اشوک نے اپنے موبائل کے کیمرے سے میری تصویر بنالی اور اپنا سامان سمیٹ کر وہاں سے چلا گیا۔ جاتے جاتے وہ مجھے ایک محلول بھی دے گیا تھا کہ جب میں اپنا حلیہ ختم کرنا چاہوں تو اس محلول کے ذریعے چہرہ صاف کروں۔ انکل پیٹر نے بھی مجھے انگریز کے روپ میں دیکھا تھا۔ وہ زیر لب مسکرا کر رہ گیا تھا۔
میں نے ایک بار پھر آئینے میں اپنی شکل دیکھی۔ اشوک کے ہاتھوں میں مہارت تھی۔ اس نے انتہائی مشاقی سے میرا حلیہ تبدیل کر دیا تھا کہ میں بھی خود کو پہچان نہیں پایا تھا۔ یہاں تک کہ اگر رادھا یا اس کا کوئی گماشتہ مجھے دیکھ لیتا تو بھی... پہچان نہ پاتا۔ ہاروے صاحب کے بقول ایسا کرنا ضروری ہو گیا تھا کیونکہ رادھا اور اس کے ہرکارے میری تلاش میں تھے۔ رادھا نے رنجیت کے دماغ میں یہ بات ڈال دی تھی کہ اس کے باپ کا ہتیارا میں ہوں۔ وہ خود کو نردوش ثابت کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جا سکتی تھی، یہ اس کی فطرت میں شامل تھا۔
میں سوچ رہا تھا کہ جب میں اس حلیے میں گھر جاؤں گا تو مرینہ تو مجھے پہچان ہی نہ سکے گی۔ میں نے یہ منظر چشم تصور میں دیکھا تو میرے لبوں پر مسکراہٹ رینگ گئی۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ ہاروے صاحب کی کال آگئی۔ "کیسا لگا نیا حلیہ؟"
"بالکل پرفیکٹ۔" میں نے جواباً کہا۔ "میں تو خود کو بھی نہیں پہچان سکا تھا۔"
"یہی تو اشوک کی مہارت کا کمال ہے۔" ہاروے صاحب نے کہا۔ "میں نے تمہاری تصویر دیکھی ہے۔ تم واقعی نہیں پہچانے جا رہے۔ خیر..... میں نے پاسپورٹ کے لیے تمہاری تصویر دے دی ہے۔ اب تم کچھ دن اطمینان سے رہو۔ کوشش کرنا کہ باہر نہ نکلنا۔ لیکن اگر جاؤ بھی تو زیادہ دور نہیں جانا اور نہ ہی کسی سے فضول گفتگو کرنی ہے۔"
"میں احتیاط کروں گا۔" میں نے تسلی آمیز لہجے میں کہا تو ہاروے صاحب مطمئن ہو گئے۔
میں بے حد خوش تھا اور دل میں دعا کی کہ اے اللہ، میرا پاسپورٹ جلدی بن جائے۔
انکل پیٹر میرا بہت خیال رکھتا تھا۔ وہ مجھے وقت پر ناشتا، دوپہر اور رات کا کھانا دیتا تھا۔ مزاج کا بھی وہ بہت اچھا انسان تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ چند مہینے پہلے تک یہ گھر رینٹ پر چڑھا ہوا تھا اور دو ہفتے پہلے ہی خالی ہوا ہے۔ رینٹ پر گھر لینے والی مسلم فیملی تھی اور اب وہ کینیڈا شفٹ ہو گئی ہے۔
میں نے دو دن تو جیسے تیسے اس گھر میں گزار دیے تھے لیکن تیسرے دن مجھے بوریت ہوئی تو میں انکل پیٹر کو بتا کر گھر سے باہر نکل پڑا۔ عصر کا وقت تھا۔ کالونی میں کافی چہل پہل تھی۔ وہ بہت بڑی کالونی تھی جہاں زیادہ تر امیر لوگ سکونت پذیر تھے۔ وہاں رہنے والوں میں مسلم اور ہندو دونوں کمیونٹی کی فیملیز شامل تھیں۔ بیچ گلیوں میں سر

گشت کرتا پھر رہا تھا۔ گزرنے والے راہ گیر اور بچے مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھتے تھے۔ شاید میرے حلیے کی وجہ سے وہ میری طرف متوجہ ہونے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ میں نے کسی پر توجہ نہ دی اور گھومتا پھرتا ایک بڑے سے میدان میں پہنچ گیا۔

میدان کافی کھلا تھا اور بچے کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھے۔ بچوں کے شور و غل سے فضا گونج رہی تھی۔ میں ایک بنچ پر بیٹھ کر کچھ دیر بچوں کو کرکٹ کھیلتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب دل اوب گیا تو میں سڑک کی طرف نکل گیا۔

سڑک پر بھی خاصی رونق تھی۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی اور میرے پاس پیسے بھی تھے۔ یہ پیسے بارو بے صاحب نے اپنے آدمی کے ذریعے میرے لیے بھجوائے تھے جو مجھے انکل پیٹر نے دیئے تھے تاکہ اگر میں باہر جاؤں اور کوئی چیز کھانا چاہوں تو مجھے پریشانی نہ ہو۔ مجھے ایک شاپ دکھائی دی تو میرا دل برگر کھانے کو چاہا چنانچہ میں شاپ میں گھس گیا۔ وہاں برگر اور چپس دستیاب تھیں۔

شاپ کافی بڑی تھی اور وہاں کافی لوگ موجود تھے۔ میں بھی ایک خالی میز پر بیٹھ گیا۔ لڑکا آیا تو میں نے اسے برگر کا آرڈر دیا اور شاپ میں چلتے ہوئے ٹی وی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ ٹی وی پر امیتابھ بچن کی کوئی پرانی انڈین فلم چل رہی تھی اور لوگ بڑے انہماک سے فلم دیکھنے میں مگن تھے۔

معاً میری نظر شاپ میں داخل ہوتے مرد اور ایک عورت پر پڑی تو میرے وجود میں سنسناہٹ کی ایک لہر دوڑ گئی۔ بلاشبہ وہ عورت رادھا اور مرد رنجیت شرما تھا۔ رنجیت شرما کے بازو پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ رادھا نے خود کو خوب سنوارا ہوا تھا۔ وہ رنجیت شرما سے تقریباً دس سال بڑی تھی۔ دونوں یوں لگ رہے تھے جیسے بہن بھائی ہوں۔ میرے پاس سے گزرتے ہوئے رادھا نے مجھ پر ایک سرسری سی نظر ڈالی تھی اور میری ٹیبل کے پاس والی ٹیبل پر وہ دونوں بیٹھ گئے تھے۔ میرے دل کی دھڑکن غیر معمولی طور پر بڑھ گئی تھی۔ دل میں خدشہ ابھرا کہ کہیں رادھا مجھے پہچان نہ لے، بعد ازاں میں نے دل کو تسلی دی کہ رادھا مجھے نہیں پہچان سکے گی کیونکہ میرا حلیہ یکسر بدلا ہوا تھا۔

میں نے کن انکھیوں سے رادھا کی طرف دیکھا تو وہ میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ میں نے دل ہی دل میں رادھا کو کوسا۔ وہ کسی سائے کی طرح آج میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد میرے لیے برگر آیا تو میں برگر کھانے میں مشغول ہو گیا لیکن میرا دھیان رادھا کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔

"کیا بات ہے رادھا ڈیئر۔" دفعتاً میری سماعت میں رنجیت شرما کی آواز پڑی۔ "کیا کوئی مسئلہ ہے؟"

"نہیں تو۔"

"پھر یکدم خاموش کیوں ہو گئی ہو؟"

"کچھ خاص نہیں۔" رادھا نے ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ..... یہ کون سی شاپ ہے..... کیا تم پہلے بھی یہاں آتے رہے ہو؟"

"یہ ممبئی کی مشہور برگر شاپ ہے۔ یہاں کا برگر بہت مشہور ہے۔" رنجیت شرما کہہ رہا تھا۔ "ایک بار کھاؤ گی تو بار بار آنے کی فرمائش کرو گی۔"

"اچھا تو یہ بات ہے۔" رادھا نے اترانے کے ناز سے کہا۔ "اور اگر مجھے برگر پسند نہ آیا تو.....؟"

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" رنجیت شرما کی چیلنج بھری آواز سنائی دی۔ "لگاؤ شرط۔"

"رہنے دو۔" رادھا نے اسے ٹوک دیا۔ "پہلے بھی تم مجھ سے کئی شرطیں ہار چکے ہو۔ آج بھی ہار جاؤ گے۔"

"نہیں..... تم شرط لگاؤ۔ آج میں جیت ہی جاؤں گا۔" رنجیت شرما بھی بضد تھا۔

"چھوڑو ان باتوں کو۔" رادھا نے ایک بار پھر ٹالنے والے انداز میں کہا۔ "یہ بتاؤ..... تمہارے آدمی اس کو تلاش کر پائے یا نہیں؟"

اس کا اشارہ یقیناً میری طرف ہی تھا۔ یہ بات سنتے ہی میرے کان کھڑے ہو گئے تھے۔ بظاہر میں نارمل انداز میں ان دونوں سے لاتعلق بنا برگر کھا رہا تھا لیکن میری ساری توجہ ان دونوں کی طرف ہی تھی۔

"اس کی تلاش جاری ہے۔" رنجیت شرما نے سرگوشی نما آواز میں کہا۔ ساتھ ہی اس نے مجھے ایک غلیظ گالی دی جس کا رادھا نے برا نہیں منایا تھا۔ "اپنے چچا کے کھون (خون) کا میں اس سے بدلا ضرور لوں گا۔"

عین اسی وقت آرڈر لینے کے لیے مجھے برگر سرو کرنے والا لڑکا ان کے پاس چلا گیا تھا۔ انہوں نے برگر کے ساتھ ساتھ چپس بھی منگوائی تھیں۔ لڑکا آرڈر لے کر چلا گیا تو رنجیت شرما نے کہا۔ "تم پریشان مت ہو۔ ایک بار وہ میرے ہاتھ لگ جائے میں نے اس کے ٹکڑے ٹکڑے نہ کر دیئے تو میرا نام بھی رنجیت نہیں۔"

"ہمم....." رادھا نے ہنکاری بھری۔ میں نے ایک بار پھر کن انکھیوں سے دیکھا تو اب کی بار رادھا میری طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں نے سکون کی سانس اپنے اندر اتاری تھی۔ اس دوران میں برگر ختم کر چکا تھا اور انکل پیٹر کے لیے برگر کا آرڈر کر چکا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد ان کا پیک شدہ برگر لے آیا تو میں نے وہاں سے نکلنے میں ہی عافیت جانی۔ میں نے بل ادا کیا اور اپنی چال ڈھال میں تبدیلی کرتا ہوا شاپ سے نکل گیا۔ وہاں سے جاتے وقت بھی میں نے رادھا کی طرف دیکھا تھا۔ اس بار بھی وہ میری طرف متوجہ نہیں تھی۔ میں نے اس کا یہی مطلب اخذ کیا تھا کہ اسے مجھ پر کسی قسم کا شک نہیں ہوا تھا۔

محض اتفاق ہی تھا کہ رادھا اور رنجیت دونوں اس برگر شاپ پر برگر کھانے آئے تھے۔ رنجیت کی باتوں سے لگا تھا کہ وہ وہاں پہلے بھی کئی بار آ چکا تھا اور رادھا پہلی بار وہاں آئی تھی۔ کالونی میں کافی دور چلنے کے بعد میں نے ارادی طور پر مڑ کر دیکھا تھا۔ مجھے ایسا کوئی بھی شخص مشکوک نہ لگا تھا جس پر میں تعاقب کرنے کا شبہ کر سکتا۔ بہرکیف میں انتہائی احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے کوٹھی پہنچ گیا تھا۔ انکل پیٹر نے ہی گیٹ کھولا تھا۔

"کہاں گئے تھے بیٹا؟" ذیلی دروازہ بند کرنے کے بعد انکل پیٹر نے پوچھا۔

"کہیں نہیں انکل۔"

"کیوں؟" انکل پیٹر چونکا۔

"میں باہر سے برگر کھا کر آ رہا ہوں۔" میں نے جواب دیا۔ "اور یہ آپ کے لیے بھی لے آیا ہوں۔" کہنے کے ساتھ ہی میں نے شاپر ان کی طرف بڑھا دیا۔

"شکریہ بیٹا۔" انکل پیٹر نے خوش ہو کر شاپر لیتے ہوئے کہا۔ "مجھے برگر بہت پسند ہے۔"

پھر میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس دن کے بعد میں دوبارہ باہر نہیں گیا تھا کیونکہ رنجیت شرما کے گماشتے میری تلاش میں تھے۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میں پھر کسی مصیبت میں پڑوں۔ رادھا نے جس انداز میں مجھے دیکھا تھا میرے وجود میں پھریری سی دوڑ گئی تھی کہ کہیں اس نے مجھے پہچان نہ لیا ہو لیکن جب اس کی توجہ مجھ سے ہٹ گئی تھی تو میں سمجھ گیا تھا کہ وہ مجھے نہیں پہچان سکی ہے۔

☆☆☆

وہ جمعرات کی رات تھی۔ رات کے ساڑھے دس بج رہے تھے۔ میں اپنے بیڈ روم میں نیم دراز انگریزی اخبار کے مطالعے میں مصروف تھا، عین اسی وقت ہاروے صاحب کی کال آ گئی۔ حال احوال دریافت کرنے کے بعد کہنے لگے۔

"موریس! تمہارا پاسپورٹ بن چکا ہے اور میں نے ٹکٹ بھی لے لی ہے۔ کل تیار رہنا۔ کل دن تین بجے تمہاری لاہور کے لیے فلائٹ ہے۔"

یہ اطلاع گویا میرے لیے خوش خبری تھی اور میرے پورے وجود میں خوشی کی ایک لہر سرایت کر گئی تھی۔ میں نے سیدھے ہو کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "کیا واقعی؟" شاید مجھے یقین نہیں آیا تھا۔

"ہاں بھئی۔" ہاروے صاحب نے کہا۔ "باقی باتیں کل ہوں گی۔ اب تم آرام کرو۔ لیکن مجھے نہیں لگتا کہ تم اب خوشی سے سو پاؤ گے۔ گڈ نائٹ۔"

ان کی بات واقعی درست تھی۔ خوشی کے مارے میری تو نیند ہی اڑ گئی تھی۔ اپنے وطن واپس جانے کی ایسی خوشی کو بیان کرنے سے باہر تھی۔ آپ جس ملک بھی چلے جائیں، لیکن جو خوشی، راحت اور سکون اپنے ملک میں ملے گا وہ دیارِ غیر میں ممکن نہیں۔

میں نے اسی رات صبیحہ کو فون کر کے اپنی آمد کے بارے میں بتایا تو میں نے چشمِ تصور میں دیکھا وہ بھی خوشی کے مارے اچھل ہی پڑی تھی۔

"بھائی! میں اتنی خوش ہوں کہ بتا نہیں سکتی۔" اس نے خوش ہو کر کہا تھا۔

"بتانے کی ضرورت بھی نہیں۔" میں نے شرارتاً کہا۔ "تمہاری آواز سے ہی تمہاری خوشی کا اندازہ ہو رہا ہے۔"

"امی کو بتاؤں گی تو وہ بھی خوش ہو جائیں گی۔"

"شانزے کو مت بتانا۔" مجھے شانزے کا خیال آیا تو میں نے کہا۔

"کیوں بھائی۔ اسے کیوں نہ بتاؤں؟" اس بار اس کے لہجے میں حیرت سموئی ہوئی تھی۔

"میں اسے سرپرائز دوں گا۔"

"ہمم....." اس نے ہنکاری بھری۔ "اور حیدر انکل؟"

"ان کو بے شک بتا دینا۔" میں نے سوچ کر کہا۔ "لیکن ان سے بھی کہہ دینا کہ وہ شانزے کو نہیں بتائیں گے۔"

"ٹھیک ہے بھائی۔"



چند مزید باتیں کرنے کے بعد میں نے رابطہ منقطع کر دیا۔ اس رات میں کافی دیر تک جاگتا رہا تھا۔ رات کے تقریباً ساڑھے تین بجے ہی مجھے نیند آئی تھی۔ اپنے وطن جانے کا تصور ہی میرے لیے سرشاری کا باعث بنا تھا۔

اگلے روز دوپہر ڈیڑھ بجے ہی ہاروے صاحب اپنے دو آدمیوں کے ساتھ کوٹھی پر پہنچ گئے۔ انہوں نے میرا پاسپورٹ اور ٹکٹ میرے حوالے کیے تو میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ "آپ کا بہت بہت شکریہ ہاروے صاحب۔ آپ نے میرے ساتھ بہت تعاون کیا ہے۔"

"میں نے پہلے بھی کہا تھا کہ میں جولیا کی کوئی بات نہیں ٹالتا۔" ہاروے صاحب نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ "تم جولیا کے دوست ہو اور جولیا میرے لیے کیا اہمیت رکھتی ہے وہ میں تمہیں بتا چکا ہوں۔"

"جی انکل، جانتا ہوں۔"

"اور ہاں....." اچانک ہاروے صاحب کو کچھ یاد آیا تو انہوں نے جیب سے ایک کاغذ نکال کر میرے حوالے کیا۔ میں نے استفہامیہ نظروں سے کاغذ کی طرف دیکھا۔

"اس پر جولیا کا رابطہ نمبر لکھا ہوا ہے۔ میری رات ہی اس سے بات ہوئی تھی۔ وہ تمہیں لے کر بہت پریشان تھی اور تم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ موریس جس مقصد کے لیے انڈیا آیا تھا وہ اپنی موت آپ ہی مر گیا اور موریس واپس پاکستان جا رہا ہے تو وہ بہت خوش ہوئی۔ وہ تم سے بات کرنے کے لیے بہت بے چین ہے۔ پاکستان پہنچ کر اس سے بات کر لینا۔"

"جی ضرور۔" میں نے کاغذ جیب میں منتقل کرتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ کا چکر پاکستان لگے تو مجھے خدمت کا موقع دیجیے گا۔"

"اگر میرا کبھی پاکستان کا چکر لگا تو میں سیدھا تمہارے پاس ہی آؤں گا مائی سن۔" ہاروے صاحب ہنستے ہوئے بولے تو میں بھی ان کے جواب پر ہنس دیا۔

میں نے پاسپورٹ اور ٹکٹ بیگ میں رکھ لیا۔ ہاروے صاحب نے ایک اور پیکٹ مجھے دیتے ہوئے کہا۔ "یہ بھی رکھ لو۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے استفہامیہ نظروں سے پیکٹ لیتے ہوئے دریافت کیا۔

"پیسے ہیں۔"

"پیسے؟" میں ٹھٹکا۔

"ہاں۔" انہوں نے اقرار میں گردن ہلائی۔ "رکھ لو تمہارے کام آئیں گے۔"

"لیکن ہاروے صاحب....."

"پلیز۔ انکار مت کرو۔" انہوں نے مجھے ٹوکا اور پھر دھمکی آمیز لہجے میں بولے۔ "ورنہ میں جولیا سے تمہاری شکایت کر دوں گا۔"

میں بے ساختہ ہنس پڑا۔ پھر میں نے وہ پیکٹ بھی بیگ میں رکھ لیا۔ ہاروے صاحب بولے۔ "یار! مجھے یاد آیا تم نے روزی پر کیا جادو کر دیا ہے۔"

"کیوں، کیا ہوا ہے؟" میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"وہ تمہاری دیوانی ہو چکی ہے۔" ہاروے صاحب زیرِ لب مسکراتے ہوئے بولے۔ "اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے، کھاتے پیتے وہ تمہارے ہی گن گا رہی ہے۔ تم تو اس کے حواسوں پر اتنا سوار ہو چکے ہو کہ آج تمہاری آنٹی نے ایک بات کر ڈالی۔ جانتے ہو اس نے کیا کہا؟"

"کیا کہا آنٹی نے؟" مجھے بھی تجسس ہوا۔

"یہی کہ موریس اور روزی کی شادی کر دیتے ہیں۔" ہاروے صاحب نے کہا تو میرے چہرے پر مسکراہٹ رینگ گئی۔

ہاروے صاحب نے سلسلۂ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ "ویسے سچی بات یہ ہے کہ اگر تم انڈیا کے ہوتے تو میں تم سے روزی سے شادی کرنے کے لیے ریکوئسٹ کرتا۔ تم ایک بہادر اور اچھے کردار کے مالک ہو۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت کم تم ایسے نوجوان دیکھے ہیں۔ مجھے تم بہت ہی اچھے لگے ہو۔"

"شکریہ ہاروے صاحب۔" میں نے کہا۔ "کیا روزی کو پتا ہے کہ میں پاکستان جا رہا ہوں؟"

"نہیں۔" ہاروے صاحب نے نفی میں سر ہلایا۔ "میں نے روزی کو اس کی نانی کے پاس بھیج دیا ہے۔ تمہاری آنٹی بھی ساتھ گئی ہے۔ جب واپس آئیں گے تو بتا دوں گا۔ اچھا اب تم مجھ سے گلے مل لو کیونکہ تمہاری فلائٹ کا ٹائم ہونے والا ہے۔" کہنے کے ساتھ ہی ہاروے صاحب نے بانہیں پھیلائیں تو میں بھی ان سے گلے ملا۔ ہاروے صاحب نے گرم جوشی کا مظاہرہ کیا تھا۔

پھر میں ہاروے صاحب کے آدمیوں کے ساتھ ائیرپورٹ روانہ ہو گیا۔ ہاروے صاحب اسی کوٹھی میں رہ

گئے تھے کیونکہ ان کی بیوی اور سوتیلی بیٹی گھر پر نہیں تھے۔ اس لیے وہ واپس جا کر کیا کرتے۔ راستے میں، میں نے اپنا پاسپورٹ دیکھا تھا۔ پاسپورٹ پر میری موجودہ حلیے والی ہی تصویر تھی۔

میں اداس بھی تھا کیونکہ انڈیا میں میری جان از عزیز بہن روزینہ کی ڈیڈ باڈی تھی۔ باوجود کوشش کے میں ڈیڈ باڈی حاصل نہیں کر سکا تھا اور اللہ کے سپرد کر دیا تھا اور اللہ سے اس کی مغفرت کی دعا بھی کی تھی۔

ہم ائیر پورٹ پہنچے تو دو بج کر پچاس منٹ ہو رہے تھے۔ میں چونکہ وقت پر ائیر پورٹ پہنچ گیا تھا اس لیے فوراً ہی بورڈنگ ہوئی اور میں جہاز میں سوار ہو گیا۔ یہ سری لنکن ائیر لائن کا جہاز تھا جس نے آٹھ گھنٹے چالیس منٹ کے سفر کے بعد مجھے لاہور پہنچانا تھا۔ مگر کولمبو میں اسٹاپ تھا۔ ہارورے صاحب نے بتایا تھا کہ اسی ائیر لائن کی پہلی فلائٹ دستیاب تھی اس لیے میں نے اسی پر ٹکٹ بک کرا دی تھی۔

جہاز میں اور بھی مسافر سوار تھے۔ کسی نے کولمبو جانا تھا تو کسی نے پاکستان۔ میری سیٹ کے ساتھ والی سیٹ پر ایک لڑکی بیٹھی تھی جس نے کانوں میں ہینڈ فری لگائے ہوئے تھی اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے شاید میوزک سے انجوائے کرنے میں مگن تھی۔ میں خاموشی سے اپنی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ تین بج کر دس منٹ پر جہاز رن وے پر آیا اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے دوڑتے ہوئے فضا میں اڑنا شروع کر دیا تھا۔

ایک داستان تھی جو ختم ہونے جا رہی تھی لیکن اس داستان نے میری زندگی پر بہت گہرا اثر ڈالا تھا۔ مجھے زندگی کے نشیب و فراز سے آشنا کرایا تھا۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے ملاقات کرائی تھی اور میں اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر انسان طاقت ور کے سامنے کمزور پڑ جائے تو وہ اسے پھر کی طرح مسل دیتا ہے۔ طاقت ور سے مقابلہ کرنے کے لیے خود کو بہادر اور طاقت ور بنانا پڑتا ہے۔

ایک لمبی اور صبر آزما پرواز کے بعد جب جہاز کے کپتان نے اعلان کیا کہ جہاز پاکستان کی حدود میں داخل ہو گیا ہے تو میں نے سکون کی سانس خارج کی تھی۔ جہاز نے رات گیارہ بج کر [illegible] منٹ پر لاہور ائیر پورٹ پر لینڈ کیا تھا۔ ائیر پورٹ سے کسٹم کے مراحل سے گزر کر جب میں ائیر پورٹ سے باہر آیا تو وہاں کافی ٹیکسیاں اور رکشے موجود تھے۔ میں لاہور میں رات نہیں گزارنا چاہتا تھا اس لیے میں نے ٹیکسی لی اور کوچ اسٹینڈ کی طرف چل دیا۔

آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد میں کوچ اسٹینڈ پہنچا تو مجھے ایک نائٹ کوچ مل گئی جس نے ساڑھے بارہ بجے ملتان جانا تھا۔ مجھے بھوک بھی لگ رہی تھی۔ میں نے ایک برگر شاپ میں بیٹھ کر برگر سے پیٹ پوجا کی۔ پھر رات ساڑھے بارہ بجے والی نائٹ کوچ کے ذریعے ملتان روانہ ہو گیا۔ کوچ میں سوار لوگ مجھے عجیب سی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ میں سمجھ گیا تھا کیونکہ میرا حلیہ انگریزوں والا تھا۔ میں نے کسی کی پروا نہیں کی تھی۔

کوچ جب ملتان کی حدود میں داخل ہوئی تو فجر کی اذانیں ہو رہی تھیں۔ میں نے کوچ اسٹینڈ سے ملحقہ مسجد میں فجر کی نماز ادا کی اور اللہ کا شکر ادا کیا کہ میں بخیر و عافیت اپنے شہر پہنچ گیا ہوں۔ پچھلی رات جب مرینہ سے بات ہوئی تھی تو اس نے مجھے حیدر الماس صاحب کے گھر کا ایڈریس سینڈ کر دیا تھا جسے میں نے ایک کاغذ پر نوٹ کر لیا تھا۔ چنانچہ فجر کی نماز ادا کرنے کے بعد میں نے ایک آٹو رکشا لیا اور گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرے وجود پر سرشاری کی کیفیت طاری تھی۔

مرینہ اور حیدر الماس صاحب میرے ہی منتظر تھے کیونکہ انہیں میری آمد کی خبر تھی لیکن ان کو نہیں تھی۔ میں ان کو سرپرائز دینا چاہتا تھا۔ ہارورے صاحب نے انڈین کرنسی کو پاکستانی کرنسی میں بدلوا کر مجھے پیسے دیئے تھے جو واقعی میرے بہت کام آئے تھے۔ چالیس منٹ کے سفر کے بعد جب آٹو رکشا حیدر الماس صاحب کے گھر کے گیٹ کے سامنے رکا تو میرے دل کی کیفیت متغیر ہو گئی تھی۔ میں ڈرائیور کو کرایہ دے کر بیگ اٹھائے گیٹ کی طرف بڑھا ہی تھا کہ میں اسی لمحے گیٹ کھل گیا اور حیدر الماس صاحب دکھائی دیئے۔ ان کے پیچھے مرینہ بھی تھی۔ شاید انہوں نے آٹو رکشے کی آواز سن لی تھی اسی لیے وہ باہر آ گئے تھے۔

پہلے تو وہ مجھے دیکھ کر ٹھٹکے پھر وہ انداز سے پہچان گئے۔ میں حیدر الماس صاحب سے گرم جوشی سے ملا تھا۔ ان سے حال احوال دریافت کرنے کے بعد جب میں نے مرینہ کی طرف دیکھا تو وہ بھی فرط جذبات میں میرے گلے لگ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

"ارے پگلی، کیوں رو رہی ہے۔ میں آ تو گیا ہوں۔" میں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میں خود پر قابو نہیں رکھ سکی۔" مرینہ گلوگیر آواز میں



بولی۔ "آپ نے اپنا حلیہ کیوں بدلا ہوا ہے؟"

"مجبوری تھی۔" میں نے جواباً کہا۔ "دشمنوں سے بچنے کے لیے مجھے اپنا حلیہ بدلنا پڑا۔ اگر حیدر صاحب نہ پہچان پاتے تو میں نے تمہیں تنگ کرنے کا پورا پروگرام بنایا ہوا تھا۔"

ہلکا حیدر الماس صاحب نے مداخلت کی۔ "اب ساری باتیں یہیں باہر کھڑے ہو کر کرو گے یا اندر بھی چلو گے۔ آتے جاتے لوگ حیرت بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔"

پھر میں ان کے ساتھ چلتا ہوا ڈرائنگ روم میں پہنچا۔ سب سے پہلے میں نے واش روم میں جا کر اپنا حلیہ تبدیل کیا کیونکہ اس حلیے میں امی مجھے نہیں پہچان سکیں گی۔ میں حلیہ اور لباس تبدیل کر کے ڈرائنگ روم میں آیا تو میری خوشی کی انتہا نہ رہی کیونکہ ڈرائنگ روم میں امی صوفے پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں امی سے ملا، ان کی خیریت دریافت کی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر خوشی سے رو پڑی تھیں۔ ان کا آج بھی وہی سوال تھا۔ "روزینہ کہاں ہے..... اسے ساتھ کیوں نہیں لائے؟"

حیدر الماس صاحب نے مجھے اشارہ کر کے کہہ دیا کہ تم امی کو ساری حقیقت بتا دو۔ آخر کب تک انہیں اندھیرا میں رکھا جا سکتا تھا چنانچہ میں نے امی کو ساری حقیقت بتا دی۔ پہلے تو امی پر سکتے کی کیفیت طاری رہی، لیکن جب ان کا سکتہ ٹوٹا تو ان کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ ہم نے انہیں تسلی دی اور بالآخر انہیں صبر آ گیا۔

مجھ پر سفر کی بھی تھکاوٹ تھی اس لیے میں ناشتا کرنے کے بعد سو گیا۔ میں دوپہر بارہ بجے تک سوتا رہا تھا۔ پھر فریش ہونے کے بعد میں نے مرینہ کے سیل فون سے شاذیہ کو کال کی۔ وہ تو میری آواز سن کر ہی اچھل پڑی۔

"تم..... تم واپس کب آئے؟"

"آج صبح۔"

"مجھے کیوں نہیں بتایا۔" اس نے فوراً ہی شکوہ کر دیا۔

"مرینہ نے بھی ذکر نہیں کیا۔"

"میں تمہیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "اسی لیے میں نے مرینہ کو بھی منع کر دیا تھا۔"

"بہت گندے ہو۔" شاذیہ کو جب کوئی اور بات نہ سوجھی تو اس نے یہی کہنے پر اکتفا کیا۔ اس کی بات پر میں ہنس دیا۔ شاذیہ دوبارہ بولی۔ "میں آ رہی ہوں۔"

آدھے گھنٹے کے اندر اندر شاذیہ بھی پہنچ گئی تھی۔ وہ بھی مجھے دیکھ کر بہت خوش تھی۔ اس کا بس نہیں چل رہا تھا ورنہ وہ مجھ سے لپٹنے میں ایک لمحے کی بھی دیر نہ کرتی۔

زندگی معمول کے مطابق گزرنے لگی تھی۔ حیدر الماس صاحب نے مجھے ایک نجی کمپنی میں ملازمت دلوا دی تھی۔ میرے پاس ہارورے صاحب کے دیئے پیسے بچ گئے تھے جن سے میں نے اپنے لیے ایک اینڈرائیڈ سیل فون خرید لیا تھا۔ اس دوران میں نے جولیا سے بھی بات کی تھی۔ جولیا نے اپنے ایک فرینڈ سے شادی کر لی تھی اور اس کے ساتھ ہنسی خوشی زندگی گزار رہی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ "سوری! تم جب بھی امریکا آؤ تو ہمارے پاس ضرور آنا۔"

میں نے اس سے وعدہ کر لیا تھا۔ میں نے اس سے ہیری نام کے بارے میں بھی دریافت کیا تھا۔ ہیری نام کے حوالے سے اس نے حیران کن بات بتائی تھی۔ جولیا کے مطابق، ہیری نام ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں شدید زخمی ہو گیا تھا اور اس کی دونوں ٹانگیں بری طرح کچلی گئی تھیں۔ ڈاکٹروں نے اس کی دونوں ٹانگیں کاٹ دی تھیں۔ وہ معذور ہو چکا تھا۔ ٹانگیں کٹنے کے بعد وہ منظر عام سے غائب ہو چکا تھا اور تا حال اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ قدرت نے اسے ایسی سزا دی تھی کہ اپنی باقی ماندہ زندگی گھٹ گھٹ کر جیئے گا۔

ایک سال کے بعد میری شاذیہ کے ساتھ شادی ہو گئی تھی۔ ہماری شادی میں چوہدری باسط اور شانی تو شریک نہیں ہوئے تھے کیونکہ شانی جیل میں تھا اور چوہدری باسط لندن میں مفرور تھا۔ شاذیہ کی طرف سے اس کی امی اور حیدر الماس صاحب تھے جبکہ میری طرف سے امی اور مرینہ تھیں۔ ہماری شادی سادگی سے انجام پائی تھی۔ میں نے اپنا آبائی گھر بیچ کر ایک اور علاقے میں نیا گھر خرید لیا تھا اور ہم سب وہیں ہنسی خوشی زندگی گزار رہے ہیں۔ مرینہ کی بھی میرے دوست بابر عرف جوکر سے منگنی ہو چکی ہے اور ایک سال کے بعد شادی ہے۔ بابر عرف جوکر اب سدھر چکا تھا۔ وہ پہلے والا جوکر نہیں تھا بلکہ ایک سنجیدہ اور بردبار بن گیا تھا۔ حیدر الماس صاحب نے ہی اس کی سفارش کی تھی اور میں حیدر صاحب کی کوئی بھی بات نہیں ٹال سکتا تھا کیونکہ وہ میرے بہت بڑے محسن تھے۔

(ختم شد)

# کچرا کنڈی

قابلِ احترام مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
ہمارے آس پاس کچھ واقعات کچھ کردار ایسے ہوتے ہیں جنہیں ہم چاہ کر بھی نظرانداز نہیں کرسکتے۔ امتیاز بھی ایک ایسا ہی کردار ہے۔ آج تک میں یہ فیصلہ ہی نہیں کرپایا ہوں کہ اسے قابلِ نفرت قرار دوں یا مظلوم کہوں۔ فیصلہ قارئین کریں۔ اس سچ بیانی کو کئی بار لکھا اور پھاڑا ہے۔ دراصل فیصلہ نہیں کرپایا ہوں کہ کسے مظلوم قرار دوں۔

محمد ظفر حسین
(کراچی)

بظاہر وہ ایک بے ضرر سا بدحال شخص تھا۔ مٹی دھول سے اٹے میلے کچیلے کپڑے۔ کتے بلیوں اور بدبودار کچرے کے بیچ سارا دن کچرا کنڈی میں پڑا رہتا۔ نشے کا عادی تھا۔ جھاڑ جھنکاڑ داڑھی اور بے تحاشہ بڑھے ہوئے خاکستری بال۔ شاید برسوں سے نہایا تک نہیں تھا۔ نورین کو کالج آتے جاتے روزانہ ہی نظر آتا۔ جب بھی وہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر نورین کو دیکھتا تو بیچاری سہم کر رہ جاتی۔ ان آنکھوں میں وحشت آمیز ویرانی تھی۔ کھوجتی ہوئی، تلاشتی ہوئی آنکھیں۔ وہیں کچرے سے گلی سڑی باسی خوردونوش اشیاء چن کر کھالیتا۔ مکھیاں اس کے چہرے پر بھنبھناتی رہتیں مگر وہ ان تمام چیزوں سے جیسے بے پروا تھا۔ یہ کوئی باقاعدہ کچرا کنڈی نہیں تھی۔ یہاں نزدیک ہی ایک برساتی نالہ گزرتا تھا جو بارش کے دنوں میں ابل پڑتا تھا۔ اس کے ساتھ ایک خالی پلاٹ تھا جسے اپنی مدد آپ کے تحت شہریوں نے کچرا کنڈی بنالیا تھا۔

بحیثیت قوم ہم سب اپنی ذمہ داریوں سے جان چھڑاتے ہیں۔ گھر کا کچرا صاف کر کے ڈسٹ بن میں ڈالنے کی بجائے یہاں وہاں سڑکوں پر پھینک کر ماحول میں تعفن پھیلاتے ہیں۔ کوئی ایک پہل کرتا ہے پھر سب مل کر وہاں اپنا اپنا حصہ ڈال کر جگہ جگہ کچرا کنڈی بنا دیتے ہیں۔ یہ بھی ایک ایسی ہی کچرا کنڈی تھی۔

☆☆☆

ہم حال ہی میں اس محلے میں شفٹ ہوئے تھے۔

ایک ساتھ دو بھائیوں کی شادی ہوئی تو گھر چھوٹا پڑ گیا۔ پرانا فلیٹ بیچنے اور والد صاحب کے ریٹائرمنٹ پر ملنے والی رقم جوڑ کر جمع پونجی اکھٹی کی تو اسّی گز کا مناسب ون یونٹ مکان مل گیا تھا مگر گھر سے بس اسٹاپ کافی فاصلے پر تھا راستے میں کچرے کا ڈھیر اور ٹوٹ پھوٹ کا شکار سڑکیں تھیں۔ اس پر ابلتے ہوئے سیوریج اور گٹر کا پانی۔ گلیاں بھی تنگ جہاں مکینوں نے حسب ضرورت جگہ گھیر کر گلی کو مزید سکیڑ دیا تھا۔ مکان لیتے وقت محل وقوع دیکھا جاتا ہے مگر اب تو پورے شہر کا یہی حال ہے۔ اہلِ علاقہ بھی بس مناسب ہی

تھے۔

"سر چھپانے کا ٹھکانا اپنا ہونا چاہیے۔ باقی ماحول انسان خود بناتا ہے۔" نورین کے والد کہا کرتے تھے۔

نورین روزانہ صبح ساڑھے چھ بجے گھر سے کالج جانے کے لیے نکلتی۔ شروع میں نورین کا چھوٹا بھائی اس کو اسٹاپ تک چھوڑ آتا مگر جب سے چھوٹے بھائی کی ایک فرم میں بطور ڈیلیوری رائڈر نوکری لگی تھی۔ رات کو اکثر لیٹ ہوجاتا اور صبح دیر تک سویا رہتا۔ پرانے محلے میں نورین کا کالج گھر سے نزدیک تھا۔ اب اس نئے علاقے میں منتقل ہونے کے بعد یہ فاصلہ کافی طویل ہوگیا تھا۔ شہر کے خستہ حال ٹرانسپورٹ نظام کی وجہ سے مشکلات میں مزید اضافہ ہوچکا تھا۔ اس علاقے میں سوائے چنگ چی رکشے کے کسی بس کا روٹ نہیں تھا۔ اگر نورین صبح گھر سے نکلنے میں ذرا دیر کردیتی تو کچا کچ بھرے ہوئے چنگ چی میں بھی جگہ نہ ملتی۔ اسٹاپ تک پیدل پہنچنے میں اس کو آٹھ سے دس منٹ لگ جاتے۔ راستے میں تقریباً روزانہ ہی ایک جیسا منظر نظر آتا۔ جا بجا ایک بکری اور دودھ کی کھلی ہوئی دکانیں۔ گلیوں سے گزرتی اکا دکا اسکول کی وین کے ہارن۔ یا دودھ والے کی بائیک کی گھڑگھڑاتی آوازیں۔ صبح صبح گلیوں میں آرام فرماتے آوارہ کتوں سے بچ کر چلنا پڑتا مگر یہ آوارہ کتے ان گلی کتوں سے بہت بہتر تھے جو ہر آتی جاتی پرائی عزت پر جاہلانہ فقرے کستے ہیں وہ اشارے اور بری نظر ڈالنا اپنا فرض سمجھتے۔ ہمارے معاشرے کا المیہ ہے۔ لوگ ہر جگہ کچرا پھیلانے کے عادی تو ہیں مگر دل اور دماغ میں بھی گندگی ساتھ ساتھ لیے پھرتے ہیں۔ ان کا دماغ ہر وقت کچرا کنڈی بنا رہتا ہے ایسے ہی غلاظت بھرے لوگوں کی گندی نظروں سے بچنے کے لیے نورین کالج جاتے ہوئے بڑی سی چادر اوڑھ کر چہرہ چھپاتی اور گرد کے ماحول کی مناسبت سے سر جھکائے روزانہ گھر سے بس اسٹاپ اور واپسی تک تمام فاصلہ بڑی احتیاط کے ساتھ طے کرتی۔

لیکن کبھی کبھی نورین کو یہ احساس ہوتا کہ صبح کے وقت کوئی اس کا باقاعدہ پیچھا کررہا ہے۔ پیچھے اندھیرے میں دور کوئی سایہ پیچھے آتا محسوس ہوتا۔ ممکن ہے یہ نورین کا وہم بھی ہوسکتا کیونکہ کبھی بھی کسی نے اس کے سامنے آکر کوئی حرکت نہیں کی تھی۔ نورین کا شک آگے جا کر یقین میں بدل گیا تھا۔

☆☆☆

آج صبح جب نورین گھر سے کالج جانے کے لیے نکلی تو چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ تھی۔ پچھلی شام کو بھائی کے ساتھ بائیک پر آتے ہوئے بائیک سلپ ہوگئی تھی۔ شرم کو تو کافی چوٹ آئی۔ گھٹنے اور کہنیاں چھل گئیں۔ نورین کو ٹخنے میں چوٹ لگی تھی۔ شام ہی کو ڈاکٹر سے دوا لے کر ٹخنے میں انجکشن بھی لگوالیا تھا مگر دوسرے دن چوٹ کا تھوڑا اپنا اثر دکھا رہا تھا۔ نورین صبح اٹھی تو پاؤں میں درد کر رہا تھا۔ آج کالج جانا بھی ضروری تھا۔ امتحانات سر پر تھے۔ آج کالج سے غیر حاضر نہیں رہ سکتی تھی۔ درد و تکلیف کے باوجود گھر میں کسی پر اپنی حالت کو ظاہر نہیں کیا۔ اللہ کے بھروسے پر گھر سے کالج جانے کے لیے نکل پڑی۔

سردیوں کے دن تھے۔

آج صبح دھند بہت زیادہ تھی۔ روڈ پر حسب معمول سناٹا تھا۔ نورین گھر سے ہمت کرکے نکل تو آئی تھی مگر پیدل چلنے سے ٹخنے پر لگی چوٹ میں مزید اضافہ ہوچکا تھا۔ آدھے راستے پر پہنچی تو نورین ہلکے ہلکے باقاعدہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ کچرا کنڈی تک پہنچتے پہنچتے نجانے اس کی چھٹی حس کیوں خبردار کررہی تھی کہ پیچھے کچھ ہونے والا ہے۔ وہ وحشی دیوانہ شخص کچرا کنڈی میں لیٹا ہوا تھا۔ روزانہ اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر نورین کو ایک بار ضرور دیکھتا اور اس کی جان نکل جاتی۔ نجانے کیا بات تھی کہ دیوانے نے آج نورین کو لنگڑاتے دیکھا تو یک دم اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بالکل ایسے ہی جیسے سانپ حملہ کرنے کے لیے کنڈلی مار کر بیٹھ جاتا ہے۔ وہ چار آوارہ کتے بھی جو اس کے آس پاس پڑے سو رہے تھے وہ بھی چونک کر اٹھ بیٹھے اور دم ہلاتے ہوئے چوکنا ہو کر ادھر ادھر دیکھنے لگے۔ وہ وحشی دیوانہ اپنی چمک دار آنکھوں سے ٹکٹکی باندھے نورین کو دیکھے جا رہا تھا۔ پلکیں جھپکائے بغیر۔ نہ چاہتے ہوئے بھی نورین کی نظریں دیوانے سے ملیں تو آج نورین کو یوں لگا جیسے کوئی خونخوار اژدہا سامنے موجود ہو بس شکار پر حملہ کرنے کی دیر اور سالم نگل جائے۔ ان آنکھوں میں چھپی ہوئی وحشت نے نورین کا دل دہلا دیا۔ ویسے بھی اسے ہمیشہ سے ہی پاگلوں اور فقیروں سے ڈر لگتا تھا۔

کچرا کنڈی کی حدود سے باہر آتے ہی نورین نے ایک لمحے کو اطمینان بھری سانس کھینچی اور دوبارہ پیچھے مڑ کر دیکھا تو دل بے اختیار اچھل کر حلق میں آگیا۔ آج یہ احساس حقیقت میں بدل گیا تھا کہ کوئی اس کا پیچھا کررہا تھا۔ وہ دیوانہ اٹھ کر تیزی سے اس کی طرف ہی بڑھ رہا تھا۔ نورین



نے ڈر کے مارے دانت بھینچ لیے۔ دل گرانے لگا کہ سڑک پر دوڑ لگادے۔ پھر اسے یاد آیا پاگلوں اور کتوں سے خوفزدہ ہو کر بھاگنا ہو تو وہ آپ کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ انہیں نظر انداز کرنا ہی بہتر ہے لہٰذا اپنی رفتار معتدل کرلی۔ دیوانہ تقریباً بھاگتے ہوئے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ محلے کے کتے بھی اس کے ساتھ آگے پیچھے زبان نکالے دم لہراتے چلے آرہے تھے۔

سو طرح کے وہم نورین کے دل میں آرہے تھے۔ لنگڑا رہا تھا۔ موقع اچھا تھا۔ شکار بھاگ نہیں سکتا۔ آج شاید وہ وحشی دیوانہ اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہتا ہے۔ نورین کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس طرح اس مڈبھیڑ سے جان چھڑائے۔ اللہ کو یاد کرتے ہوئے دل ہی دل میں آیت الکرسی پڑھنی شروع کردی۔ عین اس وقت ایک دودھ والا بھی سائیکل پر وہاں سے گزرا اور کچھ فاصلہ طے کرنے کے بعد ہی سڑک پر دور دور تک لوگ نظر آنا شروع ہوئے تو جان میں جان آئی۔ ویسے تو یہ شہر تھا۔ ایسا نہیں تھا کہ سڑک پر کھلے عام کوئی دیوانہ کسی کو ضرر پہنچاتا مگر کیا بھروسا۔ آج کل بچانے والے کم اور ویڈیو بنانے والوں کا تناسب بڑھتا جارہا ہے۔ نورین کا پیچھا کرتا وہ دیوانہ پیچھے رہ گیا تھا کہ اچانک پیچھے سے دھند کے پار کتوں کے بھونکنے کی آوازیں آنا شروع ہوگئیں۔ ساتھ ہی ساتھ کتوں نے بھونک بھونک کر آسمان سر پر اٹھالیا تھا۔ نورین کو محلے کے ان کتوں سے تو ڈر نہیں لگتا تھا کیونکہ حیرت انگیز طور پر وہ محلے والوں پر کبھی نہیں بھونکتے بلکہ چھوٹے بچوں کے پتھر اٹھانے پر بھی دم دبا کر بھاگ جانے کو ترجیح دیتے۔ شور سن کر نورین سوچ میں پڑ گئی۔

حالات کا جائزہ لے کر آگے جائے یا واپس لوٹ جانے کا فیصلہ کرنے کے لیے ٹھٹک گئی۔ اتنے میں وہ دیوانہ پھر سامنے آگیا تھا۔ نورین کے دائیں جانب کیں دوڑتا بھاگتا اس کے چہرے کو دیکھنے کی کوشش کررہا تھا۔ نورین نے چادر درست کی اور اس دوران ذرا سی دیر کے لیے سر پر پلو سرکا تو چہرہ کچھ دیر کے لیے عیاں ہوگیا۔ ٹھیک اسی لمحے وہ دیوانہ بالکل سامنے آگیا۔ نورین ایک دم وحشت زدہ ہوگئی۔ دیوانے کے ماتھے پر تازہ چوٹ کا نشان تھا جہاں سے گاڑھے خون کی لکیریں بہہ کر چہرے پر جم گئی تھیں۔ دیوانے نے اپنی کھوجتی ہوئی نظریں نورین کے چہرے پر گاڑ دیں۔ نورین کی نظریں ان وحشت بھری آنکھوں سے ملیں تو جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔

نورین نے گھبرا کر چہرے کا پلو درست کیا۔ بالآخر بدقت تمام نورین نے اسٹاپ تک کا فاصلہ طے کیا۔ نورین کو بس اسٹاپ پر آکر اطمینان محسوس ہوا۔ یہاں حسب معمول کافی لوگ موجود تھے۔ وہ دیوانہ بھی ادھر ادھر ہوگیا۔ اس اثنا میں مطلوبہ چنگ چی آگئی۔ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتی کالج کی طرف روانہ ہوئی۔ ایک تو ٹخنے میں چوٹ۔ درد اور دوسرے صبح سویرے دیوانے سے مڈبھیڑ کے باعث ذہنی تکلیف الگ۔ پڑھائی میں دل خاک لگتا۔ جیسے تیسے کلاس ختم ہوئی۔ ان تمام الجھنوں کے بعد کلاس فیلوز کے ساتھ کینٹین میں آکر کھلی فضا میں کچھ دیر بے فکری سے وقت گزرا تو نورین کچھ دیر کے لیے پاؤں کا درد بھی بھول گئی۔ دوستوں کے ساتھ ہنسی مذاق میں دل کا بوجھ کچھ کم ہوا تو صبح منہ اندھیرے پیش آنے والے واقعہ کا اثر بھی زائل ہوگیا۔ ویسے بھی روشنی زندگی کی نوید ہے۔ دن کا اجالا انسان کا ڈر ختم کردیتا ہے۔

☆☆☆

کالج سے گھر واپسی پر بروقت چنگ چی رکشا مل گیا۔ دوران سفر چنگ چی سے اترتے ہوئے ایک خاتون کے پاؤں کی ٹھوکر ٹخنے پر لگ گئی کہ ٹخنے کا درد جس شدت سے جاگ چکا تھا جس نے درد کی شدت کو دوبالا کردیا۔ درد کی ٹیسیں جیسے ٹخنے سے ہوتی ہوئی دماغ کی چولیں ہلا رہی تھیں۔ بس اسٹاپ پر اتری تو پاؤں سوج چکا تھا۔ نورین نے اسٹاپ سے گھر تک رکشا کرنے کے لیے آس پاس رکشے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں مگر بھری دوپہر میں اس وقت کوئی خالی رکشا نظر نہ آیا۔ انسان کوشش اور ہمت کرے تو اللہ مدد کرتا ہے۔ اسٹاپ پر گھورتی ہوئی نظروں سے بچنے کی خاطر نورین نے کشاں کشاں پیدل ہی واپسی کا ارادہ کرلیا۔

نصف راستہ ہی طے کیا تھا کہ صبح کا ناگوار واقعہ یاد آگیا۔ ویران وحشت بھری آنکھوں کا خیال آتے ہی نورین نے نظر بھر کر آس پاس دیکھا۔ بھری دوپہر اور چہل پہل میں کوئی خوف تو نہیں مگر وہم ضرور تھا اور وہم حقیقت کا روپ دھار لے تو ڈر سے بھی زیادہ مہلک مرض بن جاتا ہے۔ شاید یہی کچھ ہونے والا تھا۔

کچرا کنڈی کے نزدیک پہنچ کر نورین نے آس پاس نظر ڈالی۔ وہ دیوانہ کہیں نظر نہ آیا۔ نورین نے دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کیا۔ حتی الامکان تیزی سے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی لنگڑاتی ہوئی اپنی گلی تک پہنچ چکی تھی کہ گلی

میں داخل ہوتے ہی پوری گلی نورین کی چیخوں سے گونج اٹھی تھی۔

اچانک ہی وہ دیوانہ نمودار ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنے میلے کچیلے وجود اور گندے ہاتھوں کی مضبوط گرفت سے نورین کے بازو پکڑ لیے۔ نورین کی چیخوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ محلے کے مرد و خواتین بروقت مدد کو پہنچے اور دیوانے کو کھینچ کر الگ کیا۔ وہ دیوانہ کسی قیمت نورین کے بازو چھوڑنے پر تیار نہیں تھا۔ بری طرح دہشت کا شکار نورین کو بس اتنا یاد تھا کہ اپنا سر نورین کے قدموں پر رکھ کر ایڑیاں رگڑتے دیوانے کی وحشت زدہ ویران آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے اور وہ گڑگڑاتے ہوئے نجانے کیوں کسی کا نام لے کر نورین سے معافیاں مانگ رہا تھا۔

اسی دوران نورین کے گھر کسی نے خبر کر دی۔

نورین کے بھائی اور والد دوڑتے ہوئے آئے۔

نورین باپ کے گلے لگ کر رو پڑی۔ نورین کا بھائی شدید غصے میں تھا۔ شاید دیوانے کو نقصان پہنچا دیتا مگر محلے والوں نے سمجھا بجھا کر گھر بھیج دیا۔ شام تک نورین کو تیز بخار نے آلیا۔ اگلے دو تین دن کالج سے چھٹی کرنی پڑی۔ دوسرے دن صبح سویرے نورین کے بھائیوں نے راستے میں دکانداروں اور کچھ عینی شاہدین سے معلومات اکٹھا کریں تو انکشاف ہوا کہ کچھ دنوں سے ملحقہ علاقے کے چند آوارہ لڑکے خاموشی سے نورین کا پیچھا کررہے تھے۔ مذکورہ دن بھی انہوں نے جب صبح نورین کو اکیلے آتے دیکھا تو یہ ان کے لیے بہترین موقع تھا۔ وہ نورین کا پیچھا کرتے نزدیک پہنچ کر کچھ حرکت کرنے ہی والے تھے کہ گلی سے دیوانہ اچانک ان کے سامنے آگیا۔ دیوانے کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ صبح دھند پھیلی ہوئی تھی۔ نورین کو کچھ دور سامنے حرکت کرتے ہوئے لڑکے آتے نظر آئے تھے مگر وہ زیادہ تر دائیں بائیں دیکھے بغیر اپنے راستے پر سر جھکائے سیدھی چلی جارہی تھی۔ ان لڑکوں کی دیوانے سے مڈبھیڑ ہوئی تو اس نے دیوانہ وار لکڑی سے ان کی خوب درگت بنا ڈالی۔ دیوانے کے ساتھ جو کتے تھے انہوں نے بھی اینٹوں اور ڈنڈوں کو دیکھ کر بھونکنا شروع کر دیا۔ قریب تھا وہ کتے ان پر حملہ کر دیتے مگر لڑکے جان چھڑا کر بھاگ نکلے اور جاتے جاتے کتوں کے ساتھ دیوانے کو بھی سر پر ایک زوردار پتھر مار کر اس کا ماتھا پھوڑ ڈالا تھا۔ ان دو تین دنوں میں نورین کے گھر والوں کو دیوانے کے بارے میں جو کچھ پتا چلا وہ عبرت انگیز

اور سبق آموز تھا۔ وہ دیوانہ نورین کو نقصان نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ وہ تو ان لڑکوں سے نورین کو بچا رہا تھا مگر وہ خود کسی بدنصیب اور بددعا کے زیر اثر بدقسمت شخص تھا۔ اس شخص کی بپتا سن کر دل دہل گیا تھا۔

☆☆☆

شہر کے گنجان آباد صنعتی علاقے کی معروف شاہراہ پر ٹریفک درہم برہم ہو چکا تھا۔ ٹریفک کی روانی میں خلل صنعتی علاقے کی ایک مزدور یونین کی جانب سے ہونے والے مظاہرے کے باعث تھا۔ احتجاج کرنے والوں نے ٹائروں کو آگ لگا کر اپنے مطالبات کے حق میں سڑک کے بیچوں بیچ دھرنا دے دیا تھا۔ نعرے بازی کے شور میں چوراہے سے کچھ فاصلے پر گاڑیوں کو روک دیا گیا اور پھر جلاؤ گھیراؤ شروع ہوگیا۔ مظاہرین نے ایک بس کو گھیر کر مسافروں کو زبردستی اتار دیا۔ کچھ شرپسند بس کو آگ لگا رہے تھے۔ اس اثنا میں پولیس آپہنچی۔ مظاہرین میں سے کسی نے اسلحہ استعمال کیا۔ فضا ہوائی فائرنگ سے گونجنے لگی۔ پولیس نے شرپسندوں سے نمٹنے کے لیے شیلنگ اور جوابی کارروائی میں فائرنگ کی تو ذرا سی دیر میں دو طرفہ اندھا دھند فائرنگ میں کئی بے گناہ راہ گیر اور بس مسافر بھی زد میں آگئے۔

رفاہی اداروں کی ایمبولینس موقع پر پہنچ گئیں۔ زخمیوں کو اسپتال منتقل کرنے سے پہلے کچھ زخمی راستے میں ہی دم توڑ گئے تھے۔

معاشرتی ناہمواری کا شاخسانہ ہے۔ انصاف کی عدم موجودگی میں عدم برداشت کا فلسفہ خوب پھل پھول رہا ہے۔ اکثریت اپنے مطالبات منوانے کے لیے تشدد کا منفی راستہ ہی منتخب کرتی ہے۔ نجانے اس طرح کے حادثات میں کتنے گھر اجڑ جاتے ہیں۔ جن کے پیارے ان المناک حادثات میں بے گناہ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں ان کے لواحقین کی ہنستی بستی زندگی پل بھر میں ویران ہو جاتی ہے۔ اگلے دن حکومت سے لے کر ہر سیاسی پارٹی مرنے والوں سے ہمدردی اور اظہارِ افسوس کر کے اپنا فرض ادا کر لیتی ہے۔ وہی گھسے پٹے بیانات۔ لواحقین کے ساتھ یکجہتی۔ تو کمیشن۔ امداد کا اعلان کیا جاتا ہے۔ کچھ دن بعد سب اس حادثے کو بھول بھال چکے ہوتے ہیں اور لواحقین امدادی چیک کے حصول کے لیے دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔

محفوظ صاحب صنعتی علاقے کی ایک مشہور و معروف



فیکٹری اسکائی ڈیٹم انڈسٹریز میں سپر وائزر تھے۔

محفوظ صاحب فیکٹری اسکائی ڈیٹم انڈسٹریز سے ڈیوٹی سے واپسی پر پولیس یا شرپسندوں میں سے جانے کس کی اندھی گولی کا شکار ہونے والوں میں شامل تھے۔ شرپسندوں کے خونی مطالبات تو پورے ہوئے یا نہیں مگر انہوں نے چند گھرانوں کو خون کے آنسو ضرور رلا دیا۔ محفوظ صاحب گھر کے واحد کفیل تھے۔ دو بچوں اور بیوہ کو لواحقین میں چھوڑا تھا۔

☆☆☆

اسکائی ڈیٹم انڈسٹریز نے ایک مہربانی کی۔ محفوظ صاحب کے گھر کے کسی ایک فرد کو نوکری کی پیشکش کر دی۔

محفوظ صاحب کا بڑا صاحبزادہ امتیاز پچھلے کئی سالوں سے انٹر کے امتحان میں فیل ہوتا آرہا تھا۔ رات گئے آوارہ دوستوں کی صحبت میں گزارتا۔ صبح آکر پڑ کر سوجاتا تو پھر شام کو ہی اٹھتا۔ محفوظ صاحب کی مختلف اوقات میں ڈانٹوں کا زیادہ اثر نہیں ہوا۔ انہیں جب تک بیٹے کے بگڑنے کا اندازہ ہوا بہت دیر ہو چکی تھی۔ امتیاز نے چھپ چھپا کر سگریٹ کے ساتھ ہلکا پھلکا نشہ بھی شروع کر دیا تھا۔ والدین بچوں کے لیے محنت کرتے ہیں مگر ان کی تربیت سے نجانے کیوں غافل ہو جاتے ہیں۔ محلے کے کئی بزرگوں نے محفوظ صاحب کو خبردار کیا مگر والدین نے ہمیشہ بچہ سمجھ کر ہنس کر ٹال دیا۔ امتیاز سے چند سال چھوٹی نجمہ ابھی فرسٹ ایئر میں تھی۔ ذہین ہونے کے ساتھ پڑھائی میں بھی بہت اچھی تھی۔ امتیاز نوکری پر تیار نہیں ہوا۔ یہ نوکری نجمہ کے نصیب میں تھی۔ اسے کرنی پڑی۔

نجمہ کم عمری سے ہی گھر سنبھالنے میں جت گئی۔

☆☆☆

نجمہ نے نوکری کے ساتھ پرائیویٹ انٹر کرلیا اور بی اے کی تیاری شروع کر دی۔ نجمہ ابتدائی طور پر باری باری خواتین کے کٹنگ۔ ڈیزائننگ۔ اسٹچنگ اور کوالٹی سیکشن سمیت مختلف شعبوں میں چند مہینوں کے لیے تعینات کیا گیا۔ نجمہ نے دل لگا کر کام کیا۔ کام سیکھتے سیکھتے چند سالوں میں اپنی ایمانداری اور محنت سے ترقی کرتے ہوئے سپروائزر اور پھر فلور انچارج کے عہدے پر فائز ہو چکی تھی۔ ترقی کے ساتھ تنخواہ میں بھی معقول اضافہ ہو چکا تھا۔

نجمہ کی کمائی سے گھر چل رہا تھا۔ اس دوران امتیاز نے اپنی روش نہیں بدلی۔ نشہ کے ساتھ چھوٹی چھوٹی وارداتیں اور چوریاں بھی کرنے لگا۔ دوست یار پیچھے

چلانے والے اور شوقین مزاج تھے۔ مختلف گینگ اور لینڈ مافیا کے لیے کام کرتے۔ گھومنے پھرنے کا بھی بہت شوق تھا۔ مزاروں اور آستانوں پر جانے کے شوقین۔ شہر سے دور مزاروں پر جمعرات والے دن قوالی دھمال کی روحانی محفل منعقد کی جاتی ہے۔ جس کی آڑ میں سارے شہر کے چرسی اکٹھے ہوتے۔ دل کھول کر منشیات کا استعمال کیا جاتا ہے۔ نجانے منشیات کی روک تھام والے ادارے اور پولیس کہاں ہوتے ہیں۔

ان مزاروں پر کھلے عام نشہ کرنے والے نشئی مجذوب کے بھیس میں مستقل بنیادوں پر یہیں دن رات پڑے رہتے۔ مفت میں قیام اور لنگر کی سہولت۔ امتیاز کے دوست بھی دو تین دن کے لیے گھر سے نکل کھڑے ہوتے۔ عرس وغیرہ کی تقریبات میں کئی کئی دن گھر سے غائب رہتے۔ ان ہی دنوں جرائم پیشہ افراد کے خلاف آپریشن شروع ہوا تو بڑے بڑے مگرمچھ یا تو مارے گئے اور کچھ پکڑے جانے پر جیلوں میں بند یا انڈر گراؤنڈ زیر زمین چلے گئے۔ امتیاز جیسے طفیلیوں کا خرچا پانی بند ہوگیا۔ امتیاز نے کچھ دن تو صبر کیا۔ دوستوں وغیرہ سے ادھار لیا مگر اس کے دوست بھی اس جیسے کنگلے ہی تھے۔ لہٰذا امتیاز نے اپنے نشہ پانی کے بندوبست کے لیے گھر سے پیسے مانگنے شروع کردیے۔

☆☆☆

نجمہ کی شادی کی عمر تھی۔ ماں نے رشتے دیکھنے شروع کر دیے۔ انہی دنوں نجمہ کی زندگی میں ایک حسین موڑ آیا۔

یہ گارمنٹ فیکٹری ایک مکمل یونٹ تھی۔ پرانی اور مستحکم۔ زیادہ تر کاروبار اور مال کی تیاری کے آرڈر بیرون ممالک سے آتے تھے۔ انہی دنوں ایک نیا سپروائزر ڈیزائننگ کے شعبے میں آیا۔ اچھا خوش شکل اور پڑھا لکھا نوجوان۔ خواتین سے شائستہ زبان اور بڑے احترام سے پیش آتا۔ شہزادہ نامی اس سپروائزر کی آنکھوں میں اپنے لیے پسندیدگی محسوس کر کے نجمہ کے دل میں گھنٹیاں سی بجنے لگی تھیں۔ اس فیکٹری میں بے شمار خواتین کام کرتی تھیں جن میں اکثریت نوجوان لڑکیوں کی تھی۔ نجمہ کی طرح کم عمر اور نوکری کے لیے گھر سے مجبور نکلنے والی۔ یا کچھ لڑکیاں جان پہچان والے کی سفارش پر شوقیہ نوکری پر لگ گئیں۔ ان میں سے کچھ خوش رنگ تتلیوں کی طرح اڑنا پسند کرتی تھیں۔ اوقات سے زیادہ میک اپ سوا لیے۔ اونچی ایڑی والے

جوتے۔ تنگ قمیصوں کے کمر تک اونچے چاک، گلے سے سر عجیب و غریب ہیئر اسٹائل اور میک اپ سے مرصع فیشن زدہ چہرے۔ مگر ان نادان بچیوں کو کون سمجھائے۔ سر ننگا اور اونچی ایڑی والی جوتی پہن کر تو ان کی چال ہی بدل جاتی ہے۔ ان کی یہ حرکتیں جسموں اور نظروں پر بد فطرت بھنوروں کو دعوت دیتی ہیں۔ شرم و حیا ان کی کا مذاق اڑانا تو ادنیٰ بات ہے۔ ان میں شامل تھی۔
فہرست میں نجمہ کی ہم عمر دوست فریدہ بھی شامل تھی۔
فیکٹری کے مردانہ سیکشن میں بھی کام کرنے والے نوجوان لڑکوں کی ایک بڑی تعداد تھی۔ کچھ کا تعلق اس شہر سے اور کچھ مختلف علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ ایک جگہ کام کرتے ہوئے آپس میں واقفیت ہو ہی جاتی ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ کئی جان پہچان بھی شناسائی میں بدل جایا کرتی۔ ایسے میں اکثر شفٹ ختم ہونے کے وقت گیٹ پر کئی بائیک والے پک اینڈ ڈراپ کے بہانے ادھر ادھر ملنے کے بہانے ڈھونڈ لیتے۔

☆☆☆

ہمارے معاشرے میں اچھے برے لوگ موجود ہیں۔ دو متوازی دھارے ساتھ ساتھ چل رہے ہیں۔ ایک طرف بنیادی تربیت کی خامیوں کے ساتھ زوال پذیر معاشرہ جس میں دہشت، بے ایمانی، دھوکا اور جھوٹ شامل ہے اور دوسری طرف اصول پسند، ایماندار اور اللہ سے ڈرنے والے لوگ ہیں۔ اس فیکٹری میں بھی یہی دو نظام چل رہے تھے۔
وسیع و عریض فیکٹری کا کل رقبہ جس میں داخلے کے لیے دو راستے تھے۔ مرکزی گیٹ سے داخل ہوتے ہی مختلف انتظامی امور کے شعبے شروع ہو جاتے۔ جن میں آفس وغیرہ شامل تھے پھر پروڈکشن۔ پیکنگ۔ خواتین اور مردوں کا سیکشن اور آخر میں جا کر گودام۔ ویئر ہاؤس۔ اسکریپ یارڈ اور فیکٹری کا ایکسپورٹ ڈپارٹمنٹ۔ یہاں سے پھر آخر میں گیٹ نمبر دو جہاں ویئر ہاؤس سے مال لوڈ کر کے روانہ کیا جاتا۔ گیٹ نمبر دو کے ساتھ ہی سیکیورٹی والوں کی رہائش گاہ تھی۔ دونوں گیٹ کے بیچ والے حصے میں فیکٹری کی عقبی دیوار کے ساتھ خواتین اور مردوں کے لیے الگ الگ کینٹین۔ چینج روم، لاکرز اور واش روم کی سہولیات شامل تھیں۔ یہی وہ جگہ تھی جہاں مرد و خواتین آسانی سے ایک دوسرے کے ساتھ ملتے تھے گپ شپ اور آزادی کے ساتھ بات چیت وغیرہ کر لیا کرتے۔

ہر جگہ کی طرح اس فیکٹری میں بھی چند بدکردار افراد کا ٹولا موجود تھا جو خاتون ورکرز پر بری نظر رکھتا۔ آزاد خیال خواتین کو مختلف حیلوں بہانوں سے محبت کے سبز باغ دکھا کر قیمتی تحفے تحائف یا ترقی کے لالچ دے کر کے اپنے جال میں پھنسا لیتا۔ ان ہی لوگوں میں کچھ ایسے ہی بدکردار بلکہ مفرور قاتل اور جرائم پیشہ افراد کی فیکٹری میں آمد ہوئی جنھوں نے کچھ عرصے بعد مجبوری قانون کی نظر سے بچنے کے لیے شرافت کا لبادہ اوڑھ رکھا تھا۔ یہ افراد اب لوگ مزدور پیشہ افراد کے روپ میں فیکٹری میں گھل مل گئے مگر کچھ وقت گزرنے کے ساتھ ان مافیا نے بہت جلد اپنے بھائی بندوں کو پہچان لیا اور بہت جلد فیکٹری کے بدکردار افراد سے ان کی شناسائی ہوگئی۔ ان جرائم پیشہ افراد کی آمد سونے پر سہاگا ثابت ہوئی۔ پہلے تو خواتین میں صرف محبت۔ دوستی۔ باہمی رضامندی اور لالچ کے نام پر کارروائیاں جاری تھیں لیکن ان جرائم پیشہ افراد نے آتے ہی اپنے شیطانی مقاصد کی تکمیل کے لیے نت نئے گھناؤنے طریقے متعارف کروا دیے۔ اب خواتین سے دوستی کے بہانے ان کی وڈیو بنا کر بلیک میل کیا جانے لگا۔ بعد ازاں ان خواتین کو مجبور کر کے دوسری خواتین کو بھی جال میں پھنسانے کا کام لیا جاتا۔ پہلے یہ کام فیکٹری کے باہر انجام دیے جاتے مگر اب ان مذموم کارروائیوں کا دائرہ خاموشی سے فیکٹری کے اندر بھی پھیلتا جا رہا تھا۔ یہ لوگ مزدور یونین سے لے کر انتظامیہ تک میں شامل تھے اور اتنے بااثر تھے کہ ان کی ایک آواز پر پوری فیکٹری میں ہڑتال اور کام بند ہو جاتا۔
ان ہی دنوں فیکٹری میں ایک افسوس ناک واقعہ وقوع پذیر ہو گیا۔ فیکٹری کے اندر ایک خاتون ورکر کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی کوشش کا واقعہ پیش آگیا۔ یہ خاتون ورکر نجمہ کی شفٹ میں اس کے ماتحت کام کرتی تھی۔ شام پانچ بجے شفٹ ختم ہونے کے بعد اسے ایک اور خاتون ورکر کے ساتھ کینٹین کی طرف جاتے دیکھا گیا تھا۔ پچیس چھبیس سالہ خاتون ورکر نے چند مہینے پہلے نوکری جوائن کی تھی۔ آج کل کام کا لوڈ زیادہ تھا۔ اکثر لوگ ضرورت کے حساب سے اوور ٹائم پر رک جاتے۔ نجمہ بھی چھٹی کے بعد گھنٹا دو گھنٹا لیٹ ہو جایا کرتی۔ آج بھی دیر ہو چکی تھی کہ یہ افسوسناک خبر ملی۔

☆☆☆



خاتون خستہ حالت میں ایچ آر ڈیپارٹمنٹ میں انتظامیہ کے سامنے رو رو کر اپنی کہانی سنا چکی تھی۔ خاتون ورکر کے بے روزگار بھائی کو نوکری کی ضرورت تھی۔ آج ڈیوٹی ختم ہونے کے بعد انہیں کینٹین کے نزدیک کسی شخص سے ملنا تھا۔ بقول متاثرہ خاتون وہ صاحب کمپنی کی گاڑی میں وہاں پہنچے۔ خاتون کا مسئلہ سننے کے بہانے گاڑی میں بٹھا لیا۔ دوسرے گیٹ کے پاس پہنچ کر وہاں سے سیکیورٹی گارڈز کی رہائش گاہ کے ایک کمرے میں لے جا کر بٹھایا گیا۔ کچھ دیر بعد ان صاحب کے ساتھ مزید دو لوگ وہاں داخل ہوئے اور خاتون سے مبینہ زیادتی کی کوشش کی۔ خاتون کے شور مچانے پر تشدد کیا گیا۔ خوش قسمتی سے اسی وقت وہاں سیکیورٹی انچارج راؤنڈ لگانے پہنچ گئے۔ انہوں نے شور کی آوازیں سن کر موقع پر خاتون کو بچایا۔ زیادتی کی کوشش کرنے والے افراد فوراً وہاں سے رفو چکر ہو گئے مگر ان کی شناخت ہو چکی تھی۔ یہ وہی گینگ تھا جو فیکٹری میں خواتین کو ہراساں اور بہلا پھسلا کر اپنے گھناؤنے مقصد کی تکمیل کرتا تھا۔ سیکیورٹی انچارج نے پولیس کو اطلاع دینے سے قبل انتظامیہ کو مطلع کر دیا تھا۔ اس موقع پر انتظامیہ کا ارادہ تھا معاملے کو اندرون خانہ سلجھانے کا تاہم متاثرہ خاتون کی ساتھی دوسری خاتون کا کردار بھی کچھ مشکوک تھا جو مسلسل متاثرہ خاتون کو اس معاملے کو دبانے کا مشورہ دے رہی تھی۔

☆☆☆

اس حادثے کو ایک ہفتہ گزر چکا تھا۔
کمپنی نے ملزمان کو نوکری سے برخاست کر کے متاثرہ خاتون کو بطور ہرجانہ کچھ زرِ تلافی اور بھائی کو نوکری کی پیشکش کی۔ خاتون نے اپنی بچی کے رونے کو دیکھتے ہوئے اپنی زبان بند رکھنے میں ہی عافیت محسوس کی مگر اگلے ہفتے وہ خاموشی سے نوکری چھوڑ کر جا چکی تھی۔ یہ بات مشتہر ہونے سے چھپا لی گئی تھی مگر کچھ ہی دنوں بعد کسی نامعلوم مقام پر ایک خاتون کو زیادتی کا نشانہ بنانے کی وڈیو سوشل میڈیا پر وائرل ہوئی۔ وڈیو ایڈٹ کی گئی تھی جس میں خاتون کا چہرہ تو بالکل صاف پہچانا جا رہا تھا مگر زیادتی کرنے والے ملزمان نظر نہیں آ رہے تھے۔
چند دن بعد وڈیو والی خاتون نے خودکشی کر لی۔
خودکشی کرنے والی متاثرہ ورکر تھی جو نوکری چھوڑ کر جا چکی تھی۔ نجانے کیسے یہ وڈیو لیک ہوئی۔ ایک انسانی حقوق کی تنظیم کو اس کیس کی بھنک پڑی تو وہ کڑی سے کڑی ملاتی گارمنٹ فیکٹری تک پہنچ گئی۔

☆☆☆

نجمہ کو اس خاتون ورکر کی موت کا بہت دکھ تھا۔ وہ اس کی موت کی افسوسناک وجوہات جانتی تھی مگر کچھ کر نہیں سکی۔ صرف انتظامیہ اور مزدور یونین ہی اس مسئلے پر کچھ کر سکتی تھی مگر وہ تو خود ان کارروائیوں میں ملوث تھے۔ فیکٹری میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ ملزمان کو نکالا جا چکا تھا۔ کوئی ثبوت نہیں تھا۔ مزدور یونین نے دکھاوے کے لیے کچھ احتجاج کرنے کی کوشش کی مگر انتظامیہ نے ان کو اپنے مخصوص طریقے سے سنبھال لیا۔ انسانی حقوق کی تنظیم کو فیکٹری انتظامیہ سے کچھ معلوم نہ ہو سکا۔ اصل میں یہ بات نہ تو متاثرہ خاتون نے کسی کو بتائی تھی نہ ہی ملزمان نے وڈیو میں کوئی سراغ چھوڑا تھا۔ یہ خاتون ورکر چونکہ نجمہ کی شفٹ میں تھی لہٰذا مزدور یونین کے ذمہ داروں کے ساتھ انسانی حقوق کی نمائندہ ترجمان نے نجمہ سے بھی رابطہ کیا۔ کچھ سوالات پوچھے اور نجمہ کو اپنا کارڈ دیا کہ اگر اس حادثے میں کوئی بھی سراغ ملے تو دیے گئے نمبر پر پوری رازداری سے تمام حالات سے باخبر کرے۔
ان ہی دنوں شہزاد نامی سپروائزر اور نجمہ نزدیک آ چکے تھے۔ شہزاد نے نجمہ سے اپنی محبت کا اظہار کر دیا اور جلد ہی وہ اپنی والدہ کو نجمہ کے گھر بھیجنے والا تھا۔ نجمہ نے فیکٹری میں ہونے والے اس افسوسناک واقعے کا ذکر شہزاد سے کیا تو اس نے نجمہ کو اس معاملے سے الگ رہنے کا مشورہ دیا تھا۔ نجمہ نے بھی انتظامیہ کی ہدایت پر چپ سادھ لی۔ جبکہ وہ اصل حقیقت جانتی تھی۔
فریدہ اور نجمہ آپس میں بچپن سے تھیں۔
نجمہ سینئر تھی مگر ایک محلے میں ہونے کے باعث ان کی دوستی تھی۔ فیکٹری میں اکثر اکٹھے آیا جایا کرتے۔ نجمہ کی شہزاد میں دلچسپی اس کی نظروں سے چھپی نہیں رہ سکی مگر نجمہ کو اندازہ نہیں ہوا کہ فریدہ بھی اندر ہی اندر شہزاد کو پسند کرتی تھی۔

☆☆☆

کچھ ہی دن بعد ایک عجیب بات ہوئی۔
خاتون سے زیادتی کیس کے جن ملزمان کو کمپنی نے فارغ کر دیا تھا وہ حیرت انگیز طور پر دوبارہ نوکری پر بحال ہو چکے تھے۔ نجمہ ان ملزمان کو جانتی تھی۔ ان میں سے ایک

مردوں سے فیکٹری کے باہر مل رہی ہے اور دوسری طرف بدکردار ٹولے کو نجمہ کے گھر کے تمام حالات اور نشے کے عادی امتیاز کو مہرہ بنائے جانے کے اقدامات سے باخبر کر دیا۔ اب یہ گینگ فریدہ اور امتیاز کو آلۂ کار بنا کر نجمہ کو اپنے خلاف ہونے والے تمام اقدامات کی سزا دینا چاہتا تھا۔

گینگ کے افراد مختلف بہانوں سے امتیاز سے ملے اور اس کو نشہ پانی کے لیے اخراجات اور منشیات فراہم کیں۔ فریدہ نے امتیاز کو بتایا تھا کہ نجمہ فیکٹری میں غیر مردوں سے ملتی ہے اور وہ مرد اب اس کو گھر تک چھوڑنے آتے ہیں۔ امتیاز کی رگوں میں منشیات کے ساتھ اب کانوں میں فریدہ کی سازشوں کا زہر بھی دوڑ رہا تھا۔ سازش کا نشہ دو آتشہ تھا۔ بہن کو اسٹاپ تک چھوڑنے کے لیے تو صبح اٹھ نہ سکا مگر فریدہ کے بہکانے میں آکر اس نے خاموشی سے نجمہ کی نگرانی شروع کر دی۔

گھر سے بس اسٹاپ تک کا فاصلہ اچھا خاصا تھا۔ تقریباً دس منٹ پیدل چلنا پڑتا تھا۔ امتیاز نے دو تین دن نجمہ کا پیچھا کیا تو اس کو فریدہ کی بات سچ نظر آئی۔ کچھ لوگ نجمہ کو گھر تک چھوڑ کر آتے اور لے جاتے تھے۔ یہ وہی وقت تھا جب وہ بدکردار نوجوان نجمہ کو ہراساں کرنے کے لیے اس کا روزانہ پیچھا کرتے تھے مگر اب ایک دو دن سے انہوں نے جان بوجھ کر فقرے بازی اور چھیڑ چھاڑ بند کر دی تھی۔ خاموشی سے پورا راستہ ایسے آگے پیچھے چلتے جیسے برسوں کی شناسائی ہو۔ فریدہ کی سازش تھی۔ امتیاز کو یقین دلانا تھا کہ نجمہ اپنی مرضی سے ان لوگوں کے ساتھ آتی جاتی ہے۔ نجمہ بیچاری برداشت کر رہی تھی۔ بھائی نے تو غیرت نہیں دکھائی۔ اس نے شہزاد کو فون کر کے صورت حال بتائی۔ شہزاد نے واپس لوٹنے تک نجمہ کو چند دن احتیاط سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ شہزاد کی والدہ کی طبیعت کچھ خراب تھی۔ ڈاکٹر نے فی الحال اس ہفتے انہیں سفر سے منع کیا تھا۔ شہزاد کو اگلے ہفتے پھر پوری امید تھی کہ ڈاکٹر کی طرف سے سفر کی اجازت مل جائے گی۔ شہزاد نے نجمہ کو چھٹی لے کر گھر بیٹھ جانے یا پھر ان بدمعاشوں کو نظرانداز کرنے کا مشورہ دیا تھا۔

☆☆☆

امتیاز کچھ دنوں سے خاص قسم کا نشہ کر رہا تھا۔ مہربان دوستوں کی مہربانی تھی۔ سارا دن سرور میں گزر جاتا۔ رات کو اٹھ کر نشے کی طلب بڑھ جاتی۔ ایک دو دن سے وہ اجنبی مہربان دوست بھی نظر نہیں آ رہے تھے جو اس کو نشہ فراہم کرتے تھے۔ اس دن امتیاز کا نشہ ٹوٹ رہا تھا۔ جسم بے جان ہوتا ہی جا رہا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پورا جسم ابھی بکھر جائے گا۔ دو قدم چلنا بھی دشوار نظر آتا۔ اس نے گھر سے ادھر ادھر سے کچھ پیسے حاصل کیے تھے۔ امتیاز جس خاص قسم کے نشے کا عادی ہو رہا تھا۔ اس نشے کے آگے ان پیسوں سے ملنے والے عام نشہ کا کچھ خاص اثر نہیں ہو رہا تھا مگر بہرحال کچھ گزارا ہو رہا تھا۔ امتیاز اگر کچھ دن اور یہ خاص نشہ استعمال کر لیتا تو اس پر اب باقی تمام نشے پانی ہونے والے تھے۔ وہ بے چین ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا کہ وہی اجنبی دوست نظر آ گئے۔ پھر سے کچھ دن کی خوراک مل گئی۔

اگلی شام فریدہ اور امتیاز کی ملاقات ہوئی تو اس نے امتیاز سے لگاوٹ کا اظہار کر کے کچھ فرمائش کر دی۔ ایک نشئی شخص کو کوئی لڑکی کیا منہ لگاتی۔ فریدہ جیسی طرح دار نے بڑے انداز کا جال بچھایا تو اس کا جادو سر چڑھ کر بولنے لگا۔ نشے کے عادی امتیاز کا دماغ ساتویں آسمان کی سیر کر رہا تھا۔ فریدہ کی خواہش پوری کرنے کے لیے آج صبح امتیاز نے گھر میں ماں اور بہن سے ایک بڑی رقم کا تقاضا کر دیا۔ نجمہ نے پہلی دفعہ امتیاز کو سختی سے مزید پیسے دینے سے انکار کر دیا تو امتیاز نے آج پھر ہاتھ اٹھا لیا۔ نجمہ نے بار بار کہا کہ امتیاز کو گھر بیٹھ کر روٹیاں توڑنے اور اپنی محنت اور حق حلال کی کمائی برباد کرنے کے طعنے دیے۔

فریدہ امتیاز کے کان بھر کر نجمہ کے غیر مردوں کے ساتھ تعلقات کی جھوٹی کہانی گوش گزار کر چکی تھی۔ فریدہ کی گھڑی ہوئی کہانی پر امتیاز نے من و عن یقین کر لیا تھا۔ امتیاز کی آنکھوں پر پٹی بندھ چکی تھی۔ فریدہ کے تیر کارگر تھے۔ نجمہ کے غیرت دلانے پر امتیاز نے غصے میں بے قابو ہو کر نوکری کے بہانے عیاشی اور غیر مردوں سے تعلقات کے نتیجے میں حاصل ہونے والی حرام کی کمائی کا جوابی طعنہ دیا۔ امتیاز نے بہن سے پوچھے بغیر بلا تحقیق جھوٹی تہمت لگا کر نجمہ کو گھر بیٹھنے کا حکم سنایا۔ گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں اس کی ٹانگیں توڑنے کی دھمکی دی۔

نجمہ تو خود چھٹیاں لینا چاہ رہی تھی مگر اگلے ہفتے ایک بڑا آرڈر بھجوانا تھا اس لیے آج نجمہ کو لازمی فیکٹری جانا تھا۔ ضروری کام نہ ہوتا تو شاید وہ آج نہ جاتی۔ نجمہ چھٹیاں نہیں لے سکتی تھی۔ اس نے فیکٹری جانے کا فیصلہ کر لیا۔

صبح کے واقعے کے بعد امتیاز بھی کب کا غصے میں گھر



سے باہر نکل آیا تھا۔ یونہی ادھر ادھر پھرتا رہا۔ نشے کی طلب ہو رہی تھی۔ جسم ٹوٹ رہا تھا۔ گھر سے کچھ دور پھر اکڑ کی کے پاس وہی دو مخصوص نوجوان کھڑے نظر آئے جو کچھ دنوں سے نجمہ کے آگے پیچھے بظاہر شناسا بن کر چلتے۔ اس نشئی انسان کی اصل غیرت تو بہت پہلے مر چکی تھی مگر جھوٹی انا ابھی زندہ تھی۔ امتیاز نے اپنا شک دور کرنے کی خاطر ان نوجوانوں سے دو ٹوک بات کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ دونوں اس علاقے کے نہیں تھے۔ امتیاز نے ان سے آنے کا مقصد پوچھا۔ ان میں سے ایک نے مکروہ انداز میں نجمہ کے بارے میں انتہائی بیہودہ باتیں شروع کر دیں۔ وہ شاید کچھ مزید بکواس کرتے کہ ایک سیاہ کار وہاں پہنچی اور وہ دونوں اس میں بیٹھ کر رفو چکر ہو گئے۔

امتیاز اپنی جھوٹی انا اور غصے میں پاگل ہو کر گھر کی طرف واپس چلا۔ وہاں نجمہ فیکٹری جانے کے لیے تیار کھڑی تھی۔ امتیاز نے صحن میں کپڑے دھونے والا ڈنڈا اٹھا لیا۔ اس نے نجمہ کو گھر سے باہر نکلنے کی صورت میں ٹانگیں توڑنے کی دھمکی دی تھی۔ آج وہ غصے میں بے قابو ہو کر نجمہ کی ٹانگیں توڑ دینے والا تھا۔

☆☆☆

ہائے اللہ۔ ہائے امی! وہ درد میں ڈوبی ہوئی آواز میں چلائی۔ بس کرو بھائی۔ ہائے۔ ہائے اللہ!

معاف کرو بھائی! ہائے اللہ مر گئی امی جی!

وہ کبھی نجمہ نے بھائی کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے پھر خود کو بچانے کے لیے پورے صحن میں ادھر ادھر بھاگتی پھر رہی تھی۔ امتیاز غصے اور نشے کی طلب میں بڑی بے دردی سے کپڑے دھونے والا ڈنڈا اٹھائے اپنی بہن کو پیٹ رہا تھا۔ وہ ہوش میں ہی نہیں تھا اور معصوم بہن پر بے دریغ نہ جانے کہاں کہاں ڈنڈے برسائے چلا جا رہا تھا۔

"ہائے اللہ میری ٹانگ! ہائے اللہ۔ میری ٹانگ توڑ دی۔" اچانک نجمہ کے گھٹنے پر پڑنے والے ڈنڈے کی ضرب سے وہ زمین پر تیورا کر گری۔ امتیاز غصے میں پاگل ہو چکا تھا۔ نجمہ نے زمین پر گرتے ہی خود کو چارپائی کے نیچے چھپا لیا۔ وہ چلا چلا کر رو رہی تھی۔ ہاتھ جوڑ رہی تھی۔ دہائیاں دے کر فریاد کر رہی تھی۔ ماں نے بچانے کی کوشش کی تو اس کو بھی اس نے ایک طرف دھکیل دیا۔

امتیاز کے دھکے سے گری نجمہ کی ماں بھی بیچارگی کے عالم میں امتیاز کی منت سماجت کرنے کے بعد اب کو دل تھام کر [illegible]

مدد مانگ رہی تھی۔

اس دن اگر پڑوس سے کچھ لوگ آکر مداخلت نہ کرتے تو شاید وہ اپنی بہن کی واقعی ٹانگیں توڑ دیتا۔

☆☆☆

امتیاز غصے میں پھر گھر سے باہر نکل گیا۔ شام تک وہ گھر واپس نہیں گیا۔ نشے کی طلب اتنی بڑھ چکی تھی جس کے لیے وہ کسی کی جان تک لے سکتا تھا۔ عین اسی وقت جب وہ چکرا کر گرنے لگا تھا وہی اجنبی مہربان اس کے سامنے آ گیا۔ وہ اس کو اپنے ساتھ ایک ہوٹل پر لے گیا۔ پیٹ بھر کر کھانا کھلایا۔ من پسند خوراک کے ساتھ من پسند نشہ بھی دیا۔

اجنبی نے امتیاز کی پریشانی کی وجہ پوچھی۔ امتیاز نے گھر کے اندرونی حالات بتا دیے۔ مہربان شخص نے امتیاز کے اقدام اور جھوٹی غیرت کی خوب حمایت کی۔ اس نے امتیاز کے ہر صورت اپنی بہن کو گھر سے باہر نکلنے دینے کے فیصلے کی بھی بھرپور تائید کی۔ اجنبی مہربان نے امتیاز کو مشورہ دیا کہ وہ حریت شک میں پڑے بغیر اپنی بہن کو گھر بٹھا لے۔ غیروں کی آواز پر کان دھرنے والا امتیاز بدبخت شاید نہیں جانتا تھا کہ یہ وہی چھوٹی بہن تھی جو کم عمری میں اپنے حسین خواب جلا کر دن رات محنت کا تاج سر پر سجا کر عزت کی روٹی کما رہی تھی اور آج یہ امتیاز نشئی بھائی اس پر تہمت لگا رہا تھا۔ اجنبی مہربان شخص نے آج بڑی فیاضی کے ساتھ امتیاز کو جو رقم اور نشے کی خوراک عنایت کی تھی یہ کم از کم پورے ہفتے کے لیے کافی تھی۔ امتیاز آج رات گھر نہیں گیا۔ بلکہ گھر جانے سے پہلے ایک آخری فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

نجمہ کو سخت چوٹ آئی تھی۔

ماں نے ہلدی چونا دیسی علاج کر دیا اور ساتھ میں ڈاکٹر سے دوا بھی لے آئی۔ سارا دن نجمہ درد سے تڑپتی رہی۔ اس نے چھٹی میں سارا دن نکل گیا۔ فیکٹری بھی نہ جا سکی۔ دن بھر گھر پر آرام کیا مگر آج سارا دن نجمہ کو فیکٹری سے کال آتی رہی۔

پروڈکشن ہیڈ نے بار بار نہ آنے کا سبب پوچھا۔ نجمہ نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ بنایا اور صحت یاب ہوتے ہی دوسرے دن ڈیوٹی پر آنے کی یقین دہانی کروائی۔ شام کو ماں نے نجمہ کو کھانا کھلایا اور دوا دی۔ نجمہ ماں کی گود میں سر رکھ کر آرام سے سو گئی۔ ماں کی گود سے بڑھ کر سکون کہاں ملنے والا تھا۔ والدین کے اطاعت گزار لوگوں کی قسمت میں ہی ماں کی گود جیسا آرام ہوتا ہے اور نافرمان ہمیشہ اللہ کی پکڑ اور بددعاؤں کے زیر اثر زندگی گزار دیتے ہیں۔ شاید کچھ نافرمان بدنصیبوں کی قسمت میں یہ آرام نہیں ہوتا۔

ادھر اس کمبخت بھائی کا پیٹ بھرا نشہ پورا ہوا۔ رات ہوئی تو گھر جانے کا خیال آیا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ اندر صحن سے ماں کی رونے کی آواز آ رہی تھی۔ وہ جھولی پھیلا کر امتیاز کو بددعائیں دے رہی تھی۔

ماں کی دعا کو جنت کی ہوا سے تشبیہ دی جاتی ہے۔ آج وہی ماں اپنی اولاد کو جہنم کی ہولناک آگ میں ہر بار ہو جانے کی دل سے بددعا دے رہی تھی۔

جا امتیاز تو آج سے میری اولاد نہیں۔ تو گندی نالی کا کیڑا ہے۔ ہمیشہ گندی نالی میں پڑا رہے۔ اللہ تجھے برباد کرے۔ کبھی سکھ چین کی نیند نہ آئے۔ کبھی نرم بستر نصیب نہ ہو۔ تجھے قبر کی مٹی بھی نہ ملے!

امتیاز کچھ دیر کے لیے دروازے پر ہی رک گیا۔ ماں بددعائیں دیتی دیتی تھک کر چپ ہو گئی تھی۔ امتیاز گھر میں داخل ہوا تو ماں سامنے چارپائی پر بیٹھی غصے سے دیکھ رہی تھی۔ امتیاز کا پیٹ بھرا ہوا تھا۔ نشہ بھی پورا تھا۔ اس وقت وہ دنیا کا مسکین و مظلوم انسان بنا ہوا تھا۔ امتیاز خاموشی سے اپنے کمرے میں آ کر بستر پر گر گیا۔ کافی دیر ہو گئی مگر آج اس کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ ہوا کے کم دباؤ کے باعث کچھ دنوں سے بارش کی پیشگوئی تھی۔ بادل تیار تھے مگر برسنے کو تیار نہیں۔ بہرحال قدرت کا اپنا نظام ہے۔ کمرے میں حبس بڑھتا جا رہا تھا۔ گرمی کی حدت اور گھٹن سے بدحال ہو کر چھت پر آ گیا۔

کچھ دیر بعد موسم اچانک خوشگوار ہو گیا۔ ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی۔ مگر نجانے کیوں امتیاز کے اندر آگ جل رہی تھی۔ طبیعت پر چھائی حدت میں کمی نہ ہو پائی تو امتیاز گھر سے باہر نکل آیا۔ کچھ دیر سڑکوں پر مٹرگشت کرتا رہا۔ مگر یہ لگ رہا تھا جیسے سڑکوں پر تازہ تازہ تارکول ڈالا گیا ہو جس کی تپش سے آس پاس کی فضا میں بھی بھبکے دار گرمی کی لپٹیں نکل رہی ہوں۔ امتیاز کو کہیں چین نہیں مل رہا تھا۔ گرمی سے بار بار پیاس لگ رہی تھی۔ کئی بار ہوٹل سے جگ کے جگ انڈیل لیے مگر پیاس تھی کہ بجھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ آدھی رات تک ادھر ادھر مارا مارا پھرتا رہا۔

امتیاز کافی دیر سڑکیں ناپتا رہا مگر کہیں چین نہیں ملا۔ واپس گھر کی طرف لوٹتے ہوئے کچرا کنڈی کے نزدیک پہنچ کر نیند کا ایسا جھٹکا لگا کہ وہیں کچرے کے ڈھیر پر گر گیا۔ قسمت نے جہاں گرایا تھا اب وہاں سے اٹھنے کی طاقت نہیں تھی۔ وہیں پڑ کر سو گیا۔ کچرے کے ڈھیر پر نیند کی آغوش میں جانے سے پہلے ماں کی بددعائیں اس ناخلف اولاد کے کانوں میں گونج رہی تھیں۔ ایک نشئی کی قسمت میں شاید اب یہی کچھ لکھا ہوا تھا۔

☆☆☆

نجمہ آج صبح جلدی اٹھ گئی تھی۔

صبح اٹھ کر نجمہ نے ناشتا بنایا۔ بہنوں کے خمیر میں قدرتی طور پر بھائیوں کے لیے محبت ہوتی ہے۔ اس خیال



سے کہ امتیاز گھر واپس لوٹ آئے۔ بھائی کے لیے بھی دو پراٹھے ڈال دیے۔ دو دن کی چھٹی کے بعد آج اس کا فیکٹری جانا بہت ضروری تھا۔ امتیاز پرسوں رات کا گیا گھر واپس نہیں لوٹا تھا۔ دو دن جم کر خوب بارش ہوئی۔ نجمہ نے مکمل آرام کیا۔ امتیاز نے مار پیٹ کر تہمت لگائی تھی۔ جسمانی چوٹوں سے زیادہ روح پر لگنے والے زخم تکلیف دے رہے تھے مگر نجانے کیوں پھر بھی ناشتا کرتے ہوئے بھائی کی یاد آ گئی۔ دونوں ساتھ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے۔ اگر امتیاز بری صحبت میں نہیں پڑتا تو یقیناً ماں بہن کا سہارا بن کر گھر کی ذمہ داریاں سنبھالتا مگر تقدیر کا فیصلہ کچھ اور تھا۔ نجمہ کی آنکھیں ایک بار پھر نم ہو گئیں۔ نجانے یہ اپنے بھائی کی بدقسمتی پر بہنے والے آنسو تھے یا اپنی قسمت کی بے بسی پر۔ نجمہ نے ایک فیصلہ کر لیا تھا۔ نشے کے عادی افراد کی بحالی صحت و علاج کے لیے ایک ادارے کی طرف سے دیا گیا اشتہار اس کی نظروں سے گزرا تھا۔ دو دن گھر پر رہ کر اس نے ادارے سے فون پر رابطہ کر کے امتیاز کے علاج کے بارے میں ساری معلومات لے لی تھیں۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ ہر قیمت امتیاز کو علاج کے لیے آمادہ کرنے کی کوشش کرے گی مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

ماں دو دن پوری رات جاگتی رہی تھی۔ نجمہ پر جھک کر پھونکتی رہتی۔ امتیاز کی طرف سے ڈر گئی تھی۔ کل جس طرح وہ پاگل پن کی شدت سے نجمہ کو پیٹ رہا تھا، اس کی معصوم بچی پر غلط الزام لگا رہا تھا، کل بھی ماں ساری رات سو نہ سکی۔ صبح سویرے نماز پڑھ کر اب سو رہی تھی۔ نجمہ جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ نکلتے ہوئے دیر ہو رہی تھی مگر ہلدی چونے کی لیپ نے سوجن کم کر دی تھی۔ نجمہ نے ماں کو سوتا چھوڑا اور فیکٹری جانے کے لیے گھر سے نکل آئی۔

نجمہ لنگڑا کر چل رہی تھی۔ امتیاز بدبخت نے بہت زور سے ڈنڈا کھینچ کر مارا تھا۔ بس اسٹاپ کافی دور تھا۔ جب سے غنڈوں نے اس کا پیچھا شروع کیا تھا۔ نجمہ گھر سے نکلتے وقت بڑی سی چادر لپیٹے نکلی تھی۔ کچھ دور چلنے کے بعد ہی پاؤں میں سوجن بڑھ گئی۔ دو دن سے ہونے والی بارش نے نظام خراب کر رکھا تھا۔ راستے میں جگہ جگہ غلاظت کے ڈھیر۔ برساتی پانی کے ساتھ ابلتے ہوئے گٹر لائنوں کا پانی گزر رہا تھا۔ نجمہ اپنی چادر سنبھالتی پانی اور کیچڑ سے بچ کر گزرتی ہوئی کچرا کنڈی تک پہنچی تو ڈر گئی۔ ایک سیاہ کار اس کے تعاقب میں آہستہ آہستہ چلی آ رہی تھی مگر اسے نہیں معلوم تھا کہ کچھ دور امتیاز بھی فاصلہ رکھ کر نجمہ کے پیچھے چلا آ رہا تھا۔

نجمہ فیکٹری سے دو دن غیر حاضر رہی۔ اس بات سے لاعلم تھی کہ اس کی غیر موجودگی میں انتظامیہ نے خاموشی سے کارروائی کرتے ہوئے بدکار ٹولے کے ارکان کو نوکری سے برطرف کر کے بلیک لسٹ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ڈائریکٹرز کو تحقیقات کے دوران بڑے بڑے ناموں کی اس گھناؤنی کارروائی میں شمولیت کی اطلاع ملی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ چیئرمین تک بات جانے سے پہلے کمپنی کی نیک نامی کو بچانے کے لیے فوراً فیصلہ کرنا تھا۔ لہٰذا فوری طور پر جبری برطرفی کا فیصلہ کیا گیا۔

برطرف شدہ افراد سائٹ کی کسی بھی انڈسٹری میں اسکائی ڈینم انڈسٹریز کا نام استعمال کر کے نوکری حاصل نہیں کر سکتے تھے۔

فیکٹری سے بڑے ناموں کو بلا امتیاز نکال باہر کیا گیا تھا۔ وہ بدکار ٹولا برطرف کیے جانے سے پہلے کافی دن کوشش کرتا رہا کہ نجمہ اپنے سیکشن کی طرف سے دی گئی درخواست واپس لے لے۔ انہوں نے سازشیں کیں۔ ڈرا دھمکا کر کوشش کی کہ تحقیقات مکمل ہونے تک نجمہ کو اس معاملے سے دور رکھ کر فیکٹری نہ آنے پر مجبور کر دیں گے اور کل تک اپنی کوشش میں کامیاب بھی ہوئے مگر اس دفعہ بچ نہ سکے۔ بازی اچانک پلٹ گئی۔

بدکار ٹولا اپنے زخم چاٹتا رہ گیا۔

وہ سب نامی گرامی بدمعاش تھے۔ نجمہ ایک کمزور لڑکی تھی۔

مگر انہوں نے نجمہ کو سبق سکھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

☆☆☆

نجمہ کو پیچھے ہی سیاہ کار کے تعاقب کا اندازہ ہوا۔ بڑی سی چادر میں خود کو ڈھانپ کر بیچاری لنگڑاتی ہوئی حتی الامکان تیزی سے بس اسٹاپ کی طرف جانے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسٹاپ سے کچھ فاصلہ پہلے ایک ویران گلی کی بغلی سڑک پر سیاہ کار نے سامنے آ کر نجمہ کا راستہ روک لیا۔ کار سے دو افراد برآمد ہوئے۔ نجمہ ان دونوں کو اچھی طرح پہچان گئی تھی۔ یہ دونوں مسلسل کئی دنوں سے اس کا پیچھا کر رہے تھے۔ نجمہ کی ریڑھ کی ہڈی میں خوف کی سرد لہر ابھری۔ نجمہ نے دونوں افراد کی آنکھوں میں خباثت محسوس

کرلی تھی۔ آج ان کے ارادے اچھے نہیں نظر آرہے تھے۔
امتیاز دور سے یہ کارروائی دیکھ رہا تھا۔
قسمت نے بھی عجیب مذاق کیا تھا۔ ایک بھائی کو بہن کی عزت کا محافظ بن کر اس کے راستے سے کانٹے چننے کے بجائے دشمن کی اندھی چال میں پھنسا دیا تھا۔ ایک عقل کے اندھے کے لیے اپنے دور سے صورت حال کا اندازہ کرنا مشکل تھا۔ فریدہ کی پڑھائی گئی پٹی کے مطابق بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ دونوں افراد نجمہ کی مرضی سے راستے میں رک کر بات کررہے تھے مگر وہ نہایت شرافت سے نجمہ کو ذرا دھمکا رہے تھے کہ وہ خاموشی سے کار میں بیٹھ جائے ورنہ وہ زبردستی بھی کرسکتے تھے۔ وہ نجمہ سے کہیں بیٹھ کر کچھ ضروری بات کرنا چاہ رہے تھے۔ نجمہ ان کے ارادے سمجھ رہی تھی۔ اس نے کار میں بیٹھنے سے صاف صاف انکار کردیا۔
دونوں بدمعاشوں میں سے ایک نے اپنی ٹی شرٹ اوپر کی تو وہاں سیاہ ریوالور نظر آرہا تھا۔ اب وہ تیز بھی انگلیوں سے بھی نکالنے کی کوشش کررہے تھے۔ نجمہ ایک کمزور لڑکی ہی تو تھی۔ کوئی چارہ نہ پاکر ڈر گئی۔ مجبوراً کار میں بیٹھنا ہی پڑتا یا پھر چیخ پکار کرکے لوگوں کو اکٹھا کرتی۔
امتیاز دور سے تمام ماجرا دیکھ رہا تھا۔ فریدہ نے نجمہ کے بارے میں سچ کہا تھا۔ کوئی شک کی گنجائش نہیں تھی۔
نجمہ ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ اس بار دونوں افراد نے نجمہ کا ہاتھ پکڑا اور اس کو زبردستی کار میں بٹھانے کی کوشش کی۔ نجمہ بے اختیار چیخ اٹھی۔ اس نے بچاؤ کی کوشش کرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا اور مدد کے لیے چلانے لگی۔ یہ ایک سنسان گلی تھی۔ کچھ ہی دور گلی کے پول کی اوٹ لیے امتیاز نے یہ منظر دیکھا تو چونک گیا۔
یہاں تو معاملہ الٹ ہوگیا تھا۔ نجمہ مزاحمت کررہی تھی۔
امتیاز نے حیرت سے یہ منظر دیکھا۔ یہاں ایک لمحے میں بے غیرت بھائی کی غیرت شاید کچھ دیر کے لیے جاگ گئی۔
امتیاز بھاگتا ہوا نجمہ کی مدد کے لیے پہنچا مگر بہت دیر ہوچکی تھی۔ وہ بدنظر افراد نجمہ کو زبردستی کار میں بٹھانے کی کوشش کررہے تھے کہ اچانک کار کے اندر سے کسی نے نجمہ کو اندر کھینچ لیا۔ اس دوران کار کے کھلے دروازے سے نجمہ کی نظر امتیاز پر پڑی۔ نجمہ چلا چلا کر بھائی سے مدد مانگ رہی تھی۔
بچالو بھائی۔ مجھے بچالو!
امتیاز کے کانوں میں بہن کی آوازیں گونج رہی تھیں۔ بالکل ویسے ہی جیسے گزشتہ رات مار کھاتے ہوئے درد سے چلا رہی تھی۔ امتیاز کار کے نزدیک پہنچا تو کار کے کھلے دروازے کے پاس کھڑے ایک بدمعاش نے امتیاز کے پیٹ پر ایک زوردار لات چلائی کہ وہ دور پکی سڑک پر جا گرا۔ اس بدمعاش نے آگے بڑھ کر امتیاز کو ٹھوکروں پر رکھ لیا تھا۔ ذرا سی دیر میں امتیاز کا چہرہ لہو میں بھیگ گیا تھا۔ بھائی کو بیدردی سے پٹتے دیکھ کر ایک مظلوم بہن میں نجانے کہاں سے اتنی طاقت آگئی کہ اس نے غصے کی شدت سے بے تاب ہو کر کار کے اندر موجود بدمعاش کا منہ نوچ ڈالا اور موقع پاتے ہی خود کو اس کی گرفت سے چھڑا کر چیتا سے باہر نکل آئی۔ امتیاز پر ٹھوکریں برسانے والا یہ دیکھ نہیں سکا کہ نجمہ نے پکی سڑک سے بڑا پتھر اٹھا کر اس کے سر پر دے مارا تھا۔

☆☆☆

ایک نازک سی لڑکی نے بپھری ہوئی شیرنی کی طرح حملہ کیا تھا۔ وہ بدمعاش دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام کر سڑک پر بیٹھتا چلا گیا۔ نجمہ تڑپ کر بھائی کے پاس پہنچی، امتیاز کو سہارا دے کر بٹھایا اور اپنے دوپٹے کے پلو سے بھائی کے چہرے پر بہتے لہو کو صاف کرنے لگی۔ اس دوران پکی سڑک پر گزرنے والے کچھ راہگیر یہ تماشا دیکھ کر حیران ہوئے۔ اس سے پہلے کہ کچھ لوگ وہاں مدد کے لیے پہنچ پاتے۔ حالات کی نزاکت کا ادراک کرتے ہوئے ان بدمعاشوں نے ہوائی فائرنگ شروع کردی۔ نجمہ کی تمام تر توجہ بھائی کی طرف تھی۔ نجمہ کے ہاتھوں پتھر کی چوٹ کھانے والے بدمعاش نے ذرا سی دیر میں سنبھل کر پلٹ کر وار کیا اور نجمہ کی کنپٹی پر اپنے ریوالور کی دستے سے ضرب لگائی۔ ضرب زوردار تھی۔ بھائی کو سہارا دینے کی کوشش کرتی نجمہ اب خود بے سہارا ہو کر زمین پر ڈھے گئی۔ دونوں غنڈوں نے ہوائی فائرنگ کرتے ہوئے آس پاس کے راہگیروں کو ڈرا کر دور بھگا دیا اور نجمہ کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اس کو گھسیٹتے ہوئے کار میں ڈال دیا۔ زمین پر گھسٹتے ہوئے نجمہ کی بند ہوتی ہوئی آنکھیں بیچارگی سے بھائی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ یہ آخری بار تھا جب امتیاز اور نجمہ نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں لاچار بھائی بہنوں کی آنکھیں چار ہوئیں تو ایک بدبخت شقی بھائی کی لہو سے بھیگی اور کھلی آنکھوں سے بہنے والے آنسوؤں کی نمی میں ایک غیرت مند بہن کے



کردار پر لگی تہمت تو دھل گئی تھی مگر بدقسمت بھائی کو یہ احساس ہوتے بہت دیر ہوچکی تھی۔ نجمہ کو کار میں زبردستی ڈال کر وہ دونوں لفنگے بھی تیزی سے سیاہ کار میں بیٹھے اور یہ جا وہ جا۔
اغوا کرنے والی سیاہ کار اپنے نام کی طرح سیاہ کار نکلی۔ نجمہ کی قسمت پر دھول اڑاتے ہوئے وہاں سے کسی انجانی منزل کی طرف رواں دواں ہوگئی۔ زمین پر خاک چاٹتے ہوئے امتیاز کے چہرے پر اس دھول نے کالک مل دی تھی۔ اب یہ دھول ساری عمر کا غبار بن کر اس کی زندگی پر اندھیرے کی طرح چھانے والی تھی۔

☆☆☆

امتیاز سڑک پر بے یارو مددگار پڑا تھا۔ صبح کے وقت چند راہگیروں نے آکر امتیاز کو سہارا دیا۔ ایک کے پاس پانی کی بوتل تھی۔ امتیاز کو پانی پلا کر چہرہ دھلایا۔ وہ سب امتیاز سے اس حادثے کے متعلق سوالات پوچھ رہے تھے۔ امتیاز کے پاس ان کے بے تحاشا سوالات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اغوا کی اس واردات کے دوران کسی نے 15 پر اس حادثے کی فوری اطلاع دے دی تھی۔ کچھ دیر بعد ایک پولیس موبائل آن موجود ہوئی۔ لوگوں کو اپنے اپنے کام پر جانا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مجمع چھٹ گیا۔ امتیاز اکیلا رہ گیا۔ پولیس نے اغوا کی مکمل تفصیلات حاصل کرنے اور امتیاز کی مدعیت میں ایف آئی آر درج کروانے کے لیے امتیاز کو موبائل میں بٹھا کر متعلقہ نزدیکی پولیس اسٹیشن لے جانے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

نجمہ صبح ماں کو سوتا چھوڑ گئی تھی۔ ماں کی نیند خراب نہیں کرنا چاہتی تھی۔ ویسے رات کو ہی اس نے ماں سے اشارتاً طبیعت بہتر ہوجانے کی صورت میں فیکٹری جانے کا ذکر کردیا تھا۔ ماں فجر کی نماز پڑھ کر سوئی تھی کہ ایک دم نیند سے جاگ اٹھی۔ وہ دل سے امتیاز کی طرف سے ڈری ہوئی تھی۔ برے برے خیالات آتے۔ وہ ڈر رہی تھی کہ امتیاز دوبارہ نجمہ پر ہاتھ نہ اٹھائے۔ ابھی نیند میں تھی کہ نجمہ کے متعلق بہت برا خواب دیکھ کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔ ماں کا دل گھبرا رہا تھا۔ اٹھ کر دیکھا تو نجمہ کی مسہری خالی تھی۔ پورے گھر میں تلاش کرلیا۔ باورچی خانے میں آکر دیکھا تو ناشتا تیار تھا لیکن نجمہ آج صبح سویرے ہی فیکٹری چلی گئی تھی۔ امتیاز بھی واپس نہیں آیا تھا۔ ماں کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ ناشتا بھی کرنے کا... دل کہیں چاہ رہا تھا۔ آج سے کچھ دن پہلے تک نجانے کیوں ایسی گھبراہٹ بھی نہ ہوئی تھی۔ ماں نجمہ کے لیے دعائیں کرتی ہوئی پھر سے سونے کے لیے لیٹی مگر نیند آنکھوں سے کوسوں دور تھی۔
ماں کا دل صبح گھبرا رہا تھا۔ وہ بدمعاش نجمہ کو اغوا کرکے سائٹ ایریا کے ایک ویران گودام کے پلاٹ پر لے آئے تھے۔ یہ گودام برسوں سے خالی پڑا تھا۔ اس پلاٹ پر دو پارٹیوں پر ملکیت کا تنازعہ تھا۔ یہاں ان بدمعاشوں کے جیسے ہی کچھ ساتھیوں کی ڈیوٹی تھی۔ یہ مسلح افراد دونوں پارٹیوں میں سے ایک طاقتور گروپ کے ایما پر اس پلاٹ پر عدالتی کارروائی کے نتیجے تک قبضہ کیے بیٹھے تھے۔ نجمہ

افلاطون نے ایک بڑی تقریب منعقد کی اور اس میں اپنے ہم عصر بڑے لوگوں کو دعوت دی۔ یہ بڑے لوگ علم وفضل میں اپنا جواب نہ رکھتے تھے۔ انہی میں دیو جانس کلبی بھی شامل تھا۔ دیو جانس استغنا اور بے نیازی کا پیکر تھا۔ اسے چار دیواروں والے مکانوں سے چڑ تھی۔ وہ کہتا تھا: "جب سے انسان نے اپنے آپ کو ان مکانوں میں قید کرلیا ہے، اس کی جملہ فطری صلاحیتیں بھی ختم ہوتی جارہی ہیں۔"
چنانچہ اس نے اپنی رہائش کے لیے ایک بڑا سا صندوق بنوا کر اس میں پہیے لگوا لیے تھے۔ دن بھر اسے کھینچتا رہتا اور جہاں رات ہوتی اسی صندوق میں لیٹ کر رات گزار دیتا۔ غذا میں ہر چیز بھی استعمال کرتا یہاں تک کہ گوشت بھی کچا ہی کھاتا تھا۔ چنانچہ ایک ایسے بے فکر اور آزاد منش شخص کو جب افلاطون نے اپنے گھر مدعو کیا تو دیو جانس گرد و غبار میں اٹے ہوئے پیر افلاطون کے ہاں بچھے قالینوں سے رگڑنے لگا۔ افلاطون اس کے استقبال کو آگے بڑھا اور نہایت خندہ پیشانی سے دریافت کیا۔ "آؤ میرے دوست! لیکن تم یہ کیا کررہے ہو؟"
دیو جانس کلبی نے حقارت اور رعونت سے جواب دیا۔ "افلاطون کے تکبر اور غرور کو اپنے پیروں سے مسل رہا ہوں۔"
افلاطون نے فوراً جواب دیا۔ "میرے دوست! کیا تم نے غور کیا کہ تم یہ کام کس تکبر اور غرور سے انجام دے رہے ہو؟"

بچاری کو یہاں لایا گیا تھا۔ صبح سے شام ہوگئی تھی۔ نجمہ ایک کمرے میں قید تھی۔ اس ویران پلاٹ پر اس کی چیخ و پکار سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔ رات ہوئی تو درندوں کا گھناؤنا کھیل شروع ہوا۔ شراب کے نشے میں بدمست ان بدکردار شیطانوں نے ایک معصوم لڑکی کی عزت کو تار تار کر دیا۔ نجمہ رو رو کر دہائیاں دیتی رہی۔ ہاتھ پیر جوڑتی رہی۔ گودام کی چار دیواری میں چاروں طرف اپنی جان اور عزت بچانے کی خاطر مدد طلب کرتی رہی مگر ان نشے میں چور درندوں پر کوئی اثر نہ ہوا۔ انہوں نے اپنے بے کس شکار کو خوب تھکایا پھر بے بس کر کے اپنے خونی پنجوں سے اس کی بوٹی بوٹی نوچ لی۔

دو دن اور دو راتیں مار پیٹ، جبری عصمت دری کے اس شیطانی کھیل میں گزر چکی تھیں۔ ایک معصوم لڑکی کو سچ کے سامنے کھڑا ہونے اور مزدور خواتین پر جنسی ہراسانی کے خلاف احتجاج کرنے کی سزا مل رہی تھی۔ جس معاشرے میں جنگل کا قانون ہو وہاں کمزوروں کی فریاد کون سنتا ہے۔ انصاف کے نعرے تو بہت لگتے ہیں مگر انصاف دینے والے ہمیشہ طاقتور کا ساتھ دے کر بک جایا کرتے ہیں۔ نجمہ کی سزا ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ مگر زندگی کی مہلت ختم ہو چکی تھی۔ تیسرے دن کی شام ان درندوں کا کھیل شروع ہوا تو رات تک نجمہ بھی زندگی کی قید سے آزاد ہو چکی تھی۔

☆☆☆

پولیس نے روایتی طور طریقے آزمائے۔ امتیاز سے معلومات کی۔ ایف آئی آر بھی درج کرلی۔ اغوا کے دوران استعمال کی گئی کار کا نمبر کسی نے نوٹ نہیں کیا تھا۔ مغوی کا کچھ اتا پتا نہیں چل سکا تھا۔ امتیاز کے گھر بھی اغوا کی خبر پہنچی تو ماں غش کھا کر گر پڑی۔ پڑوسی محلے والوں نے آکر سنبھالا۔ میڈیا پر بھی اس اغوا کی تشہیر ہو چکی تھی۔ نجمہ نے جس سماجی ادارے کو فیکٹری میں ہونے والے ہراسانی کے واقعات میں ملوث افراد کی نشاندہی کی تھی۔ اس تنظیم نے بھی اس مدے کو بھرپور طریقے سے اٹھایا تو پولیس کے اعلیٰ حکام نے اسکائی ویژن کے مالک سے رابطہ کر کے انتظامیہ میں شامل چند افراد کو شامل تفتیش کر لیا۔

کڑی سے کڑی ملی تو فریدہ بھی دائرہ تفتیش میں آگئی۔ وہ زیادہ دیر دباؤ برداشت نہیں کر سکی اور اس نے سارا کچا چٹھا کھول دیا مگر دیر ہو چکی تھی۔ اس نے جن افراد کی نشان دہی کی تھی۔ فیکٹری سے ان تمام بدکردار افراد کی چند دن پہلے ہی برطرفی ہو چکی تھی۔ ان افراد کے دیے گئے موجودہ پتے جعلی ثابت ہوئے۔ یہ معاملہ میڈیا پر نمایاں ہوا تو تفتیشی اداروں کو بھی حرکت میں آنا پڑا۔ اغوا اور قتل کی اس گھناؤنی واردات میں ملوث تمام مجرمان کے شناختی کارڈ پر دیے گئے مستقل پتا جات ان کے آبائی علاقوں پر چھاپہ مارنے کے لیے متعلقہ شہروں کی پولیس سے رابطے کیے جا رہے تھے۔

امتیاز پر فریدہ کی سازش کا راز کھل چکا تھا۔ فریدہ دو دن پولیس انٹیشن کی تحویل میں تھی۔ وہ براہ راست تو اس اغوا میں ملوث نہیں تھی مگر منصوبہ بندی میں تو شامل تھی۔ امتیاز اپنی نظروں میں گر چکا تھا۔ اپنی معصوم بہن کے کردار پر شک کرتا رہا۔ نشے کی لت نے اس کو کسی کام کا نہ چھوڑا تھا۔ نجمہ کو اغوا کرنے والوں کی سازش کا مہرہ بن کر سارے گھر کا بوجھ اپنے نازک کاندھے پر اٹھانے والی باحیا باکردار بہن کی ٹانگیں توڑنے چلا تھا۔ وقت آنے پر اس چھوٹی بہن نے پتھر اٹھا کر امتیاز پر تشدد کرتے ہوئے بدمعاش کا سر پھاڑ ڈالا۔ ایک نازک سی لڑکی اور بھلا کر بھی کیا سکتی تھی۔ بہن کی بھائی کے لیے اپنی بے اختیار محبت کے والہانہ مظاہرے نے امتیاز کے دل کو چیر ڈالا تھا۔ امتیاز کی بھوک پیاس اور نیند اڑ کر رہ گئی تھی۔ بڑی مشکل سے اگر کہیں کسی کونے کھدرے میں گرتے پڑتے بھی آنکھ لگ جاتی تو بند آنکھوں کے پیچھے نجمہ کی شبیہ ابھر آتی۔ بیچاری لنگڑاتی ہوئی صبح سویرے اپنی نوکری پر جا رہی تھی۔ امتیاز کی آنکھوں کے عین سامنے اغوا ہوئی اور وہ کچھ بھی نہ کر سکا۔ امتیاز تین دن سے ادھر ادھر مارا مارا پھر رہا تھا۔ صبح شام تھانے میں حاضری دیتا مگر نجمہ کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

ان تین دنوں میں امتیاز بھی گھر نہیں جا سکا۔ گھر کے دروازے سے ہی ماں کی سینہ کوبی کرتی اور دہائیاں دیتی ہوئی آواز سن کر اس کی ہمت ٹوٹ جاتی۔ ماں روتے روتے اغوا کاروں کے ساتھ دل کھول کر امتیاز کو بھی بددعائیں دیتی۔ پورا محلہ ہی امتیاز کی ماں کی بددعاؤں کا گواہ بن چکا تھا۔ یہ آوازیں تین دن سے پورے محلے میں گونج رہی تھیں۔ نجمہ کے گھر دلاسہ دینے کے لیے آنے والوں کے کلیجے بھی ایک ماں کی دکھ بھری صدائیں سن کر دہل جاتے۔

ماں کی نظروں کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ تیسرا دن تھا۔ امتیاز دروازے سے ہی واپس لوٹ گیا۔

چوتھے دن متعلقہ تھانے کو سائٹ تھانے سے خبر ملی۔ ایک نوجوان لڑکی کی بوری بند لاوارث لاش سائٹ ایریا میں ریلوے لائن پھاٹک کے نزدیک سے ملی تھی۔ ابتدائی پوسٹ مارٹم کے مطابق لاش چوبیس گھنٹے پرانی تھی۔ موت سینہ طور پر شدید جسمانی تشدد اور اجتماعی زیادتی کی وجہ سے واقع ہوئی۔ لاش کو رفاہی ادارے کے سرد خانے میں امانتاً رکھوایا گیا تھا۔ محلے کے چند اشخاص کے ساتھ جا کر امتیاز نے سرد خانے میں لاش کی شناخت کر لی۔

وہ بدنصیب نجمہ کی لاش تھی۔

گھر تک بھی اطلاع پہنچ گئی۔ ماں تین دن سے اپنی بچی کے خیریت سے گھر واپس لوٹنے کی دعائیں مانگ رہی تھی۔ پڑوسیوں کی زبانی پتا چلا کہ اس کی معصوم بچی پر کیا قیامت گزر چکی تھی۔ ایک ستم رسیدہ ماں جو اپنی بچی کو دلہن بنا کر رخصت کرنے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس جوان بچی کی بدنصیب لاش کو دیکھا تو غش کھا کر گر پڑی۔ اور پھر دوبارہ واپس نہ اٹھ سکی۔

☆☆☆

ایک ہی گھر سے ماں بیٹی کے دو جنازے اٹھے تو محلے میں کہرام مچ گیا۔ کچھ دن بعد پولیس نے اس گینگ کے بیشتر افراد کو ان کے آبائی علاقوں سے گرفتار کر لیا۔ ان پر عدالت کی طرف سے مقدمات قائم کر کے ملزمان کو جیل بھیج دیا گیا۔ فریدہ کے خلاف کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے شک کی بنیاد پر بری کر دیا گیا۔ اس واقعے کے بعد فریدہ کے گھر والے علاقہ چھوڑ کر دوسری جگہ منتقل ہو گئے۔ بیشتر ملزمان پر کیس چلتا رہا۔ ابتدا میں کچھ ملزمان کو سزائے موت اور عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ ملزمان با اثر تھے۔ کچھ عرصے بعد نجمہ کی طرف سے مقدمے کی پیروی کے لیے کوئی سامنے نہ آیا تو ملزمان کے وکیل کی طرف سے اعلیٰ عدالتوں میں اپیلیں دائر کی گئیں۔ تاخیری حربوں، گواہان اور مکمل ثبوت کے باعث مقدمہ کمزور ہوا تو سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا۔ ملزمان کے وکیل کی پوری کوشش تھی کہ کچھ عرصے بعد ملزمان کو شک کا فائدہ دے کر بری کروا دیا جائے۔ اللہ کے گھر دیر ہے اندھیر نہیں۔ ظالموں کی ڈوری ڈھیلی کی گئی تھی مگر اللہ کی لاٹھی بے آواز ہے۔ یہ رسی اچانک کھینچ لی گئی۔ جیل کے اندر ہی دو گروہوں کی خونی لڑائی ہوئی۔ جس میں نجمہ مرڈر کیس کے مرکزی مجرم مارے گئے۔ قاتل اپنے انجام کو پہنچے لیکن اس مقدمے کے ایک ملزم امتیاز کی سزا باقی تھی۔ امتیاز کی قسمت میں ماں کی بددعا تھی۔ قدرت کی طرف سے ایک کڑی سزا اس کی منتظر تھی۔

☆☆☆

نجمہ اور ماں کے دنیا سے چلے جانے کے بعد امتیاز کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ اس کو گھر کی ویرانی سے وحشت ہوتی۔ خالی گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا۔ گھر سے باہر نکلتا تو راستہ چلتی ہر لڑکی اس کو نجمہ جیسی لگتی۔ کئی دفعہ ایسا ہوا۔ کوئی لڑکی چادر اوڑھے راستہ میں مل جاتی تو نجمہ سمجھ کر دور تک پیچھا کرتا۔ چادر میں چھپا ہوا چہرہ دیکھنے کی کوشش کرتا پھر مایوس ہو جاتا کیونکہ حقیقت یہی تھی کہ نجمہ بہت دور جا چکی تھی۔ اب پیچھے صرف اس کا سایہ اور امتیاز کے کانوں میں گونجتی آوازیں رہ گئی تھیں۔ امتیاز کی آنکھوں سے نیند روٹھ چکی تھی۔ وہ اکثر ساری رات جاگ کر گزار دیتا۔ یا پھر گھر سے باہر نکل جاتا۔ آوارہ گردی کرتا۔ پھر تھک ہار کر گھر لوٹ آتا۔ آج بڑی مشکل سے تھوڑی دیر کے لیے کچھ نیند آئی تو اپنے بستر پر گر گیا مگر فوراً ہی نیند سے بیدار ہو کر بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”معاف کر دو بھائی۔ واسطے اللہ معاف کر دو!“

کانوں میں پھر سے وہی آوازیں گونج رہی تھیں۔ امتیاز کے ہاتھوں بیدردی سے پٹنے والی نجمہ کی ہاتھ جوڑتی دہائیاں دیتی دل دہلا دینے والی چیخیں تھیں۔

ان آوازوں سے بچنے کے لیے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیتا۔ آنکھیں بند کر لیتا مگر بند آنکھوں کے پیچھے بھی دماغ کے پردوں پر ایک مظلوم بہن کی چیخیں سوار ہو جاتیں۔ نجمہ اغوا کے دوران چلا چلا کر دہائیاں دے رہی ہوتی۔

بچالو بھائی۔ مجھے بچالو!

جگر چھلنی کرتی یہ دردناک چیخیں امتیاز کو جیتے جی جہنم کی آگ میں جلا رہی تھیں۔ وہ ان آوازوں سے دور بھاگنا چاہتا تھا مگر فرار ممکن نہیں تھا۔ اب اس کی قسمت میں یہی لکھا ہوا تھا۔ اسے مرتے دم تک بھٹکنا تھا۔ نجمہ کی فریادوں کے بیچ ماں کی بددعائیں اس کے کان کے پردے چیرنے لگتیں۔ ماں نے بددعا دیتے ہوئے کہا تھا۔

وہ گندگی کا کیڑا ہے اور ہمیشہ گندگی میں رہے گا۔ کبھی نرم بستر پر آرام نہیں کر پائے گا۔ قبر کی مٹی تک نہیں نصیب

ہوگی۔ ماں کی بددعا سچ ثابت ہورہی تھی۔

کچھ دن پہلے وہ کچرا کنڈی میں گر کر وہیں سو گیا تھا۔ اب بھی گھر کے نرم بستر پر اسے نیند نہیں آرہی تھی۔ دل بے سکون اور دماغ بے چینی سے دوچار تھا۔ پورے گھر میں کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں اس کو چین آتا۔ آج بھی نیند سے جاگا تو یوں لگا کہ جیسے ماں سامنے کھڑی غصے سے انگارے برساتی آنکھیں لیے اسے گھور رہی تھی۔ دونوں ہاتھ اٹھا کر جھولی پھیلائے دل کھول کر بددعائیں دے رہی تھی۔

امتیاز نے ڈر کر آنکھیں بند کرلیں مگر ماں کی گھورتی ہوئی آنکھیں بند آنکھوں کے پیچھے بھی دماغ کے پردے پر چپک کر رہ گئی تھیں۔ یہ بددعائیں نہیں جیسے دہکتے ہوئے انگارے اور پگھلا ہوا سیسہ تھا جو کسی نے امتیاز کے کانوں میں انڈیل دیا تھا۔ امتیاز گھبرا کر گھر سے باہر نکل آیا۔ ساری رات پاگلوں کی طرح مارا مارا پھرتا رہا اور صبح کے وقت تھکا ہارا کچرا کنڈی کے پاس آکر گر گیا۔

لوگ کچرا کنڈی کے کچرے سے بچ کر چلتے ہیں۔ کچرے کی غلاظت اور بدبو کی وجہ سے یہاں سانس لینا بھی مشکل ہوجاتا ہے مگر امتیاز یہیں پڑ کر سو گیا۔ یہاں کچھ آوارہ کتے بھی سوئے ہوئے تھے انہوں نے سر اٹھا کر چند لمحوں کے لیے اپنے نئے ساتھی کو دیکھا اور اطمینان سے دوبارہ سو گئے۔ ماں کے ساتھ ہی اس کی بددعا بھی عرش تک پہنچ چکی تھی۔

☆☆☆

نورین اور اس کے گھر والوں کو محلے کی زبانی اس نشئی دیوانے کی بدنصیبی کا قصہ معلوم ہوا۔ کچرا کنڈی میں لوگ اپنے گھر کا کچرا ڈالتے ہیں۔ یہ دیوانہ پچھلے چند سالوں سے اس غلاظت کا حصہ بن کر کچرا کنڈی کا مستقل رہائشی تھا۔ پہلے بھی دو چار دفعہ اس علاقے میں کئی خواتین کو نجمہ سمجھ کر اسی طرح کی حرکت کرچکا تھا۔

حقیقت جان کر نورین ملے جلے جذبات کا شکار تھی۔ اس کو یاد آیا کہ وہ دیوانہ نجمہ کا نام لے کر نورین کے پاؤں پکڑ کر معافیاں مانگ رہا تھا۔ یعنی وہ نورین کو نجمہ سمجھ رہا تھا۔ نجمہ بھی مرنے سے کچھ دن قبل آخری دفعہ اسی طرح لنگڑاتی ہوئی گھر سے نکلی تھی۔ امتیاز غیروں کا آلۂ کار بن کر اپنی بہن پر شک کرتے ہوئے اس کا پیچھا کررہا تھا مگر حقیقت بڑی دردناک تھی۔ راز کھلا کہ ایک نشے کا عادی بھائی اپنی بہن کو درندوں کے ہاتھوں بچا نہیں سکا۔ نورین کو بحیثیت انسان امتیاز کی لاچارگی پر افسوس تو ہوا مگر شاید اللہ کی لاٹھی بے آواز تھی۔ اپنی سگی بہن پر تہمت لگانا اور نشے کی لت میں پڑ کر مار پیٹ کرنے کی سزا تو ملنی تھی۔ اگر سگا بھائی اپنے گھر کا سہارا بن کر بہن کا محافظ بن جاتا تو شاید ایک مجبور بہن اس دردناک انجام تک نہ پہنچتی۔ کوئی ماں اپنی اولاد کو کبھی بددعا نہیں دیتی مگر معصوم بہن کے ساتھ امتیاز کا رویہ ایسا تھا کہ ایک ماں اپنے دل سے اپنے ہی جگر کے ٹکڑے کو بددعا دینے پر مجبور ہوئی۔

بہرحال نورین کے ساتھ پیش آنے والے واقعے کے بعد اس کے گھر والوں نے احتیاطاً روزانہ کی بنیاد پر ایک رکشے والے سے بات کرکے گھر سے کالج اور واپس لانے لے جانے کا معاملہ طے کرلیا۔

اس سال شہر میں مون سون سیزن کی غیر معمولی بارش دیکھنے میں آئی۔ لگاتار تین دن سے موسلا دھار بارش نے شہر کو جل تھل کردیا تھا۔ ندی نالے ابل پڑے تھے۔ گٹر کا پانی گھروں میں داخل ہورہا تھا۔ شہر میں رین ایمرجنسی نافذ تھی۔ کرنٹ لگنے اور برساتی نالوں میں ڈوبنے سے کئی ہلاکتیں ہوئیں۔ نورین کے گھر کے راستے میں کچرا کنڈی کے ساتھ جو برساتی نالا تھا اس میں چند سال پہلے ایک باپ بیٹا ڈوب گئے تھے۔ بیٹے کی نعش کئی دن ڈھونڈنے سے بھی نہ مل سکی تھی۔ اس سال بھی طوفانی بارشوں میں برساتی نالا طغیانی کے باعث ابل پڑا۔ نالے کے ساتھ ہی کچرا کنڈی بھی بہہ گئی۔ کچھ دن بعد حالات معتدل ہوئے تو امتیاز غائب تھا۔

معلومات کی گئی تو کچھ عینی شاہدین نے بتایا کہ سیلابی ریلا آنے سے کچھ دیر پہلے حسب عادت امتیاز کچرا کنڈی میں لیٹا ہوا تھا۔ سیلابی ریلے کے باعث لوگ گھروں میں محصور تھے۔ کسی کو امتیاز کے ساتھ گزرنے والے حادثے کا اندازہ نہیں ہوا۔ امتیاز پھر کبھی نظر نہ آیا۔ سب سمجھ گئے تھے امتیاز نشے کی حالت میں برساتی نالے میں ہی کہیں بہہ گیا تھا۔ وہ بددعا کے زیر عتاب تھا۔ زندگی میں ماں کی شفقت اور نرم آغوش نے ٹھکرایا تو کچرا کنڈی جیسی جگہ میں پناہ ملی اور مرنے کے بعد گندے نالے نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ امتیاز کو نہ تو نرم بستر میسر ہوا نہ ہی مرنے کے بعد آخری آرام گاہ میں جگہ ملی۔ ایک ستم رسیدہ بہن کے بدبخت بھائی کے لیے ماں کی بددعا آج پوری ہوچکی تھی۔

++

# بیٹی ہے نعمت

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

ایک نئی سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ سچ بیانی میرے دل کی آواز ہے۔ ایک دکھی لڑکی کی روداد ہے جس نے بڑے کڑے دن دیکھے۔ ہمارا معاشرہ مفاد پرستوں کی آماجگاہ ہے۔ اپنے مفاد کو قوانین بناکر وہ ہر ایک کا حق چھین لینے کے عادی ہیں۔ مقابل اگر لڑکی ہو تو پھر کیا کہنا، اسے تو پیروں سے مسلنے میں دیر نہیں کرتے۔ فخریہ کہتے ہیں کہ بیٹی سب سے بڑا کوئی بوجھ نہیں۔ سائرہ نے عملی طور پر بتادیا کہ بیٹی نعمت ہے۔

صبا اظہر

(راولپنڈی)

"یا اللہ اس بار مجھے بیٹا نواز دے۔ میرا گھر ٹوٹنے سے بچالے۔" رخشی جاء نماز پر بیٹھی اپنے ہاتھ دعا میں بلند کیے بھری آنکھوں سے اللہ سے بیٹے کی طلب گار تھی۔ اس کے چہرے پر پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ اس کے سامنے کھڑی اس کی دس سالہ بیٹی سائرہ ماں کو خاموش نگاہوں سے دعا مانگتا دیکھ رہی تھی۔ دعا مانگنے کے بعد رخشی جاء نماز سے اٹھی اور اپنی بیٹی کے سر پر بوسہ دیا۔ سائرہ نے ماں کے ہاتھ سے جاء نماز لے کر ایک جگہ پر رکھی۔ رخشی بیڈ

بیٹھی، سائرہ نے ماں کو پانی کا گلاس دیا۔ رخشی نے مسکراتے ہوئے گلاس پکڑا اور دو گھونٹ پانی پیا۔

''ماما آپ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے بھائی ہی کیوں مانگتی ہیں۔ بابا کی طرح آپ کو بھی میں اچھی نہیں لگتی کیا؟'' سائرہ نے اداس لہجے میں ماں سے سوال کیا۔ سائرہ نے ہمیشہ اپنے باپ کو بیٹے کے لیے ترستے دیکھا تھا۔ کچھ ماہ سے رخشی بھی اللہ سے دعاؤں میں صرف بیٹے کی ہی مانگ رہی تھی۔ یہ بات سائرہ کے ننھے دل و دماغ میں کانٹے کی طرح چبھ کر اسے اداس کر رہی تھی۔

''ایسی بات نہیں ہے سائرہ۔ تم تو ماما کی جان ہو۔ میں اللہ سے تمہاری خاطر ہی بھائی مانگ رہی ہوں۔'' رخشی سائرہ کو گلے لگاتی ہوئی شفقت سے بولی۔

☆☆☆

''ڈاکٹر کے پاس جاؤ گی تو ان سے پوچھ لینا لڑکا ہے یا لڑکی۔ لڑکی ہوئی تو اسے اس دنیا میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ایک لڑکی ہو گئی ہے کافی ہے۔'' کھانا کھاتے ہوئے سہیل بولا۔

رخشی نے ایک نگاہ بیڈ پر سوئی سائرہ پر ڈالی۔

''یہ کیسی باتیں کرتے ہو تم سہیل۔ کوئی خوف خدا کرو۔ بیٹیاں اللہ کی رحمت ہوتی ہیں۔ تم مجھے میرے بچے کا قتل کرنے کا کہہ رہے ہو۔'' رخشی دھیمے لہجے میں بول رہی تھی اس کی باتیں سائرہ نہ سن لے مگر سہیل اونچی آواز میں بیٹی کی پروا کیے بغیر چلا کر بولا۔

''بکواس بند کرو اپنی، جو کہا ہے وہی کرنا، ورنہ اس گھر میں قدم مت رکھنا۔ میں مزید بیٹیوں کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا، بیٹا ہوگا تو میرا سہارا بنے گا۔'' سہیل کے کہے ہوئے الفاظ نے رخشی کے دل میں بچھو کی طرح ڈنک مارا۔

''بہت برے انسان ہو تم سہیل۔ تمہارے جیسے لوگوں سے شیطان بھی پناہ مانگتا ہوگا۔'' رخشی نم آنکھوں سے اسے دیکھ کر نفرت سے بولی۔

''دفع ہو جاؤ میری نظروں کے سامنے سے، اس سے پہلے کہ میں تمہیں اپنا شیطانی چہرہ دکھاؤں اپنی منحوس شکل گم کرو اور جاتے ہوئے اسے بھی اپنے ساتھ لے جانا۔'' سہیل نے اپنا غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔ رخشی سوئی ہوئی سائرہ کو اٹھا کر اپنے ساتھ دوسرے کمرے لے گئی۔

''یا اللہ میرے شوہر کو ہدایت دے۔ اسے حق اور غلط کا فرق سمجھا دے۔ میری بچی کے ذہن پر غلط اثر پڑنے سے روک دے۔'' رخشی سائرہ کو دوبارہ سلا کے دعا مانگ رہی تھی۔

اگلی صبح سائرہ کو اسکول چھوڑنے کے بعد رخشی اسپتال گئی۔ پورے راستے وہ اللہ سے صرف ایک ہی دعا مانگ رہی تھی کہ ڈاکٹر اسے لڑکے کی خوشخبری سنائے۔ سہیل اپنے جنرل اسٹور چلا گیا۔

☆☆☆

ماشیا یتیم خانے میں ڈیوٹی دینے کے بعد وہ اسپتال پہنچی۔ ڈاکٹر طاہرہ سے ملنے آئی تھی۔ اپنی رپورٹ کے متعلق وہ پریشان تھی۔ اللہ سے دعا گو تھی کہ اللہ اسے اولاد کی رحمت بخشے۔

☆☆☆

ڈاکٹر سے چیک اپ کروانے کے بعد رخشی نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس سے بچے کے بارے میں پوچھا۔

''ڈاکٹر بیٹا ہے یا بیٹی؟''

''ماشاء اللہ سے بیٹی ہے۔'' ڈاکٹر رپورٹ پر سائن کرتی ہوئی بولی۔

''یا میرے اللہ۔'' رخشی کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اسے اپنی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھاتا ہوا محسوس ہوا۔ اس کی حالت دیکھ کر ڈاکٹر اپنی سیٹ سے اٹھ کر اس کے پاس آئی۔

''کیا تم ٹھیک ہو؟''

''میں ٹھیک نہیں ہوں ڈاکٹر۔ آپ ایک بار دوبارہ رپورٹ چیک کریں۔ ہو سکتا ہے آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہو۔'' رخشی نے نم آنکھوں سے کہا۔

اس کی بات سن کر ڈاکٹر کے چہرے کے تاثرات بدلے۔

''کیا مطلب ہے آپ کی بات کا۔'' ڈاکٹر طاہرہ نے سخت لہجے میں پوچھا۔

''میرا کوئی مطلب نہیں ہے ڈاکٹر طاہرہ۔ میرے شوہر کو بیٹا چاہیے بیٹی نہیں۔ میں نہیں جانتی دوبارہ بیٹی کی خبر سن کر وہ میری ننھی سی بچی کے ساتھ کیا کرے گا۔'' رخشی کی خوفزدہ آنکھوں سے آنسو تیزی سے بہہ رہے تھے۔

''کیسا جاہل شوہر ہے آپ کا رخشی۔ ایسے لوگوں کو قانون کے حوالے کر دینا چاہیے جو بیٹیوں کے بارے میں ایسی غلط رائے رکھتے ہیں۔''



''وہ میری بیٹی کا باپ ہے ڈاکٹر طاہرہ۔ جیسا بھی ہے باپ ہے۔'' رخشی نے دھیمی آواز میں کہا۔ اسے اس طرح پریشان دیکھ کر طاہرہ اداس ہوئی۔

''پھر اب کیا کرو گی۔ اسے سچ بتاؤ گی۔ میری بھی رائے ہے تم ظلم کے خلاف آواز اٹھاؤ۔ ظالم ظالم ہوتا ہے۔ ظلم کرنے والا آپ کا قریبی ہی کیوں نہ ہو ہمیشہ اس کے خلاف آواز اٹھانی چاہیے۔'' ڈاکٹر طاہرہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔

''مجھ میں یہ سب کرنے کی ہمت نہیں ہے ڈاکٹر۔ آپ پلیز رپورٹ پر بیٹا لکھ دیں۔ بعد کی بعد میں دیکھیں گے۔'' رخشی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

''تم غلط فیصلہ لے رہی ہو رخشی۔ ایسے معاملے جھوٹ سے حل نہیں ہوتے۔ پھر ہم جنس کی تشخیص نہیں کرتے۔ لکھ کر دینا ناممکن ہے۔'' ڈاکٹر طاہرہ اس کے فیصلے سے مطمئن نہیں تھی۔

ڈاکٹر کا شکریہ ادا کرتے ہوئے رخشی بھیگی آنکھوں سے روم سے نکلی۔ دروازے پر اس کا سامنا ماشیا سے ہوا۔ اس کے روتے چہرے پر نظر ڈال کر ماشیا کمرے میں داخل ہوئی۔ داخل ہوتے ہی طاہرہ سے رخشی کے بارے میں سوال کیا۔

''یہ لڑکی کون ہے طاہرہ؟ اور رو کیوں رہی تھی؟''
ماشیا کے سوال پر طاہرہ نے گہرا لمبا سانس لیا۔

''وہ دوبارہ بیٹی کی ماں بننے والی ہے اور اس کے جاہل شوہر کو بیٹے کی طلب ہے۔ کہتا ہے اگر بیٹی پیدا ہوئی تو گھر میں قدم مت رکھنا۔ بس اسی صدمے نے اس کی بیٹی کی ماں بننے کی خوشی کو خوف اور ڈر میں بدل دیا ہے۔''

''یا میرے اللہ! کتنے ناشکرے لوگ ہیں اس دنیا میں۔ ہم اولاد کے لیے ترس رہے ہیں اور اللہ انہیں دوبارہ بیٹی جیسی نعمت سے نواز رہا ہے اس کا شکر ادا کرنے کے بجائے وہ اسے مارنے کا کہہ رہا ہے۔'' طاہرہ کی بات سن کر ماشیا کو حیرانگی ہوئی۔

''ہاں اللہ کی زمین اس کے ناشکرے بندوں سے بھری ہے۔ وہ دے کر بھی آزماتا ہے اور چھین کر بھی آزماتا ہے۔ تم پریشان مت ہو اللہ تمہیں بھی ایک دن اولاد سے نوازے گا۔ تمہاری اور ذیشان کی میڈیکل رپورٹ ٹھیک ہے۔'' طاہرہ اس کی رپورٹ اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''اگر رپورٹ ٹھیک ہیں تو پھر ہمارے ہاں خوشخبری کیوں نہیں آ رہی طاہرہ۔'' ماشیا نے اداس لہجے میں پوچھا۔

''اللہ بہتر جانتا ہے ماشیا۔ سب فیصلے انسان کے اختیار میں نہیں ہوتے۔ اللہ نے جب چاہا تمہاری گود بھرے گا۔ تم پریشان نہ ہو۔'' طاہرہ نے اسے تسلی دی۔ ماشیا خاموش ہو گئی۔

''طاہرہ تم اس لڑکی سے بات کرو تا وہ مجھے اپنی بچی دے دے۔ میں اسے اپنے گھر کی شہزادی بنا کر رکھوں گی۔'' ماشیا کے ذہن میں اچانک یہ خیال آیا۔

''اچھا میں کروں گی اس سے بات۔ تم مایوس مت ہو ماشیا۔'' طاہرہ نے کہا۔ ماشیا نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

سہیل کے آنے کا وقت قریب سے قریب ہو رہا تھا۔ رخشی کی دھڑکن خوف سے تیز سے تیز ہو رہی تھیں۔ وہ جھوٹ بول کر وقتی طور پر اپنی بچی کو بچا رہی تھی یہ سوچ کر کہ جب بچی اس دنیا میں آئے گی تو بچی کو اپنی گود میں لے کر سہیل سب بھول جائے گا۔ اس کا سخت دل پگھل جائے گا۔ کھانا کھانے کے بعد سہیل نے بستر ٹھیک کرتی رخشی سے رپورٹ کے بارے میں پوچھا۔

''پھر کیا آیا رپورٹ میں؟ تمہاری خاموشی سے مجھے لگ رہا ہے دوبارہ لڑکی ہے۔''

''نہیں اس بار بیٹا ہے۔'' رخشی نے آنکھیں موند کر تیز لہجے میں جواب دیا۔

''سچ میں.....'' بیٹے کی خوشخبری سن کر سہیل آنکھیں ماتھے پر رکھے بے یقینی کیفیت میں بولا۔

''ہاں۔ میں جھوٹ تھوڑا بولوں گی۔'' رخشی سہیل سے نظریں چرا کر بولی۔

''نہیں میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ خیر اب تمہیں کام کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے خیال رکھا کرو اپنا اور کل تیار رہنا ہم شاپنگ پر جائیں گے بچے کے لیے کپڑے اور کھلونے لیں گے۔'' بیٹے کی خوشخبری سن کر سہیل بہت خوش تھا۔ رخشی کو ٹھنڈے پسینے آ رہے تھے۔

اگلے دن تینوں شاپنگ پر گئے۔ سہیل نے بیٹے کے لیے کپڑے کھلونے سب لیے۔ سائرہ حسرت سے سب چیزوں کو دیکھ رہی تھی۔ شاپنگ مال میں سائرہ کی نگاہ ایک بچی پر جا رکی جو اس کی ہم عمر تھی۔ اس کا باپ اسے کپڑے لے کر دے رہا تھا تو کبھی گود میں اٹھا کر اسے لاڈ کر رہا تھا۔

"میرے پاپا پیار کیوں نہیں کرتے؟ باقی سب لڑکیوں کے پاپا تو انہیں پیار کرتے ہیں۔" سائرہ کے دل میں سوال اٹھا جس کا جواب اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ حسرت سے اپنے باپ کی طرف دیکھنے لگی۔ باپ کی محبت کو ترس رہی تھی۔ وقت گزر رہا تھا۔ بچے کی ولادت قریب تھی۔ رخشی نہیں جانتی تھی کہ اس کے جھوٹ پر سہیل اسے کیا سزا دے گا۔

☆☆☆

"سائرہ یہاں آؤ میرے پاس۔" رخشی نے آواز دے کر پڑھائی کرتی سائرہ کو اپنے پاس بلایا۔

"جی ماما۔"

"تم میری پیاری اور سمجھدار بیٹی ہو نا۔ کبھی ہمت مت ہارنا، حالات جیسے بھی آئیں بہادری سے مقابلہ کرنا۔ تم ایک لڑکی ہو اس لیے تمہیں بھی [illegible] ہونا بلکہ خود محسوس کرنا کہ تم بہت [illegible] ہو۔" رخشی نم آنکھوں سے اپنی دس سالہ بیٹی کو اس کی عمر سے بڑی باتیں سمجھا رہی تھی۔

"ماما...." ماما کہہ کر سائرہ ماں کے سینے سے چپکی اور ماں کے ساتھ رونے لگی۔

"یہ کچھ سامان ہے سائرہ اسے اپنے پاس رکھنا۔ اگر مجھے کچھ ہو جائے تو انہیں میری آخری نشانی سمجھ کے سنبھال کر اپنے پاس رکھنا۔" بیٹی کے آنسو پونچھ کر رخشی نے اسے کچھ سامان دیا جس میں خط بھی تھا اور تاکید کی کہ وہ یہ خط تب پڑھے جب وہ میٹرک کے امتحانات پاس کر لے گی۔

رخشی کی ڈلیوری میں ایک ہفتہ باقی تھا۔ رخشی ڈاکٹر طاہرہ کے اسپتال میں اپنا چیک اپ کروانے آئی تھی۔ طاہرہ نے اسے ماشیا کی آفر کے بارے میں بتایا اور سمجھایا کہ وہ اپنی بیٹی ماشیا کو دے دے وہ اس کا بہت خیال رکھے گی۔

"میں اپنی اولاد کیسے دے دوں ڈاکٹر۔" رخشی نے غم زدہ ہوتے کہا۔

"تم جانتی ہو نا رخشی تمہارے شوہر کو جب تمہارے جھوٹ کے بارے میں معلوم ہوگا تو وہ کیا کرے گا۔ یقین مانو ماشیا بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم چاہو تو ماشیا سے مل لو۔" طاہرہ نے کہا تو رخشی سوچ میں ڈوب گئی۔

"میں ایک بار مل لیتی ہوں ان سے۔" رخشی نے دھیمے لہجے میں کہا۔

طاہرہ نے ماشیا کو کال کر کے بلایا۔ رخشی ماشیا سے ملی۔ رخشی کا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ اپنی بیٹی کسی غیر کو دے مگر سہیل کے غصے سے وہ خوفزدہ بھی تھی۔ رخشی نے اپنا نمبر اسے دیا اور اس کا نمبر اس سے لے لیا اور سوچنے کا وقت مانگا۔ ماشیا نے اسے گھر پر ڈراپ کیا۔ گاڑی اس کے گھر کے باہر کھڑی کر کے اس کے ساتھ گھر میں داخل ہوئی۔

"پلیز رخشی مجھے اپنی بچی دے دو تم جب چاہو اپنی بیٹی سے مل سکتی ہو میں تمہیں کبھی بھی بیٹی سے ملنے سے منع نہیں کروں گی۔" ماشیا نے التجا کی۔

"میں بہت مشکل میں ہوں ماشیا۔ قسمت عجیب سا کھیل کھیل رہی ہے میرے ساتھ۔ ایک طرف کنواں ہے دوسری طرف کھائی۔ سہیل بیٹے کے لیے بہت ایکسائٹڈ ہے۔ بیٹے کی جگہ بیٹی کو دیکھ کر جانے اس کا ردعمل کیا ہوگا۔" رخشی نے پریشان لہجے میں کہا۔

"تم وہی کرو رخشی جو میں نے کہا ہے۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہوگا۔" ماشیا اسے تسلی دیتے ہوئے بولی۔ رخشی نے ٹھنڈی آہیں بھریں۔

☆☆☆

"جو بھی کرنا سوچ سمجھ کر کرنا ماشیا۔ وہ آدمی مجھے کوئی پاگل لگتا ہے۔ کہیں تم بھی مصیبت میں نہ پڑ جاؤ۔" سلاد بناتے ذیشان نے کہا۔

"جو بھی ہے ذیشان میں رخشی سے بچی لوں گی۔ بس آپ دعا کریں رخشی مان جائے۔" کباب فرائی کرتی ماشیا نے کہا۔

"مجھے امید ہے۔" ذیشان نے کہا۔

"ایک بار آپ بھی مل لیں رخشی سے۔ اسے یقین ہو جائے گا کہ اس کی بیٹی کو ماں باپ دونوں کا پیار ملے گا۔" کباب پلیٹ میں رکھتی ماشیا نے کہا۔

"جو حکم جناب کا۔" ذیشان ادب سے بولا۔ ماشیا مسکرا دی۔

ہزاروں سوچوں سے لڑنے کے بعد رخشی نے اپنی بیٹی کو ماشیا کو دینے کا فیصلہ کیا۔

دو دن پہلے سہیل کی باتوں نے اسے خوفزدہ کر دیا تھا۔ اس کے پڑوس میں دو جڑواں بیٹیاں پیدا ہوئی تھیں۔ رخشی نے یہ بات سہیل کو بتائی جس پر سہیل نے نفرت کا اظہار کیا اور کہا کہ شکر ہے اس بار اس کے ہاں بیٹا ہو رہا ہے ورنہ وہ بیٹی کو کوڑے میں پھینک آتا۔ رخشی کا دل خوف سے کانپ اٹھا۔

رخشی سے خوشخبری سن کر ماشیا نے بیٹی کی شاپنگ



شروع کر دی۔ کمرے کو بچی کے کھلونے سے بھر دیا ان دونوں نے۔

☆☆☆

رخشی گھر کا فرش دھو رہی تھی۔ پانی سے پاؤں پھسل کر وہ منہ کے بل زمین پر گری۔ اس کی چیخ سن کر سہیل بھاگتا ہوا اس کے پاس آیا اور بے ہوش رخشی کو اسپتال منتقل کیا۔ رخشی کی طبیعت خراب ہونے کے باعث اس کی ڈلیوری ٹائم سے پہلے کر دی ڈاکٹر نے۔ سہیل بچے کی پیدائش پر پرجوش تھا۔ ڈاکٹر نے جب اسے مبارک باد دی اور کہا۔

"مبارک ہو بیٹی ہوئی ہے۔" یہ الفاظ سن کر سہیل کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

"بیٹی نہیں بیٹا ہوا ہوگا بہن۔" سہیل نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"ہمیں کوئی غلطی نہیں ہوئی بھائی صاحب آپ کو ہی غلطی ہوئی ہوگی۔" نرس نے کہا۔

سہیل کا غصے سے چہرہ لال ہو رہا تھا اس کا دل کر رہا تھا وہ سب کو آگ لگا دے مگر سب کے سامنے وہ ایسا نہیں کر سکتا تھا۔ ہوش میں آنے کے بعد رخشی بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ وہ جلد از جلد ماشیا سے مل کر بچی اس کے حوالے کرنا چاہتی تھی مگر اسے ماشیا کا نمبر یاد نہیں تھا۔ ایک دن بعد رخشی کو ڈاکٹر نے گھر بھیج دیا۔ سہیل نے ایک بار بھی اپنی بچی کو نہیں دیکھا اور نہ ہی رخشی سے ملا۔ رخشی کو اس کی پڑوسن گھر لے کر آئی اور اس کا خیال رکھا۔ سہیل گھر سے غائب تھا۔

"سائرہ بیٹا موبائل کہاں ہے میرا۔" موبائل نہ ملنے پر رخشی نے سائرہ سے پوچھا۔

"میں لاتی ہوں ماما۔" سائرہ موبائل لینے دوسرے کمرے میں گئی اور ماں کو موبائل لا کر دیا۔ رخشی نے بچی کے ماتھے پر بوسہ دیا اور محبت سے کہا۔

"میرے شہزادی بیٹی ہو تم۔ ماما کی جان۔" سائرہ اسٹور میں اپنی بہن کے لیے اپنے پرانے کھلونے ڈھونڈنے چلی گئی۔ رخشی نے ماشیا کو کال کی اور اسے سب بتایا اور کہا کہ وہ گڑیا کو آ کر لے جائے۔ ماشیا سے بات کرنے کے بعد رخشی تھوڑا ہلکا محسوس کر رہی تھی اور اللہ سے دعا کر رہی تھی کہ ماشیا سے پہلے سہیل گھر واپس نہ لوٹے مگر کچھ دعائیں قسمت میں لکھی مصیبت کو ٹال نہیں سکتیں۔ کچھ دیر بعد سہیل غصے میں گھر واپس آیا۔ اس کا غصہ دیکھ کر رخشی کا دل حلق میں آ گیا۔ دھڑکن تیز سے تیز ہونے لگی۔ وہ کھا جانے والی نگاہوں سے رخشی کو دیکھتے ہوئے بولا۔

"گھٹیا عورت، تو نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ بیٹا پیدا ہوگا۔ دوبارہ لڑکی پیدا کر کے میرا بوجھ بڑھا دیا ہے تو نے۔ جان سے مار ڈالوں گا تجھے اور تیری بیٹیوں کو۔" سہیل اپنے ہوش و حواس کھو چکا تھا۔ اس نے رخشی کو اس کے بالوں سے سختی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔

"بس کرو سہیل کیوں اللہ کے فیصلوں سے لڑ رہے ہو۔ بیٹیاں نعمت ہوتی ہیں زحمت نہیں۔ جو بیٹیاں باپ کے لیے جنت کا دروازہ اور جہنم کی ڈھال ہوتی ہیں وہ بیٹیاں تمہیں بوجھ کیسے لگ سکتی ہیں سہیل۔ اللہ کی رضا میں خوش ہونا سیکھو۔" اسے دھکا دے کر خود سے الگ کرتی رخشی چیخ کر بولی۔

### گدو

دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر جیکب آباد ضلع کشمور سے 12 کلو میٹر کی دوری پر واقع ہے۔ صوبہ سندھ، صوبہ بلوچستان اور صوبہ پنجاب کی سرحدیں یہیں آکر ملتی ہیں۔ یہ انڈس ہائی وے اور ریل کے ذریعے ملک کے دوسرے علاقوں سے ملا ہوا ہے۔ 1963ء میں یہاں بیراج کی تعمیر مکمل ہوئی۔ جسے گدو بیراج کہا جاتا ہے۔ 1968ء میں واپڈا نے یہاں ایک تھرمل پاور اسٹیشن تعمیر کرنے کا منصوبہ بنایا۔ 1974ء میں 110 میگاواٹ کے دو یونٹوں نے کام شروع کر دیا۔ یونٹ نمبر 3 نے 1980ء میں کام شروع کر دیا اس کی بجلی پیدا کرنے کی استعداد 640 میگاواٹ ہے۔

مرسلہ: احمد شاہ، حیدرآباد

تاریخ سے پتا چلتا ہے کہ صرف ایک سو سال پہلے دولت کا ارتکاز کچھ ہاتھوں تک محدود نہ تھا۔ اس وقت دنیا بھر میں گنتی کے ارب پتی موجود تھے۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد جس معاشی نظام نے جنم لیا وہ سیکڑوں دولت مند پیدا کرنے کا سبب بن گیا، مگر اس نے غربت میں اضافہ کیا۔ اسی باعث تفریق بڑھیں اور معاشرے کے کمزور طبقات مثلاً اقلیتوں، مہاجرین، پناہ گزینوں وغیرہ کو ٹارگٹ بنایا جانے لگا۔ گویا دنیا بھر میں نفرت اور ظلم و تشدد بڑھنے کا ایک بڑا سبب ظالمانہ معاشی نظام ہے۔

کھاتے پیتے۔" سائرہ ذیشان کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بولی۔ ذیشان اسے سگی اولاد سے بھی زیادہ محبت کرتا تھا۔

"باپ بیٹی کی باتیں ختم ہوگئی ہوں تو اب ناشتا شروع کریں۔" پاس بیٹھی ماشیا مسکرا کر بولی۔

"آپی اور بابا بہت باتیں کرتے ہیں ماما۔" ماں کے پاس بیٹھا عیسیٰ ننھی میں سر ہلاتا ہوا بولا۔ وہ تینوں ہنس پڑے۔

آج سائرہ کے میٹرک کے امتحانات کا رزلٹ آنے والا تھا سائرہ بہت نروس تھی۔ رزلٹ کے بعد وہ اپنی ماں کا وہ خط بھی پڑھنے والی تھی جو اسے رخشی نے چھ سال پہلے دیا تھا۔ جسے اس نے بڑی حفاظت سے رکھا ہوا تھا۔ ماں کی وصیت سمجھ کر اس نے کھول کر پڑھنے کی کبھی کوشش نہیں کی تھی۔

رزلٹ کے انتظار میں وہ لاؤنج میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی جب ذیشان ہاتھ میں مٹھائی کا ڈبا اٹھا کر اس کے سامنے کھڑے ہوئے۔

"بابا رزلٹ آگیا؟" باپ کو دیکھ کر سائرہ دھیمے لہجے میں بولی۔

"ہاں بیٹا آگیا ہے اور میری شہزادی بیٹی نے پورے بورڈ میں پہلی پوزیشن حاصل کی ہے۔" ذیشان سائرہ کے منہ میں لڈو ڈالتے ہوئے فخریہ بولے۔ سائرہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"بابا۔" وہ باپ کے سینے کے ساتھ آ لگی۔ "یہ سب کچھ آپ کی وجہ سے ممکن ہوا ہے بابا۔ اگر آپ نہ ہوتے تو شاید میں آج زندہ بھی نہ ہوتی۔" اس نے روتے ہوئے کہا۔ بیٹی کو آبدیدہ دیکھ کر ذیشان کی آنکھیں نم ہوگئیں مگر اس نے خود کو رونے نہیں دیا۔

"خوشی کے موقع پر روتے نہیں ہیں بیٹا۔ بلکہ جشن مناتے ہیں۔" وہ اس کے آنسو صاف کرتے ہوئے بولے۔ سائرہ مسکرا دی۔

بیٹی کی کامیابی کی خوشی پر ذیشان نے اپنے سب دوستوں رشتے داروں کو پارٹی میں مدعو کیا۔ نیوز پیپر والے بھی موجود تھے۔

پارٹی کی تقریب پر سائرہ نے سب کے سامنے اپنی کامیابی اپنے ماں باپ کے نام کردی۔

"میں سائرہ ذیشان آج جو بھی ہوں صرف اپنے ماں باپ کی بدولت ہوں جنھوں نے ایک ایسی لڑکی کو اپنایا جس کے باپ نے اس کی تین دن کی بہن کو قتل کردیا۔ قصور کیا تھا وہ ایک لڑکی تھی۔ میری درخواست ہے آپ سب سے۔ بیٹی کو بھی انسان سمجھیں، اسے بھی جینے کا پورا حق ہے۔ بیٹی وہ پھول ہے جو سب کے آنگن میں نہیں کھلتی۔ بیٹی کی قدر کریں اسی طرح جس طرح میرے بابا ذیشان نے میری قدر کی ہے۔" سائرہ نے ذیشان کی طرف اشارہ کرکے فخریہ کہا۔ سائرہ کی تقریر پر ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔

☆☆☆

تقریب ختم ہونے کے بعد اپنے کمرے میں جاکر سائرہ نے دھڑکتے دل سے ماں کا خط الماری سے نکالا، اسے بوسہ دے کر پڑھنا شروع کیا۔

"لڑکی کبھی کمزور نہیں ہوتی۔ اسے ہمارے معاشرے کے لوگ کمزور بنا دیتے ہیں۔ اسے یہ بات کہہ کہہ کر کہ تم ایک عورت ہو، عورت کچھ نہیں کرسکتی، عورت صرف ایک بوجھ ہے۔ پہلے اپنے باپ بھائی پر پھر اپنے شوہر پر اور بھی اپنے بیٹے پر۔ عورت کو سنبھالنا مرد کی ذمہ داری ہے اس کی مجبوری نہیں۔ عورت کو تحفظ دینے کی ذمہ داری مرد کی ہے۔ اپنی ذمہ داری سے پیچھے ہٹنے والا مرد، مرد کہلانے کے لائق نہیں لیکن تم ایک مضبوط لڑکی بننا۔ خود کو اتنا مضبوط بنانا کہ کوئی انسان تمھیں کمزور سمجھ کر تمہارے ساتھ ناانصافی نہ کرسکے۔ میں جانتی ہوں تم اپنے باپ کی محبت کے لیے ترس رہی ہو۔ تمہارے دل میں خیال آتا ہوگا کہ شاید دنیا کا ہر باپ اپنی بیٹیوں سے محبت نہیں کرتا تو ایسا نہیں ہے میری گڑیا۔ میرے بابا جیسے بہت سے باپ ایسے ہیں جو اپنی بیٹیوں پر جان نچھاور کرتے ہیں۔ میں نہیں جانتی یہ خط تم تک پہنچے گا بھی یا نہیں۔ تم اسے کن حالات میں پڑھ رہی ہوگی لیکن میری اللہ سے دعا ہے تم جہاں رہو خوش اور محفوظ رہو۔ اپنا خیال رکھنا میری گڑیا۔ اللہ حافظ۔" ماں کا خط پڑھ کر سائرہ کی آنکھیں نم ہوگئیں۔

"میں خوش ہوں ماما اور مطمئن بھی ہوں۔ ماما بابا بہت محبت کرتے ہیں مجھ سے۔ یہ آپ کی دعائیں ہی ہیں جو مجھے ماما بابا جیسے والدین ملے۔ کاش آج آپ بھی میرے ساتھ ہوتیں۔" سائرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ اور سکون تھا۔ یہی اس کی سب سے بڑی جیت تھی۔ ہر اس لڑکی کی جیت تھی جو ہزاروں مشکلات کے باوجود حوصلہ نہیں ہارتی۔

++

# کنجوس شوہر

محترم مدیر
السلام علیکم!
عورتیں جذباتی ہوتی ہیں۔ ذرا ذرا سی بات کا اثر لے لیتی ہیں۔ اور اگر زیب جیسی عورت ہو تو گھر بچائے نہیں بچتا۔ ایک بار آپ بھی ملاحظہ کریں کہ کیا زیب کو ایسا کرنا چاہیے تھا؟
خلیل جبار
(حیدرآباد)

ڈاکیے سے خط وصول کرتے ہوئے ظفر کے چہرے پر ایک خوشگوار سی مسکراہٹ دوڑ گئی تھی۔ وہ خط اس کے نام نہیں تھا، لیکن اسے یہ ہی محسوس ہوا کہ یہ خط اسے ہی لکھا گیا ہے۔ نام تبدیل ہے۔ ظفر خوش دلی کے ساتھ صحن میں داخل ہوا۔ اس کا سامنا زبیدہ بھابی سے ہوا۔ اس کے ہاتھ میں خط دیکھ کر وہ چونکی۔

''ارے یہ خط تمہیں کس لڑکی نے لکھ دیا؟''
''میری قسمت ایسی کہاں کوئی لڑکی خط لکھے۔''

"اچھا جن کو لڑکیاں خط لکھیں، وہ خوش نصیب ہوتے ہیں۔" بھابی نے مسکراتے ہوئے اسے دیکھا۔
"میرا خیال ہے، وہ خوش نصیب نہیں ہوتے۔" ظفر نے شرارت بھرے لہجے میں بولا۔
"پھر کون ہوتے ہیں؟" وہ مسکراتے ہوئے بولی۔
"جن کو لڑکیاں ایس ایم ایس کریں۔"
"کریں سے مراد ایک سے زائد لڑکیاں۔"
"ہاں۔" ظفر مسکرایا۔
"ایک سے زائد لڑکیاں لکھیں، پھر کیسا ہے؟"
"پھر بھی نہیں۔"
"وہ کیوں؟"
"جدید دور ہے، اب تو موبائل پر گونگے بہرے بھی ایک دوسرے سے اشاروں میں بات کر لیتے ہیں۔"
"ہاں یہ تو ہے۔" وہ بولی۔
"لڑکیاں پہلے ایس ایم ایس پر بات چیت شروع کرتی ہیں، پھر موبائل اسکرین پر باتیں شروع ہو جاتی ہیں۔"
"تمہیں تو بہت معلومات ہیں۔" زبیدہ بھابی نے کہا۔
"بس معلومات ہی ہیں، ابھی تک کسی لڑکی نے ایس ایم ایس نہیں کیا ہے۔"
"کیا تجربہ کرنا چاہتے ہو؟"
"تجربہ کر لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔" ظفر نے کہا۔
"شام کو تمہارے بھائی کو آنے دو۔"
"ان سے کیا کہیں گی؟"
"یہی کہوں گی کہ ظفر ہاتھوں سے نکل رہا ہے، اس کی شادی کرا دو۔"
"ارے بھابی ایسی غلطی نہ کرنا۔"
"کیوں؟"
"میرا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"
"لڑکیوں سے موبائل پر باتیں کرنے کو دل چاہ رہا ہے اور شادی کرنے سے گھبرا رہے ہو۔"
"بھابی میں ابھی کچھ بننا چاہتا ہوں۔"
"کون روک رہا ہے۔"
"روک..... روک تو کوئی بھی نہیں رہا۔"
"تو....."
"ابھی میں کچھ کر لوں، شادی کے بعد کئی مسائل پیدا ہو جاتے ہیں، ان سے نمٹنا مشکل کام ہوتا ہے۔"
"انسانی زندگی میں مسئلے مسائل آتے رہتے ہیں، اس سے نمٹنا ہی اصل بہادری ہوتی ہے۔" بھابی نے کہا۔
"ہاں یہ بات تو ہے۔" ظفر نے کہا۔
"تمہارے ہاتھ میں یہ خط کس کا ہے؟"
"ایک لڑکی کا ہے۔"
"اور یہ لڑکی کون ہے؟"
"اس کا نام زیب النساء ہے، اس نے اپنی کزن زبیدہ کے نام خط لکھا ہے۔"
"اچھا اس کا مطلب ہے، زیب نے گھر جاتے ہی مجھے خط لکھ دیا ہے۔" وہ مسکرائی۔
"اس خط کے آنے پر ایسا ہی محسوس ہوتا ہے، اسے خط لکھنے کی بہت جلدی تھی۔"
"ذرا پڑھ کر سنانا، خط میں کیا لکھا ہے؟"
"کسی کا خط پڑھنا غیر اخلاقی ہے۔"
"میں خود کہہ رہی ہوں، اس لیے غیر اخلاقی نہیں ہے۔"
"یہ خط زنانہ ہے اس لیے مجھے پڑھتے ہوئے شرم آئے گی۔"
"زیب سے تمہیں بات کرتے ہوئے شرم نہیں آتی اور اس کا خط پڑھتے ہوئے شرم آ رہی ہے۔" زبیدہ بھابی نے آنکھیں نکالیں۔
"ارے بھابی ناراض نہ ہوں، دراصل یہ خط ہے اور خواتین آپس میں کس قسم کی باتیں کرتی ہیں اس کا مجھے اندازہ نہیں ہے۔ اس لیے میں یہ خط پڑھتے ہوئے گھبرا رہا ہوں۔"
"میرے ہاتھ آٹے میں لگے ہوئے ہیں، ورنہ میں خود خط کھول کر پڑھ لیتی۔" زبیدہ بھابی نے کہا۔
وہ کچن میں آٹا گوندھ رہی تھی۔ ڈاکیے کے دروازے پر دستک دینے پر باہر آئی تھی۔ اس کے ڈاکیے سے خط وصول کرنے سے پہلے ہی ظفر نے خط لے لیا تھا۔
"بھابی آپ بھی کیا یاد کریں گی، لو۔ میں خط پڑھ کر سنا دیتا ہوں۔" ظفر نے مسکراتے ہوئے لفافہ چاک کیا۔ خط کے مضمون پر نظر پڑتے ہی اس کے دل میں گدگدی سی ہونے لگی تھی۔
"زیب النساء نے ابتدا میں سلام لکھا ہے۔"
"وعلیکم السلام، اور آگے کیا لکھا ہے۔"
"باجی زبیدہ میں دو ہفتے تمہارے پاس رہنے آئی تھی۔ یہ دو ہفتے کیسے گزرے پتا ہی نہیں چلا۔ یہاں آ کر ایسا محسوس ہو رہا ہے، جیسے چند لمحات گزار کر آئی ہوں۔ دل چاہ رہا



ہے دوبارہ سے تم سے ملنے آ جاؤں، جب تک میرا دل نہ بھر جائے اپنے گھر نہ آؤں۔ تمہاری مہمان نوازی سے مجھے بہت خوشی ہوئی ہے۔ دل بہت چاہتا ہے تم سے بات کروں، لیکن نہ تمہارے پاس موبائل ہے اور نہ میرے پاس، اس لیے خط کا سہارا لیا ہے۔ دعاؤں کی طالب ہوں۔"
"اور آگے کیا لکھا ہے؟"
"آگے کچھ نہیں ہے۔" ظفر نے بتایا۔
"ویسے بھابی تمہاری بہن کی رائٹنگ بہت اچھی ہے۔"
"بچپن ہی سے اس کی رائٹنگ اچھی ہے، زیب نے بچپن میں خوشخطی سیکھی ہے۔ اس سے اچھی رائٹنگ ہو گئی ہے۔"
"آج کل لڑکیاں اپنی رائٹنگ پر توجہ نہیں دیتیں ہیں۔" ظفر نے کہا۔ "لڑکے اور لڑکیوں کے موبائل اور کمپیوٹر کے استعمال کی وجہ سے قلم کے استعمال کا موقع نہیں ملتا، اس طرح ان کی رائٹنگ خراب ہو رہی ہے، لکھنے کی عادت ختم ہو رہی ہے۔"
"یہ بھی درست ہے، ان دنوں ایسا ہی ہے۔"
"بھابی زوروں کی بھوک لگ رہی ہے، کیا کھانا تیار ہو گیا ہے۔"
"تم تھوڑی دیر آرام کر لو، کھانا تیار ہونے میں کچھ دیر لگے گی، کھانا تیار ہو جائے پھر میں کھانا لگاتی ہوں۔" بھابی نے کہا۔
زیب النساء ان کے گھر دو ہفتے قبل آئی تھی۔ وہ زبیدہ کی خالہ زاد تھی۔ اسے کراچی دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ کراچی میں ایک عزیز کے یہاں شادی کی تقریب کے بہانے آ گئی تھی۔ اس کا اور اس کے والدین کا ارادہ شادی میں شرکت کر کے فوراً لاہور چلے جانے کا تھا۔ زیب کی ضد پر اس کے والدین کو رکنا پڑا۔ وہ دن شادی میں شرکت کر کے زیب النساء اس کے والد قمر الدین اور والدہ شائستہ بیگم ظفر کے گھر آ گئے۔ جس وقت وہ گھر آئے ظفر گھر سے باہر تھا۔ جب وہ یونیورسٹی سے گھر پہنچا۔ اسے اپنے کمرے میں کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ زیب دروازے کی طرف پیٹھ کیے ہوئے، ایک رومانوی ناول دیکھ رہی تھی۔ اسے کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تو وہ پلٹی۔ ظفر نے جوں ہی اس کا چہرہ دیکھا تو دیکھتا رہ گیا۔ ایسا لگ رہا تھا، دن میں چاند اس کے کمرے میں اتر آیا ہے۔ زیب بھی چند لمحے اسے دیکھتی رہی پھر وہ ظفر سے مخاطب ہوئی۔ "آپ ظفر ہیں۔"
"ہاں لیکن تم کون؟"
"زبیدہ آپی کی بہن ہوں۔"
"بہن ہو لیکن میں نے پہلے کبھی دیکھا نہیں ہے۔"
"کیسے دیکھتے ہم لوگ لاہور میں رہتے ہیں اور زبیدہ باجی کا گھر کراچی میں ہے۔"
"اچھا ان کی کزن ہیں، کیا نام ہے؟"
"مجھے زیب النساء کہتے ہیں۔"
"تمہاری طرح تمہارا نام بھی بہت پیارا ہے۔"
"کیا واقعی میں خوب صورت ہوں۔" وہ چونکی۔
"کیا میری بات پر یقین نہیں آ رہا ہے۔"
"اگر تم کہہ رہے ہو تو یقین کیے لیتی ہوں۔" وہ بولی۔
"یقین کرنے کا شکریہ۔" ظفر مسکرایا۔
"ویسے تمہارا ذوق اچھا ہے۔" زیب النساء نے ناول کو دیکھتے ہوئے کہا۔
"کبھی کبھی کوئی اچھی کتاب بازار میں مل ہی جاتی ہے۔" ظفر نے کہا۔
"نوجوان ایسی کتابیں پڑھتے نہیں ہیں۔"
"پھر کس قسم کی کتابیں پڑھتے ہیں؟"
"جاسوسی اور سسپنس سے بھرپور کہانیاں پڑھتے ہیں۔"
"تمہاری بات سے میں اتفاق کروں گا لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر نوجوان ایسی کتابیں پڑھیں۔ نوجوانوں میں مختلف شوق ہوتے ہیں، کوئی کرکٹ پسند کرتا ہے تو کوئی کھیلوں سے دور...... بھاگتا ہے۔"
"ہاں۔" زیب سوچتے ہوئے بولی۔
"ارے کھڑی کیوں ہیں، بیٹھیں نا۔" وہ بولا۔
"میں سوچ رہی تھی باجی کے دیور بڑے بور سے ہوں گے۔" وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔
"اس کا مطلب ہے، بھابی اور تمہارے درمیان میرے متعلق باتیں ہوتی رہی ہیں۔" وہ اس کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا۔
"ہاں وہ تمہارا ذکر کرتی رہی تھیں، جب ہی تو میں تمہیں ایک نظر دیکھنا چاہتی تھی۔"
"اس کا مطلب ہے تم اسی لیے خاص طور پر مجھے دیکھنے آئی ہو۔"
"ابھی بھی خوش فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ میں یہاں ایک شادی میں شرکت کرنے آئی تھی، اس لیے سوچا باجی اپنے

دیور کی اتنی تعریف کرتی ہے تو ان کے دیور کو ایک نظر دیکھ لیا جائے۔" زیب مسکرائی۔

"باتیں بہت دلچسپ کرتی ہو۔"

"صرف باتیں ہی اچھی کرتی ہوں کھانے پکانے کے معاملے میں مجھ سے اچھی توقع مت رکھنا۔"

"ہم مہمانوں سے گھر کا کام نہیں کراتے، ہماری بھابی بھی کھانے پکانے میں نمبر ون ہیں۔"

"باجی کے ہاتھ میں ذائقہ ہے جو ان کا پکا ہوا کھائے وہ انگلیاں چاٹتا رہ جاتا ہے۔" زیب نے کہا۔

"بات کتاب سے شروع ہو کر کھانوں تک پہنچ گئی لوگ درست کہتے ہیں کہ آج کل کتابوں کا شوق کم ہے۔ کھانے کا رجحان بڑھتا جا رہا ہے۔" مظفر زیر لب مسکرایا۔

"لاہور اور کراچی کھانے کے حوالے سے مشہور ہیں، دونوں شہروں کے لوگ ذائقہ دار کھانے بہت پسند کرتے ہیں۔"

"کراچی میں راتوں کو بھی فوڈ اسٹریٹ کھلی رہتی ہیں۔" مظفر نے کہا۔

"ارے زیب النساء تم یہاں بیٹھی ہو، میں تمہیں گھر میں ڈھونڈ رہی ہوں۔" زبیدہ بھابی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولیں۔

"بھابی یہ کمرا بھی گھر میں شامل ہے۔" مظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں تم ٹھیک کہہ رہے ہو وہاں تو میں کہہ رہی تھی۔" وہ بولیں۔

"زیب النساء کو ڈھونڈ رہی تھیں۔"

"بس ٹھیک ہے، زیب کو دیکھ لیا اطمینان ہو گیا ہے۔" بھابی نے کہا۔

"بھابی کس بات کا اطمینان ہو گیا۔"

"زیب کو گھر میں نہ دیکھ کر پریشان ہو گئی تھی کہ یہ کہاں نکل گئی ہے۔"

"بھابی اس لیے کہتے ہیں بچہ بغل میں اور ڈھنڈورا شہر میں۔"

"باجی تمہارے دیور بڑے دلچسپ نوجوان ہیں۔"

"میں نے تمہیں کہا تھا کہ ہمارا دیور بہت دلچسپ باتیں کرتا ہے، تم نے ایک ملاقات میں ہی اندازہ لگا لیا۔" بھابی نے کہا۔

مظفر کبھی بھابی اور کبھی زیب کو دیکھ رہا تھا۔

"بھابی آج باتوں سے ہی کام چلے گا یا کھانے کو بھی کچھ ملے گا۔"

"ہاں کیوں نہیں تم منہ ہاتھ دھو لو، میں کھانا نکالتی ہوں۔" بھابی نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی آیا۔" یہ کہتے ہوئے مظفر باتھ روم کی جانب بڑھ گیا۔

بھابی کے کمرے سے نکلنے پر زیب بھی کمرے سے نکل گئی۔

مظفر منہ دھوتے ہوئے سوچ رہا تھا کہ بھابی کی کزن اتنی خوبصورت ہوگی، یہ اس نے کبھی سوچا بھی نہ تھا۔ یہ اتفاق تھا کہ وہ شادی میں شرکت کرنے آ گئی اور اس کی ملاقات زیب سے ہو گئی۔ اگر اس کی ملاقات زیب سے شادی ہونے کے بعد ہوتی تو اسے ساری زندگی پچھتاوا ہی رہتا کہ اتنی حسین دوشیزہ اس کے ہاتھوں سے نکل گئی۔

زیب اس کی باتوں سے پہلی ملاقات میں ہی متاثر ہو گئی تھی۔ آئندہ چند روز گزرنے پر اسے پورا یقین ہو گیا تھا کہ یہ ملاقاتیں گہری دوستی میں بدل جائیں گی۔ زیب اور مظفر دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ ان کی شادی میں کوئی رکاوٹ نہیں تھی، اس لیے نوکری ملتے ہی ان دونوں کی شادی ہو گئی۔ گھر چھوٹا تھا اس لیے مظفر کو کرائے کے مکان میں جانا پڑا۔ وہ مجبور نہیں تھا۔ اس کی خواہش تھی بچت کر کے اپنا ذاتی گھر لے تاکہ کرائے کے مکان سے نجات مل جائے۔ اس نے اپنے دوستوں کو کرائے کے مکان میں پریشان ہوتے دیکھا تھا اس لیے مظفر چاہتا تھا جتنی جلدی ہو، وہ اپنے ذاتی گھر میں منتقل ہو جائے۔

شادی ہونے پر اکثر نوجوان اپنی بیوی کو متاثر کرنے کو کھلا خرچ کرتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں لوگوں کے مقروض بھی ہو جاتے ہیں۔ قرض دار ہونے پر تنخواہ میں گزارا کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ مظفر نے احتیاط برتی، جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ کسی کا قرض دار نہیں تھا۔ مالک مکان کو بروقت کرایہ ادا کر رہا تھا۔ تنخواہ سے فلیٹ کی قسط جمع کرانے پر بھی اچھا گزارا ہو رہا تھا۔ زیب اس سے مطمئن نہیں تھی، وہ چاہتی تھی کہ اس کا شوہر بھی دوسرے شوہروں کی طرح اس پر کھلا خرچ کرے۔ اکثر اس بات پر مظفر سے جھگڑا کرنے لگ جاتی، روٹھ جاتی، مظفر کو اسے منانے کا فن آتا تھا۔ زیب کچھ ہی دیر میں مان جاتی تھی۔

زیب ہر ممکن کوشش کرتی تھی کہ شوہر کو خوش رکھے۔ اس کا دل سے احترام کرتی تھی۔ اس کے جو بھی کام ہوتے خوش اسلوبی سے نمٹاتی تھی۔ زیب پہلی بار بازار گھومنے گئی، اسے ایک سوٹ پسند آ گیا اور اس نے کپڑا لینے کی فرمائش کر دی۔ مظفر نے سوٹ دلانے کی بجائے کہا۔

"تمہارے پاس شادی سے پہلے ہی کئی سوٹ رکھے ہیں پہلے ان کو اچھی طرح پہن لو۔ پھر دیکھیں گے۔"

"سب بیویوں کے پاس کئی، کئی جوڑے ہوتے ہیں لیکن ان کے شوہر پھر بھی ان کا دل رکھنے کو سوٹ دلاتے رہتے ہیں۔"

"کپڑے ہوتے ہوئے پھر کپڑے لینا فضول خرچی ہے مجھے ایسی فضول خرچی پسند نہیں ہے۔"

وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن مظفر کا چہرہ دیکھ کر دل مسوس کر کے رہ گئی، زیب نے اس وقت اپنی سخت بے عزتی محسوس کی تھی۔

زیب کی کزن سلمیٰ کی شادی تھی تو زیب نے سونے کے ایک ہار کی فرمائش کر دی۔ اس پر مظفر کو غصہ آ گیا۔

"تم کو میرے حالات کا علم ہے پھر بھی زیور کی فرمائش کر رہی ہو۔"

"سب کے حالات ایسے ہی چل رہے ہیں پھر بھی لوگ اپنی بیوی کی خواہش ضرور پوری کرتے ہیں۔"

"ایسے لوگوں کو میں نے قرض وقت پر ادا نہ کرنے پر ذلیل و رسوا ہوتے بھی دیکھا ہے۔"

"خواہش تو پوری کر دیتے ہیں۔" زیب نے کہا۔

"تم یہ چاہتی ہو میں تمہاری خواہشات کو پورا کرنے کی غرض سے گھر گھر کے لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر ذلیل و رسوا ہوں۔ تم میری کیسی بیوی ہو۔ تم اچھی طرح میرے حالات جانتی ہو۔"

"حالات اتنے بھی برے نہیں ہیں اسی لیے تو لوگ باتیں بناتے ہیں۔"

"کون باتیں بناتا ہے، مجھے اس کا نام بتاؤ۔"

"لوگ سامنے کہاں کہتے ہیں، پیچھے باتیں بناتے ہیں کہ دیکھو اس کا شوہر اسے کس حال میں رکھتا ہے۔"

"لوگوں کا کام باتیں بنانا ہے، میں کہیں سے ادھار لے کر کچھ خرید دوں، اور قرض خواہ رقم کا تقاضہ کریں گے اس پر یہ لوگ بولیں گے کہ جب گنجائش نہیں تھی پھر ادھار کیوں لیا تھا۔" مظفر نے کہا۔

زیب کا دل بھر آیا۔ وہ خاموش ہو گئی۔

اسے خاموش ہوتا دیکھ کر مظفر نے اسے دلاسہ دیا۔

"زیب میں چادر دیکھ کر پاؤں پھیلاتا ہوں۔ فضول چیزوں کے لیے کبھی ہماری زندگی پُرسکون گزر رہی ہے۔ تمہاری خواہش پر میں نے یہ گھر کرائے پر لیا تھا فضول خرچ کرنے پر کرایہ دے سکوں گا، اس سے کہیں بہتر ہیں کہ ہم خواہشات کو محدود کر لیں جو انتہائی ضروری چیزیں ہوں وہی خریدیں۔" مظفر نے سمجھایا۔

"سارا میری کزن ہے۔ اس کا شوہر نوازش بھی کرائے کے مکان میں رہتا ہے۔ اس کی شادی کو دس سال ہونے کو ہیں وہ سارا کا بھرپور خیال رکھتا ہے۔ اس کے منہ سے بات نکلتی ہے نوازش فوراً سے لا کر دے دیتا ہے۔"

"اس کی تنخواہ اچھی ہوگی۔"

"تنخواہ اتنی ہی ہے جتنی تمہاری ہے۔"

"پھر تو وہ پریشان رہتا ہوگا۔"

"دونوں میاں بیوی بہت خوش ہیں۔ اکثر نوازش سارا کو گھمانے لے جاتا ہے۔"

"میری تو عقل کام نہیں کر رہی ہے۔ وہ کیسے کرائے کے مکان میں رہ کر اتنے اخراجات کر لیتا ہے۔" اس نے کہا۔

زیب کو اندازہ ہو چکا تھا۔ اس کا مظفر کے ساتھ گزارا مشکل ہے اس لیے الگ ہو جانا چاہیے۔ ایسے کنجوس شوہر کے ساتھ اس کی نہیں نبھ سکے گی۔

مظفر کے دفتر جانے پر اس نے مختصر سامان بریف کیس میں رکھا اور کینٹ اسٹیشن روانہ ہو گئی۔ لاہور کی ٹکٹ لے کر وہ ٹرین میں بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھیں اشک بار تھیں اور وہ اپنے آنسو بار بار رومال سے صاف کر رہی تھی۔

ٹرین میں مسافر آ رہے تھے۔ اس کے سامنے والی سیٹ پر ایک نوجوان خاتون آ کر بیٹھ گئی۔ اس کی عمر بہ مشکل پچیس سال کے قریب ہوگی۔ وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے شوہر نے اس کا سامان سیٹ کے نیچے رکھ دیا اور اس کے قریب ہی بیٹھ گیا۔

"آپ مجھے لینے آ گئے۔"

"اگر تم کہو تو ابھی گھر لے کر چل دیتا ہوں۔" وہ بولا۔

"میں مذاق کے موڈ میں نہیں ہوں۔"

"میں کون سا سنجیدہ ہوں۔" وہ ہنستے ہوئے بولا۔

"میرے کہنے کا مقصد ہے کہ تم مجھے جلدی لینے آ جانا میرا دل وہاں نہیں لگے گا۔"

"لگنا بھی نہیں چاہیے۔"

"وہ کیوں؟" وہ چونکی۔

"ارے میری جان، تمہارا وہاں دل لگ جائے پر زیادہ دن وہاں ہوگی اور ادھر کراچی میں تمہارے بغیر میرا دل نہیں لگے گا۔" وہ بولا۔

"یہ بات تم درست کہہ رہے ہو، ہم شادی سے پہلے ایک دوسرے کے لیے انجان تھے۔ شادی کا ایک سال گزرنے پر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہم جنم جنم سے ایک دوسرے کے ساتھ رہ رہے ہیں۔ جدائی کے تصور سے ہی خوف آتا ہے۔"

"میں تمہیں اس لیے لاہور جانے سے منع کرتا ہوں۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میں کیا کروں۔ لاہور میں والدین ہیں، بہن، بھائی ہیں، ان کی یاد آتی ہے، ایسے میں جب وہ مجھے بلاتے ہیں پھر بھاگ کر جانے کو دل کرتا ہے پلک جھپکتے میں ان کے پاس پہنچ جاؤں۔"

"میں تمہاری بات سے انکار نہیں کروں گا، تمہیں اپنے والدین اور بہن، بھائیوں سے ملنے ضرور جانا چاہیے، جب بھی تم نے لاہور جانے کو کہا ہے، کبھی میں نے منع نہیں کیا۔"

"میں کب کہہ رہی ہوں کہ تم منع کرتے ہو، گھر جانے پر تمہاری تعریف ہی کرتی ہوں۔"

"مجھے اتنا یقین تو ہے، تم میری کہیں بھی برائی نہیں کرو گی۔"

"واقعی تم نے ہمیشہ میری ضرورتوں کا بہت خیال رکھا ہے۔ اس لیے میں تمہاری دل سے قدر کرتی ہوں اور سب کے سامنے تمہاری خوب تعریف کرتی ہوں۔"

"ٹھیک ہے، ٹرین چلنے والی ہے، تم موبائل پر رابطہ رکھنا، جیسا تمہارا موڈ بنے بتا دینا، میں تمہیں لینے آجاؤں گا۔" وہ بولا۔

ٹرین نے سیٹی دی اس لیے وہ تیزی سے ٹرین سے اتر گیا۔ اس جوڑے کو دیکھ کر زیب کو یاد آ گیا۔ جب وہ پہلی بار اکیلی لاہور کے لیے ٹرین سے جا رہی تھی۔ اس کی بھی یہی حالت تھی۔ وہ گھر جانا نہیں چاہتی تھی لیکن خاندان میں ایک شادی تھی اور اس کے والدین اور بہن، بھائیوں نے بہت اصرار کیا تھا کہ وہ ضرور آئے اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی جانا پڑ گیا تھا۔

زیب نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ اسے ظفر اور اپنے گھر سے اتنی محبت ہو جائے گی کہ میکے جانے کو اس کا دل ہی نہیں کرے گا۔ ٹرین کے چلنے سے پہلے وہ ظفر سے مخاطب ہوئی۔

"ظفر تم جلدی آ جانا، میرا دل میکے میں نہیں لگے گا۔"

"تم بے فکر ہو جاؤ، میں دفتر سے چھٹی لے کر بہت جلدی آ جاؤں گا۔"

"تم اپنا بھرپور خیال رکھنا اور ہاں گھر کی چیزوں کے علاوہ باہر سے کھانا مت کھانا۔"

"کیوں؟"

"مجھے بازار کا کھانا اچھا نہیں لگتا۔"

"بھوکا رہ کر تو میں مر جاؤں گا۔"

"یہ تم سے کس نے کہا کہ بھوکے مر جاؤ، باجی کے گھر کھانا کھانے چلے جانا۔"

"اگر وہ کھانا دینے سے انکار کر دیں تو میں کیا کروں۔"

"ایسا بھی نہیں ہے تم ان کے اکلوتے دیور ہو، مجھ پہ ہے، انہوں نے شادی سے قبل بھی تمہارا بھرپور خیال رکھا ہے اور اب بھی رکھیں گی۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا تھا۔

آج وہ بھی اکیلی لاہور جا رہی تھی، فرق یہ تھا کہ ظفر اسے چھوڑنے نہیں آیا، وہ اپنی مرضی سے ظفر کو بتائے بغیر گھر سے نکل آئی تھی۔

ٹرین نے رینگنا شروع کر دیا تھا۔ اسٹیشن کو پیچھے جاتا دیکھ کر بے اختیار زیب کا دل چاہا کہ وہ فوراً اسے اسٹیشن سے پہ اتر جائے۔ ظفر اسے گھر میں نہ پاکر پریشان ہو جائے گا۔

"وہ پریشان ہوتا ہے، تو میں کیا کروں، اس نے کون سی مجھے خوشیاں دی ہیں۔ ایک ایک چیز کے لیے ترستی رہی ہوں، جب بھی کسی چیز کی فرمائش کرتی ہوں، فوراً سے کہہ دیتا ہے۔

"زیب اس ماہ یہ چیز خریدنے کی گنجائش نہیں، جس ماہ گنجائش نکلی، میں تمہیں ضرور دلا دوں گا۔" وہ زیر لب بڑبڑائی۔

"کسی بھی شخص کو سمجھنے میں کچھ وقت لگتا ہے، اتنے عرصے ظفر کے ساتھ رہ کر میں اسے اچھی طرح سے سمجھ گئی ہوں۔ میں جان گئی ہوں، اس کے ساتھ گزارا مشکل ہے۔ سسک سسک کر جینا، ہر وقت اپنی خواہشات کا گلا گھونٹ لینا، یہ بھی کوئی زندگی ہے۔ خالی خولی کا پیار دینے کے علاوہ ظفر کے پاس کچھ نہیں ہے۔" ٹرین اسٹیشن کو چھوڑ چکی تھی اور رفتار میں تیزی آ چکی تھی۔

گھر چھوڑ دینے پر اسے ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا کہ اس نے یہ غلط اقدام اٹھایا ہے۔ گھر چھوڑنے سے ایک دن قبل ظفر کو بتا دینا چاہیے تھا کہ وہ اب اس کے ساتھ نہیں رہ



سکتی۔ زیب بھی ایک عورت تھی، وہ کس طرح یہ برداشت کر سکتی تھی کہ اس کا شوہر صبح گھر سے نکلے اور رات گئے آئے، اور پھر صبح گھر سے نکل جائے۔ کوئی تفریح کا پروگرام نہیں بن رہا تھا۔ زیب کو کراچی میں گھومنے پھرنے کا بہت شوق تھا۔ خاص کر کلفٹن اور سمندر کے کنارے بیٹھ جانا۔ اس کے پاؤں کو چھوتی سمندری لہروں کو اپنے پاؤں پر محسوس کرنا، کبھی کسی پارک چلے جانا۔ یہ سب نہ ہونے پر زیب کو ظفر پر شدید غصہ آنے لگا تھا۔

کیا شوہر ایسے ہوتے ہیں۔ اس کی سہیلی سلمیٰ نے اپنے شوہر سے ایک ساڑھی کی فرمائش کی تھی، اس کے شوہر صابر نے فوراً اس کی فرمائش پوری کر دی۔ صابر اس سے مالی حیثیت میں کم تھا، لیکن بیوی اگر کوئی فرمائش کر دے، وہ فوری طور پر اسے پوری کر دیتا ہے، چاہے اسے کسی سے قرض ہی کیوں نہ لینا پڑے۔ ایک میرا شوہر ہے، جو قرض لینے سے ایسے بھاگتا ہے جیسے اس نے سود پہ پیسے لانے کی فرمائش کر دی ہے۔ زیب کو اس بات کا بھی اندازہ تھا، گھر والے اس کے گھر چھوڑ کر آنے والے اقدام کو پسند نہیں کریں، لیکن وہ صاف کہہ دے گی کہ اس کا کنجوس شوہر کے ساتھ نبھا کرنا، ناممکن ہو گیا ہے، اب چاہے کچھ بھی ہو جائے، وہ ظفر کے پاس نہیں جائے گی۔

ظفر جب دوپہر کو گھر پہنچا، دروازہ لاک تھا۔ اس نے دستک دی۔ جب زیب نے دروازہ نہیں کھولا، اس نے اپنی جیب ٹٹولی۔ اتفاق سے اس کی جیب میں چابی نکل آئی۔ وہ دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ گھر میں خاموشی تھی گھر میں ہر جگہ ظفر نے دیکھ ڈالی، کہیں بھی زیب موجود نہ تھی۔

"زیب کہاں چلی گئی۔ مجھے بتایا بھی نہیں۔" اس نے خود کلامی کی۔

اچانک اس کی نظر ٹیبل پر پڑی، وہاں ایک خط رکھا تھا۔ اس نے فوراً خط اٹھایا۔ خط میں لکھا تھا۔

"ظفر میں نے یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہے، اس خط کو دیکھ کر تمہیں ذہنی طور پر شدید دھچکا لگے گا، لگنا بھی چاہیے، گھر میں ایک بکری کا بچہ بھی پال لیا جائے تو اس سے انسیت ہو جاتی ہے، پھر ہم انسان ہیں۔ انتہائی افسوس کے ساتھ یہ بات لکھ رہی ہوں، ہم اب ساتھ نہیں چل سکتے۔ جہاں تک ہم دونوں میں خاصی حد تک ذہنی ہم آہنگی ہے وہاں اختلاف بھی ہے۔ تم اپنی بیوی کی کوئی خواہش پوری کرنے کے لیے کسی سے قرض نہیں لے سکتے، خدانخواستہ مجھے کوئی خطرناک بیماری ہو جاتی ہے تم مجھے بچانے کو قرض نہیں لو گے، یہ تمہارے اصول کے خلاف ہے۔ ایسے بے حس انسان سے مستقبل میں کیا توقع رکھ سکتی ہوں، میرا تمہیں چھوڑ دینا ہی بہتر ہے اس لیے میں ہمیشہ کے لیے گھر چھوڑ کر جا رہی ہوں۔ تمہارا دیا ہوا ایک تحفہ، پرانا موبائل بھی چھوڑے جا رہی ہوں۔ ایسے موبائل کو لے جا کر کیا کروں گی جو آئے دن خراب ہو جاتا ہے۔ اس کی بار، بار مرمت کرانی پڑتی ہے۔" ظفر وہ خط پڑھ کر سکتے میں آ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ زیب ایسا انتہائی قدم اٹھالے گی وہ تو زیب کو خوشیاں دینے کو ہی اتنی کنجوسی کر رہا تھا۔ وہ کرائے کے مکان سے آزادی حاصل کرنا چاہتا تھا کہ ان کا اپنا مکان ہو، ان کے بچوں کو کسی قسم کی کوئی پریشانی نہ ہو، مالک مکان آئے دن گھر خالی کرنے کی دھمکی نہ دے۔

دوسرے دن ظفر نے دفتر سے چھٹی لی اور سسرال پہنچ گیا۔ زیب کو ظفر کے اتنی جلدی سسرال آ جانے پر حیرت ہوئی۔ اس کا یہی خیال تھا کہ وہ خط پڑھ کر شدید غصے میں آ جائے گا۔ چودہ دن سے پہلے اس سے رابطہ نہیں کرے گا۔

"ظفر کیسے آنا ہوا؟" زیب نے طنز کیا۔

"تمہیں لینے آیا ہوں۔"

"میں تمہارے ساتھ نہیں جا رہی۔"

"ہم نے شادی کی ہے، یہ گڑیا گڈے کا کھیل نہیں ہے کہ جب چاہا ختم کر دیا۔ ذرا سوچو لوگ کیا سوچیں گے۔"

"سوچنے دو، لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں، تم کنجوس ہو، ان کے کہنے سے تمہاری شخصیت پر کون سا فرق پڑ جائے گا۔" زیب نے کہا۔

"اللہ جانتا ہے، میں کنجوس نہیں ہوں، یہ کنجوسی میں جو کر رہا ہوں تمہارے بھلے کے لیے کر رہا ہوں۔"

"میرے بھلے کے لیے کر رہے ہو، میرا آج تک تو بھلا ہو نہیں سکا، پھر فائدہ اس کنجوسی کرنے کا۔"

"ابھی تمہیں اندازہ نہیں ہو رہا، جب تم اپنے ذاتی گھر میں رہو گی، اس وقت اندازہ ہوگا، اپنے ذاتی گھر میں کتنا سکون ہوتا ہے۔"

"ٹھیک ہے، جب ذاتی گھر لے لو اس وقت آ جانا۔"

"زیب بچوں کی طرح ضد نہیں کرو اور میرے ساتھ چل دو۔"

"میں نے کہہ دیا کہ میں تمہارے ساتھ نہیں جاؤں

گی۔"

"تمہارے بغیر گھر سونا سونا ہو گیا ہے۔" ظفر نے کہا۔

"ایسے گھر میں جا کر کیا کروں جہاں بیوی کی کوئی عزت نہ ہو۔"

"خدا گواہ ہے، میں نے خود سے بڑھ کر تمہیں عزت دی ہے۔"

"ایسی خالی خولی عزت کا میں کیا کروں، گھر میں کھل کر خرچ نہیں کرتے، نہ خرچ دیتے ہو، کہیں گھمانے بھی نہیں لے جاتے۔"

"کچھ مہلت دے دو، میں تمہارے سارے ارمان پورے کروں گا۔ بس ایک بار اپنے ذاتی گھر ہم چلے جائیں۔"

"میں نے ایک بار کہہ دیا ہے، اب میں نہیں جاؤں گی۔"

"عورت کی عزت، اس کے اپنے گھر میں ہوتی ہے۔ شادی ہونے پر والدین کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ ان کی بیٹی سسرال میں آباد رہے۔ اسی میں ان کی خوشی پوشیدہ ہوتی ہے۔"

"میں سب سمجھتی ہوں لیکن شوہر بھی تو ایسا ہو جو بیوی کی قدر کرے، اس کی خواہشات کا گلا نہ گھونٹ دے۔"

"زیب تم بہت غصے میں ہو تمہارا غصہ بجا ہے۔ میں نے ذاتی گھر کے چکر میں تمہارے وہ ارمان پورے نہیں کیے جو بیوی شادی کے شروع کے دنوں چاہتی ہے۔"

"شکر ہے تم نے یہ بات قبول کر لی۔"

"میں بے حس انسان نہیں ہوں، وقتی طور پر مصلحت سے کام لے رہا ہوں۔ اس کا اندازہ تمہیں اپنے ذاتی گھر میں ہو جائے گا۔"

"میں تمہاری باتوں میں آنے والی نہیں ہوں۔ ایک بات کہہ دی کہ اب نہیں جاؤں گی۔"

"میں تمہیں کیسے سمجھاؤں۔"

"نہ سمجھاؤ تو بہتر ہے۔"

"زیب مان جاؤ۔"

"مجھے منانے کی ضد چھوڑ دو اور کراچی چلے جاؤ۔"

"تمہارے بغیر چلا جاؤں۔" ظفر نے کہا۔

"ہاں۔"

"زیب میں تمہیں لینے آیا ہوں اور ساتھ لے کر جاؤں گا۔" ظفر نے کہا۔

"میں جب جاؤں گی تو آ کر لے جاؤ گے۔" زیب نے کہا۔

ظفر نے لاکھ کوشش کی، کسی طرح زیب گھر جانے کو تیار ہو جائے لیکن وہ نہ مانی۔ اس کے والدین کی بھی خواہش تھی کہ وہ اپنا گھر خراب نہ کرے اور ظفر کے ساتھ چلی جائے۔ زیب ضد پر آ گئی تھی۔ وہ ساتھ نہیں گئی۔ ظفر کو زیب پر سخت غصہ تھا مگر غصہ دکھانے پر بات بگڑ جاتی، وہ زیب سے محبت کرتا تھا اس لیے صبر کا گھونٹ پی لیا، یہ سوچ کر کہ کچھ وقت گزرنے پر اسے ضرور احساس ہو جائے گا، اس نے میکے میں رہ کر اچھا نہیں کیا۔

وہ اکیلا کراچی لوٹ آیا۔ اسے وقتی طور پر زیب کے نہ آنے پر تکلیف ضرور ہوئی تھی۔ وہ یہ بات اچھی طرح سمجھتا تھا کہ زیب اپنے رویے پر ضرور شرمندہ ہو گی اور گھر لوٹ آئے گی۔ زیب کا غصہ ٹھنڈا ہونے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ مہینا گزرا، دو مہینے گزرے، تیسرا مہینا بھی گزر گیا، وہ سسرال نہیں آئی۔ ظفر پھر بھی مایوس نہیں ہوا تھا، اسے پورا یقین تھا کہ وہ ضرور شرمندہ ہو کر گھر لوٹے گی۔

اتوار کا دن تھا۔ زیب اپنی سہیلی سارا کے گھر چلی گئی۔ اس کی کئی ماہ سے سارا سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ ابھی وہ دروازے پر دستک دینے ہی والی تھی کہ اندر سے نوازش اور سارا کی زور زور سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ یہ سوچ کر حیرت میں پڑ گئی کہ ان دونوں میں بہت محبت ہے۔ ان میں کبھی کسی بات پر جھگڑا نہیں ہوا، پھر آج یہ سب کیا ہوا ہے۔ زیب سہیلی کے پاس خوش، خوش آئی تھی۔ لیکن وہ اب سوچ رہی تھی کہ واپس پلٹ جائے، اچانک دھڑام سے دروازہ کھلا اور نوازش اس کی طرف دیکھے بغیر گھر سے نکل گیا۔ نوازش کے باہر چلے جانے پر زیب کی ہمت بندھی اور اندر داخل ہو گئی۔ سارا کا چہرہ بتا رہا تھا وہ بہت غصے میں ہے۔

"کیا بات ہے! سارا بہت غصے میں ہو؟" اس نے پوچھا۔

"ہاں بات ہی ایسی ہے، اس شخص نے میری زندگی اجیرن کر کے رکھ دی ہے۔"

"میرا خیال ہے، تم دونوں کی آئیڈیل زندگی گزر رہی ہے۔"

"کیا خاک گزر رہی ہے۔"

"کیا ہوا ہے، کچھ بتاؤ بھی۔"

"آج مالک مکان نے مکان خالی کرنے کا حکم دے دیا ہے۔"

"مکان خالی کرنے کا حکم دے دیا لیکن کیوں؟"

"جب کئی کئی ماہ کرایہ ادا نہ کرو گے تو مالک مکان خالی کرنے کا بولے گا ہی۔"

"کوئی اور مکان کرائے پر لے لو۔"

"اتنی آسانی سے کرائے کے مکان کہاں ملتے ہیں، اوپر سے ایڈوانس بھی بہت زیادہ مانگتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔"

"مکان کے مالک کا دماغ ساتویں آسمان پر پہنچا ہوا ہے، وقت پر کرایہ ادا کرنے پر دھمکیاں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اب تم ہی بتاؤ، میں کیا کروں، کئی مکانات خالی کر چکی ہوں، گھر سے دوسرے گھر میں سامان پہنچانا آسان بات ہے؟ اکثر کئی قیمتی چیزیں ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔"

"نوازش کئی کئی ماہ کرایہ کیوں نہیں دیتا۔"

"جب تنخواہ ہاتھ میں آتی ہے، خوب کھل کر عیاشیاں شروع کر دیتا ہے، مہینے کے آخر میں جب جیب خالی ہوتی ہے پھر آفس کے ساتھیوں اور دیگر دوستوں سے پیسے ادھار لے کر گھر کا خرچ چلاتا ہے۔"

"اس طرح کھلا خرچا نہیں کرنا چاہیے۔" زیب نے کہا۔

"میں بھی سمجھاتی ہوں، ایسا نہیں کرو، لیکن اس کی سمجھ میں نہیں آتا۔"

"نوازش تمہیں تفریح کرانے کو اکثر مختلف مقامات پر لے کر جاتا رہتا ہے، اس پر بھی ٹھیک ٹھاک خرچا ہو جاتا ہوگا۔" زیب نے کہا۔

"گھومنا پھرنا، اتنا آسان نہیں ہے، اچھی خاصی رقم خرچ ہو جاتی ہے۔"

"تمہیں ابتدا میں گھومنے پھرنے پر کنٹرول کرنا چاہیے تھا۔"

"مجھے پتا کوئی تھا کہ نوازش کی تنخواہ کم ہے، جس طرح وہ مجھ پر خرچ کرتا تھا، میں سمجھتی تھی، اس کی تنخواہ بہت زیادہ ہے جبھی اتنا خرچا کرتا ہے۔"

"میں سمجھتی تھی، تم نوازش کے ساتھ بہت خوش ہو۔"

"جب تک حقیقت کا علم نہیں تھا، بہت خوش تھی۔" سارا نے ایک سرد آہ بھری۔

زیب اب تک سارا کو خوش قسمت سمجھتی تھی۔ آج کے انکشاف نے اسے حیرت زدہ کر دیا تھا۔ وہ کچھ دیر سارا کے پاس بیٹھی رہی۔ اسے سمجھایا کہ اس کے شوہر کا ہاتھ کھلا ہے، لیکن اسے کچھ کرنا ہوگا، خرچے پر کنٹرول کرنا ہوگا، جبھی معاملات بہتر ہو سکتے ہیں۔ سارا نے اس کے سمجھانے پر اسے یقین دلایا کہ وہ اب ایسا ہی کرے گی۔ رات کو جب زیب سونے کو لیٹی، اسے بے اختیار ظفر پر پیار آیا، اس کے نزدیک ظفر کنجوس تھا لیکن اس کے ہر ماہ وقت پر کرایہ دینے پر مالک مکان بہت خوش تھا۔ جب بھی وہ مکان تبدیل کرنے کی سوچتا، مالک مکان کہتا۔ "تمہیں مجھ سے کوئی تکلیف ہے۔"

"نہیں۔" ظفر کہتا۔

"پھر کیوں اتنا اچھا محلہ اور گھر چھوڑ کر جانا چاہتے ہو۔"

ظفر مالک مکان کی بات سن کر لاجواب ہو جاتا اور مکان خالی کرنے کا ارادہ تبدیل کر دیتا۔

میکے میں زیب کو چار ماہ کا عرصہ گزر گیا تھا۔ اس دوران ظفر نے اس کے بھائی عمران کے موبائل پر کئی بار بات کی اور اسے ناراضی ختم کر دینے اور گھر آنے کو کہا تھا لیکن وہ اپنی ضد پر قائم رہی۔ اس لیے ظفر کا اسے لاہور آ کر لے جانے کا حوصلہ نہ ہوا تھا۔ وہ پُرامید تھا، زیب ایک دن ضرور گھر آ جائے گی۔ وہ محسوس کر رہی تھی اتنے دن میکے میں رہنے سے اس کی گھر، محلے اور رشتے داروں میں جو عزت تھی، وہ اب نہیں رہی تھی۔ سب اسے ہی قصوروار سمجھ رہے تھے۔ ان کی یہی خواہش تھی۔ زیب کو اپنے گھر چلے جانا چاہیے، عورت کا اصل گھر اس کا سسرال ہی ہوتا ہے۔

وہ اب ظفر کے پاس جانا چاہتی تھی۔ اس کی انا آڑے آ رہی تھی، وہ کس منہ سے کہتی کہ سسرال آنا چاہتی ہے۔ صبح میں ظفر کی کال آ گئی۔ اس کے لہجے سے محسوس ہو رہا تھا کہ وہ بہت خوش ہے۔

"زیب میں تمہیں بہت جلد ایک سرپرائز دوں گا۔"

"ٹھیک ہے، لیکن یہ سرپرائز کراچی میں لینا پسند کروں گی کسی اچھی جگہ پر۔" وہ بولی۔

"آ جاؤ کراچی، تمہیں کس نے روکا ہے۔" ظفر نے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں آ رہی ہوں۔" زیب نے کہا۔

"آنے سے قبل بتا دینا، کس ٹرین سے آ رہی ہو۔"

"وہ کیوں؟"

"بتا دو گی نہیں تو میں تمہیں اسٹیشن لینے کیسے آؤں گا۔" ظفر نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔

دوسرے دن زیب النساء ٹرین سے کراچی پہنچ گئی۔ ظفر اسٹیشن پر ہی موجود تھا۔ وہ زیب کو اسٹیشن سے گھر لے آیا۔ سفر میں زیب تھک گئی تھی اس لیے رات جلد ہی سوگئی۔ صبح ہونے پر ظفر آفس چلا گیا۔ اس نے زیب کے گھر آجانے پر اس سے کسی قسم کا شکوہ نہیں کیا اور نہ ہی اس کے اتنے دن میکے رہنے پر ناراضگی کا اظہار کیا، ظفر اس بات پر خوش تھا کہ وہ اپنے گھر لوٹ آئی ہے۔

شام کو ظفر جلدی گھر آگیا اور آتے ہی اس سے بولا۔ "زیب جلدی سے تیار ہوجاؤ، آج ہم کلفٹن گھومنے جائیں گے۔"

"کیا.....!" زیب نے حیرت سے ظفر کی طرف دیکھا۔

"جو تم نے سنا، وہی بولا ہے، تمہاری خواہش تھی کہ خوشی کی خبر کسی اچھی جگہ پر سناؤں، اس لیے تمہیں کلفٹن لے جا رہا ہوں۔" ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"گھومنے پر خاصے پیسے خرچ ہوجائیں گے۔" زیب نے کہا۔

"ہوجانے دو، تم سے اچھے نہیں ہیں۔"

"لگتا ہے، میرے چار مہینے یہاں نہ رہنے پر کچھ بچت ہوگئی ہے۔" زیب مسکرائی۔

"اس میں کوئی شک نہیں ہے، بچت ہوئی ہے، جو خوشی کی خبر مجھے تمہیں چھ ماہ بعد سنانی تھی، وہ اب سنانے کے قابل ہوگیا ہوں۔" ظفر نے اثبات میں گردن ہلائی۔

اس کے اصرار پر وہ تیار ہوگئی۔ ظفر نے گھومنے کے لیے کار منگوائی تھی۔ دونوں کار میں بیٹھ کر کلفٹن گئے۔ خوب انجوائے کیا۔ شادی کے بعد پہلی بار وہ ظفر کے ساتھ گھومنے نکلی تھی۔ اسے بڑی خوشی ہورہی تھی، ظفر کے ساتھ گھومتے ہوئے۔

زیب جب آئس کریم کھا رہی تھی۔ ظفر اس کے نزدیک آیا، اور بولا۔ "اب وہ خوشی کی خبر سنادوں۔"

"ہاں! سنادو۔" وہ بولی۔

"میں تمہیں ایک تحفہ دینا چاہتا ہوں۔"

"تحفہ....." زیب نے چونک کر اسے دیکھا۔

"ہاں تحفہ۔"

"کیا کوئی پرائز بونڈ نکل آیا ہے جو مجھے تحفہ دینا چاہتے ہو۔"

"ہاں ایسا ہی سمجھ لو۔" یہ کہتے ہوئے ظفر نے چابی زیب کی طرف بڑھائی۔

"یہ کیا ہے؟"

"ہمارے فلیٹ کی چابی۔"

"فلیٹ کی چابی....." زیب نے حیرت سے ظفر کو دیکھا۔

"ہاں زیب، ہم اب ایک عدد فلیٹ کے مالک بن چکے ہیں، میں نے تمہیں کہا تھا کہ کچھ اقساط باقی رہ گئی ہیں، قسطیں پوری ہونے پر فلیٹ کا قبضہ مل جائے گا۔ بچت سے میں نے قبل از وقت بقایا اقساط جمع کرکے قبضہ حاصل کرلیا ہے۔"

"اس کا مطلب ہے، ہم اب کرائے کے مکان میں نہیں رہیں گے۔" زیب نے کہا۔

"جب ذاتی فلیٹ مل گیا ہے، پھر کیوں کرائے کے مکان میں رہیں۔"

"ظفر تم نے دکھ، تکلیف سہ کر اپنے مقصد میں کامیابی حاصل کرہی لی۔" زیب کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔

"میں نے فلیٹ کی جستجو کی، اس کے لیے اپنی خواہشات کی قربانیاں دیں، تب کہیں جاکر فلیٹ حاصل کیا ہے۔"

"تم کو میں غلط سمجھتی رہی، طعنے دیے، لیکن تم اپنے مقصد پر ڈٹے رہے، ظفر مجھے معاف کردو، تمہیں بہت ستایا ہے میں نے۔" زیب نے کہا۔

"مجھے پورا یقین تھا، فلیٹ حاصل ہوجانے پر تم سب کچھ بھول جاؤ گی۔"

"ہاں شکایت اپنوں ہی سے ہوتی ہے، میں تمہاری بیوی ہوں، تمہاری کامیابی، میری کامیابی ہے۔"

"آج سے ہماری زندگی کا نیا باب شروع ہوگا۔" ظفر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"ہاں! ایسا ہی ہے۔" زیب نے فلیٹ کی چابیوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔

"کاش میں تمہاری دوراندیشی سمجھ سکتی۔ لمحہ بھر کی خوشی کے لیے بڑی خوشی قربان کررہی تھی!"

زیب کا گلا بھر آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ظفر نے کہا۔ "میں ان آنسوؤں کو بہنے سے روکنے کے لیے ہی تو کنجوسی کررہا تھا اس لیے آنسو روکو ورنہ میں پھر کنجوسی پر اتر آؤں گا۔"

"اب دیکھنا میں تم سے زیادہ کنجوس ہوجاؤں گی۔" زیب کے ساتھ وہ بھی ہنسنے لگا۔

++

# خالی بیڈ

محترم مدیر
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی آپ کو سوچنے پر مجبور کردے گی۔ یہ صرف کاشان کی آپ بیتی نہیں ہے، ایک آئینہ ہے جس میں ہمارا پورا معاشرہ ننگا نظر آئے گا۔ قارئین کو بھی پسند آئے گی۔
شمع تفسیر
(کراچی)

معلوم نہیں کراچی کے سرکاری اسپتالوں کے ڈاکٹروں کی عمومی رائے یہ کیوں ہے کہ ساٹھ سال سے زیادہ کے مریض کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں...... میرے اس تلخ جملے کے پس منظر میں میرے تجربات ہیں، تلخ تجربات۔

”میری والدہ کا انتقال اس وقت ہوا تھا جب میں بہت چھوٹا تھا۔ ابو جی اس وقت سرکاری ملازم تھے، جوان تھے، چاہتے تو دوسری شادی کر سکتے تھے جبکہ بچوں کی بھی کوئی فوج نہ تھی، میں ہی اکلوتا چشم و چراغ تھا۔ دادی، پھوپیاں یہاں

تک کر بولی کے اصرار کے باوجود بھی انہوں نے دوسری شادی نہ کی کہ شان کا کیا ہوگا، ہوسکتی ماں جانے کیا سلوک کرے۔" یہی کہہ کر وہ شادی کی تجویز رد کر دیتے تھے۔ میری پرورش انہوں نے خود کی، ڈھیر سارا وقت مجھے دیتے تھے۔ انہوں نے پرائیویٹ جاب کر لی کیونکہ ان کی ٹائمنگ ایسی تھی کہ وہ گھر پر بھی دسترس حاصل تھی۔

ہمارے ہاں عام طریقہ یہ ہے کہ لوگ تعلقات اور سفارش کے بڑے عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں مگر قابلیت صفر ہوتی ہے، سو میرے ابو جی جیسے لائق کی ایسے لوگوں کو بہت ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے عوض بھی پانچ ہزار تو کبھی دس ہزار اضافی آمدنی ہو جاتی گو کہ ابو جی کی صلاحیتوں کی بہت کم قیمت لگائی گئی تھی تاہم ابو جی کی پنشن کے ساتھ ملا کر یہ رقم ہمارے لیے کافی تھی۔ ابو جی کا معمول تھا کہ جو کماتے وہ مجھ پر اور اپنے بھائی بہن کے بچوں پر خرچ کر دیتے۔ ہر روز آفس سے واپسی پر تھیلا بھر سامان لاتے جس میں کبھی کھانے پینے کی چیزیں ہوتیں، کبھی میرے کپڑے جوتے، کبھی گھر کے دوسرے پورشنز میں رہنے والوں کے لیے تحفے تحائف۔

میرے تین چچا اور ایک پھوپھی اسی مشترکہ گھر کے پورشنز میں رہائش پذیر تھے۔

یہ سب بتانے کا مقصد آپ کو یہ باور کروانا ہے کہ ابو جی باسٹھ سال کی عمر میں بھی اس معاشرے کے کارآمد اور فعال شخص تھے۔

جانے قدرت کو کیا منظور تھا کہ دفتر میں ہی ابو جی کو فالج کا اٹیک ہوا اور آفس والوں کا احسان یہ کہ وہ انہیں اسپتال لے گئے۔ ابو جی اگر بڑے افسر ہوتے تو یقیناً انہیں کسی پرائیویٹ اسپتال لے جایا جاتا اور ان کا خرچ بھی کمپنی برداشت کر لیتی لیکن ابو جی ایک ماتحت تھے اس لیے آفس کے کچھ آدمی انہیں ایک بڑے سرکاری اسپتال لے آئے، وہیں سے مجھے فون کر دیا گیا۔

میں چھوٹے چچا کے ساتھ وہاں افتاں و خیزاں پہنچا تو پتا چلا کہ ابو جی کی سیدھی سائیڈ پر فالج کا اٹیک ہوا ہے۔ مگر حیرت تو اس بات پر ہوئی کہ سی ٹی اسکین اور دوا انجکشن لگانے کے بعد ابو جی کو ڈسچارج کرنے کا عندیہ دے دیا گیا۔ کوئی سینئر ڈاکٹر جنرل وارڈ میں دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ سارا کا سارا اسٹاف ہاؤس جاب کرنے والوں پر مشتمل تھا۔

"اتنا شدید فالج کا اٹیک ہے اور آپ انہیں ڈسچارج کر رہے ہیں۔" میں نے احتجاجی انداز میں جونیئر ڈاکٹر سے کہا۔

"دیکھیں ہمارے پاس بیڈ خالی نہیں ہے، یہ بیڈ بھی بک ہے، جس پر آپ کے پیشنٹ ہیں اور آپ کا پیشنٹ تو ویسے بھی آؤٹ آف ڈینجر ہے۔" ہاؤس جاب کرنے والا ایک نوجوان ڈاکٹر بے حسی سے بولا۔

"کیا مطلب ہے آپ کا آؤٹ آف ڈینجر ہیں؟" میں چیخ گیا۔

"آپ اپنے پیشنٹ کو برائے کرم لے جائیں یہ میڈیسن یوز کرواتے رہیں۔ اب یہ او کے ہیں۔ گھر لے جا کر فزیوتھراپی وغیرہ کرائیں۔" ایک کم عمر لڑکی جس نے ڈاکٹروں والا سفید کوٹ پہن رکھا تھا میرے ہاتھ میں پرچہ تھما کر بولی۔

چھوٹے چچا نے میرا ہاتھ دبا کر مجھے مزید کچھ کہنے سے روک دیا۔ میں نے بھی اس جنرل وارڈ کا ماحول دیکھا۔ نفسا نفسی کا عالم تھا۔ ڈاکٹرز آنکھیں ماتھے پر رکھے گھوم رہے تھے۔ ہر طرف بدحال مریض تھے۔ یہاں رہ کر بھی ابو جی کا علاج ہونا ممکن نظر نہ آتا تھا۔ ہم ابو جی کو گھر لے آئے اور یہی میری زندگی کی سب سے بھیانک غلطی تھی۔ کاش میں ابو جی کو گھر لانے کے بجائے کسی پرائیویٹ اسپتال لے جاتا لیکن اس وقت بظاہر ابو جی کی طبیعت نارمل نظر آ رہی تھی۔ کاش وہ جونیئر ڈاکٹرز ہمیں صحیح صورت حال سے آگاہ کر دیتے جو ان کی پیشہ ورانہ ذمہ داری تھی۔

گھر تو لے آئے مگر رات بارہ بجے کے بعد ان کی اس طرح طبیعت بگڑی کہ فوراً ایمبولینس بلوانی پڑی، ایک بار پھر وہیں پہنچے۔ آج کے معاشرے میں غریب اتنا مجبور ہے کہ دوا اور علاج تک افورڈ نہیں کر سکتا یا یوں کہہ دیں کہ دوا اور علاج غریب کیا مڈل کلاس لوگوں کی دسترس سے بھی دور ہو چکے ہیں۔ لے دے کر انہی سرکاری اسپتالوں کا آسرا ہے جو ان بے آسرا مریضوں کو یوں دیکھتے ہیں جیسے یہ مریض نہ ہوں بھکاری ہوں، بلاسبب ہی غرور ان ڈاکٹروں کی گردنوں میں سریے کی طرح فٹ ہے حالانکہ سرکار سے بھاری تنخواہ وصول کر رہے ہیں۔ بہر طور میں اور میرا چچا زاد بھائی سہیل ابو جی کو اسٹریچر پر لٹائے اسپتال کے ایک شعبے سے دوسرے شعبے کی طرف اور دوسرے شعبے سے تیسرے کی طرف بوکھلائے ہوئے گھوم رہے تھے۔ شعبہ ایمرجنسی میں دو گھنٹے انتظار کروا دیا گیا!

اس سے قبل ٹی وی کے ذریعے خبریں ملتی رہتی تھیں کہ غریب کے بچے کی پیدائش اسپتال کے کوریڈور میں ہو گئی یا بوڑھے مریض اسپتال کے ٹھنڈے فرش پر سکڑے پڑے ہیں لیکن جب اپنے ساتھ گزری تو ان تلخ حقائق نے مکمل طور پر اپنا تعارف کروایا۔ میری پوری کوشش یہ تھی کہ کسی طرح ابو جی کو ایمرجنسی وارڈ میں داخل کروا دوں تاکہ انہیں ابتدائی طبی امداد مل جائے۔

"بیڈ خالی نہیں ہے۔" ایک جونیئر ڈاکٹر سے جب بہت ہی التجا کی تو اس نے جواب کی زحمت گوارا کی۔

"ڈاکٹر صاحب میرے تایا جی کی سانس اکھڑ رہی ہے اور آپ کہتے ہیں بیڈ خالی نہیں ہے پھر ایمرجنسی وارڈ کن مریضوں کے لیے ہوتا ہے؟" سہیل نے تند و تیز لہجے میں کہا۔

"ہم ایکسیوز می صرف آپ کے تایا جی بیمار نہیں ہیں پورا اسپتال مریضوں سے بھرا ہے، آپ انہیں گھر لے جائیں صبح نو بجے کے بعد لائیں شاید کوئی بیڈ خالی ہو جائے۔" اس جونیئر ڈاکٹر کی ساتھی ڈاکٹر جذبات سے عاری لہجے میں بولی۔

"صبح نو بجے تک کی گارنٹی آپ مجھے دیں گی کہ میرے والد صاحب کو کچھ نہیں ہوگا، کیا ان کی سانسوں کے چلنے کی ضمانت آپ مجھے دیں گی۔" میں نے غصے سے کہا۔

"ارے بھائی کیا ہو گیا آپ کو...... کیسی پاگلوں جیسی بات کر رہے ہیں آپ، یہ گارنٹی تو بس اللہ کے پاس ہے اور ویسے بھی آپ کے والد کی ایج اتنی ہو چکی ہے کہ......" وہ کچھ کہتے کہتے رک گئی۔

"ہاں کیوں کہ یہ محنت طلب کیس ہے اور میرے والد آؤٹ آف ڈینجر ہیں اسی لیے آپ کے پاس بیڈ خالی نہیں ہے میں سمجھ گیا...... مگر میں بھولوں گا نہیں قیامت کے روز پکڑوں گا تم سب ڈاکٹروں کو۔" میں نے انگلی اٹھا کر کہا اور اسٹریچر کا رخ باہر کی جانب کیا۔ سہیل میرے ہمراہ تھا۔

☆☆☆

یہ ایک اور بڑا سرکاری اسپتال تھا مگر میرے جاں بلب والد کے لیے یہاں بھی بیڈ خالی نہیں تھا۔ میں مجبور ہو گیا تھا آہستہ آہستہ ان اسپتالوں کے مارے ہوئے والے ظالم دساتیر کو، اگر کوئی مریض محنت طلب ہو اور بوڑھا بھی ہو تو یہ کہہ کر جان چھڑا لی جائے کہ بیڈ خالی نہیں ہے!

نظروں میں ان سے التجا کر رہا تھا کہ مجھے چھوڑ کر مت جائیے گا۔ میں تنہا ہو جاؤں گا۔ وہ پلکیں جھپک جھپک کر مجھے تسلی دے رہے تھے۔ زبان ہلانے سے قاصر تھے۔ یہاں ایک ڈاکٹر نے قدرے نرمی سے بات کی اور بتایا کہ رات کے اس پہر یہاں کوئی نیورو سرجن موجود نہیں ہے اور نہ ہی کوئی بیڈ خالی ہے اس لیے یہاں رکنا سوائے وقت کے ضیاع کے اور کچھ بھی نہیں ہے۔ اس اسپتال سے مایوس ہونے کے بعد ہم شہر کے دوسرے کونے کی طرف چلے آئے۔ رات بھیگتی جا رہی تھی اور سامنے ایک بہت عظیم الشان اسپتال جو ایک میڈیکل کالج و یونیورسٹی بھی تھا۔ اس اسپتال کے بارے میں، میں نے سن رکھا تھا کہ پرائیویٹ ہونے کے باوجود یہاں علاج نسبتاً سستا تھا۔ یہاں بھی ہاؤس جاب کرنے والے ڈاکٹرز تھے انہوں نے ہاتھوں ہاتھ کیس لے لیا۔ ابو جی کو ایمرجنسی وارڈ میں بیڈ پر لٹا دیا گیا۔ آکسیجن لگا دی گئی۔ پیپر پر اسٹک مارکر پیپر کی موومنٹ چیک کی گئی۔ اس وقت ابو جی بالکل ساکت تھے۔ سانس بہت مدھم تھی۔ سارا کا سارا اسٹاف جونیئر ڈاکٹرز پر مشتمل تھا۔ شاید اسی لیے وہ ابو جی کی کنڈیشن دیکھ کر گھبرا گئے حالانکہ ہم نے یقین دہانی کروا دی تھی کہ ان کی ریکوائرمنٹ کے مطابق ہم سی ہزار روپے دو گھنٹے کے اندر جمع کروا دیں گے۔ آپ پیشنٹ کو ایڈمٹ کر لیں۔

"سوری جناب بیڈ خالی نہیں ہے۔" فیمیل ڈیوٹی انچارج نے سرد لہجے میں کہا۔

"مگر آپ نے تو کہا تھا کہ آپ ایڈمٹ کر رہے ہیں۔" میں نے حیرت آمیز مایوسی سے کہا۔

"جی مگر کیا کریں بیڈ ہی خالی نہیں ہے۔" سرد تاثرات والی ڈیوٹی انچارج نے اپنی بات دہرائی۔

"مگر ابھی تو آپ نے کہا تھا......" سہیل کی بات ادھوری رہ گئی۔

"جب کہا تھا سو کہا تھا...... ابھی فوراً آپ ایمبولینس کو کال کریں اور لے کر جائیں اپنے پیشنٹ کو۔" وہ بات کاٹ کر سخت لہجے میں بولی۔

"ارے ایسے کیسے لے جائیں...... آپ دیکھ نہیں رہیں سانس لینے میں کتنی دقت ہے انہیں۔" میں نے ملامت بھرے لہجے میں کہا۔

"ارے بھائی صاحب! ہمیں یہ بیڈ خالی چاہیے ہم

کریں آپ ایمبولینس کو۔" وہ اپنی ہٹ پر قائم تھی۔
"آپ آئی سی یو میں شفٹ کریں ناں میرے والد کو۔" میں نے زور دیا۔
"کہا ناں! وہاں بھی بیڈ خالی نہیں ہے، جلدی لے جائیں آپ اپنے پیشنٹ کو۔" وہ نخوت بھرے انداز میں ابو جی کی سیریس کنڈیشن کو دیکھ کر بولی۔ اس کی جلدی جلدی کی گردان سے مجھے گھبراہٹ ہو رہی تھی۔ میں نے ابو جی کی دھندلائی ہوئی آنکھوں کی طرف دیکھا تو انہوں نے ایک لمحے کے لیے آنکھوں کو بند کر کے کھولا جیسے اس بے بسی کی کیفیت میں بھی مجھے سب ٹھیک ہو جائے گا کا تسلی دے رہے ہوں۔ آخر میں ان کا لاڈلا جو تھا وہ مجھے بھلا کس طرح پریشان دیکھ سکتے تھے..... میں نے بڑھ کر ان کا ماتھا چوم لیا۔
ڈاکٹرز کے لیے میرے ابو جی آخر کسی کے ایک غیر اہم شخص تھے جو اپنی زندگی جی چکے تھے اور اب ان کی زندگی بچانے کی کوشش کرنا وقت کا ضیاع تھا مگر کوئی مجھ سے پوچھتا۔ میرے ابو جی میری زندگی تھے۔ انہوں نے کل تک مجھے گھر بٹھا کر کھلایا تھا اور آج بھی گھر میں ان کا کمایا اور لایا ہوا راشن موجود تھا۔ انہوں نے عمر بھر پیسا نہیں عزت کمائی تھی۔

☆☆☆

صبح کے ساڑھے چار بج رہے تھے۔ سڑکوں پر ہُو کا عالم تھا ہم اسٹیڈیم روڈ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ یہاں شہر کے دو بڑے اور معروف پرائیویٹ اسپتال تھے۔ اس وقت میری جیب میں کل گیارہ ہزار روپے تھے جو گھر سے چلتے وقت فاتی چچا نے میرے ہاتھ میں دبا دیے تھے جبکہ ابو جی کے والٹ سے تین ہزار روپے برآمد ہوئے تھے۔
"تایا جی کی حالت بہت خراب ہے کاشان۔" سہیل فکر مندی سے بولا۔
"ہاں یار بے بسی سی بے بسی ہے، غریب آدمی جائے تو کہاں جائے۔ ڈھائی ہزار روپیا تو اب تک ایمبولینس میں خرچ ہو چکا ہے، اگر میں کہیں قرض ادھار کچھ بھی کر کے اس اسپتال میں علاج کرواؤں گا ابو جی کا۔ اپنی بائیک بھی کل ہی بیچ دوں گا بس کاش یہاں بیڈ خالی مل جائے۔" میں نے پرعزم لہجے میں کہا۔
"تایا جی کی محبتوں کے تو ہم بھی مقروض ہیں کاشان، جتنا بھی ہو سکا ہم انتظام ضرور کریں گے پیسوں کا۔" سہیل ابو جی کے ماتھے کو نرمی سے سہلاتے ہوئے بولا۔ اس وقت ایمبولینس اس وسیع و عریض اسپتال کی پارکنگ میں رک گئی۔ اس اسپتال کی وجہ شہرت یہاں کے قابل ڈاکٹرز اور جدید سہولیات کے علاوہ ایک مشہور ٹی وی ڈراما بھی تھا جس کی شوٹنگ چند سال پہلے اس اسپتال میں ہوئی تھی۔
"سہیل تو یہیں ایمبولینس میں ٹھہر ابو جی کے پاس، میں اندر جا کر معلومات حاصل کر کے آتا ہوں۔ بار بار ابو جی کو اذیت دینا ٹھیک نہیں ہے، کتنی بار ابو جی کو ایمبولینس سے اسٹریچر اور اسٹریچر سے بیڈ اور پھر دوبارہ اسٹریچر سے ایمبولینس میں لٹایا ہے یار..... ابو جی تو بول بھی نہیں پا رہے کہ اپنی تکلیف کا اظہار ہی کر دیں۔" میری آواز بھرا گئی۔
"تو جا یار بیڈ اور چارجز وغیرہ پتا کر کے آ، میں ہوں تایا جی کے پاس۔" سہیل میرا شانہ تھپتھپا کر بولا تو میں تیز تیز قدم اٹھاتا اسپتال کے اندرونی حصے کی طرف بڑھ گیا۔ ریسپشن کاؤنٹر سے رجوع کرنے کے بجائے میں سیدھا ایمرجنسی وارڈ کی طرف بڑھ گیا مگر وہاں موجود گارڈ نے مجھے اندر جانے سے روک دیا۔
"دیکھیں میرے والد کی بہت سیریس کنڈیشن ہے مجھے ایڈمٹ کروانا ہے انہیں۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔
"گل خان..... ڈاکٹر رفیع کو بتاؤ۔" اس گارڈ نے اندر جاتے ہوئے وارڈ بوائے سے کہا۔
"ڈاکٹر رفیع کون ہیں۔" میں نے اضطراری کیفیت میں پوچھا۔
"وہ رہے سامنے۔" اس نے شیشے کے پار اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا وہ ایک لمبے قد کے ڈیشنگ پرسنالٹی والے ادھیڑ عمر ڈاکٹر تھے۔ ان کی اجازت پر مجھے اندر بھیج دیا گیا۔
"السلام علیکم۔" میں نے مرعوب ہو کر سلام کیا۔
"وعلیکم السلام جی فرمائیے۔" ڈاکٹر رفیع نے خوش اخلاقی سے کہا۔
"سر میرے والد کو کل فالج کا بہت شدید اٹیک ہوا ہے..... دماغ کا بھی کچھ حصہ متاثر ہوا ہے سیدھی سائیڈ مکمل مفلوج ہے۔ وہ بول بھی نہیں پا رہے۔ میں انہیں یہاں ایڈمٹ کروانا چاہتا ہوں۔" اتنا کہہ کر میں خاموش ہو گیا۔ چارجز کے بارے میں ایک دم سے پوچھنا مناسب نہ لگا..... ایک دو کو چھوڑ کر یہاں تقریباً سب ہی امارت چھلکاتے چہرے نظر آ رہے تھے جبکہ میرا موجودہ حلیہ اپنی زبوں حالی کی داستان آپ سنا رہا تھا۔



"دیکھیں..... ابھی تو بیڈ خالی نہیں ہے تاہم کل تک یہ سیٹل ہو سکتی ہے۔" ڈاکٹر رفیع کا انداز مجھے امید افزا لگا۔
"لیکن اس وقت بھی انہیں سانس صحیح نہیں آ رہی، اصل میں سینے میں انفیکشن بھی ہے..... وہ باہر ایمبولینس میں موجود ہیں۔" میں نے پریشانی سے کہا۔
"کیا عمر ہے آپ کے والد کی اور کیا کام کرتے ہیں۔" ڈاکٹر رفیع نے نرمی سے پوچھا۔
"ڈاکٹر صاحب میرے والد پرائیویٹ جاب کرتے تھے اور باسٹھ سال عمر ہے مگر وہ بالکل ایکٹو تھے سر۔" میں نے یقین دلایا۔
"ٹھیک ہو جائیں گے وہ، آپ کل چار سے پانچ لاکھ روپے لا کر جمع کروا دیں مکمل علاج ہو جائے گا ان کا..... بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔" ڈاکٹر رفیع نے اطمینان سے کہا۔
مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ وہ ڈاکٹر میری غربت کو پہچان کر میری ذات سے تفریح لے رہا تھا یا آخر کسی جان کر اپنا خالی بیڈ میرے ابو جی کو دینے کے بجائے کسی امیر زادے مریض کے لیے سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔
"جی ٹھیک ہے میں کل پیسے لا کر جمع کروا دوں گا۔" میں اپنا بھرم رکھتے کو یہ کہہ کر تھکے ہوئے قدموں سے ایمبولینس کی جانب چلا آیا جہاں ابو جی ایک خاموش وجود بنے لیٹے تھے۔
"کیا ہوا یار۔" سہیل نے تیزی سے پوچھا۔
"کچھ نہیں ہوا۔" میں نے تھکے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے ڈرائیور کو مخاطب کیا۔ "برابر والے اسپتال لے چلو بھائی۔" پھر سہیل کو بتایا۔ "پانچ لاکھ روپے مانگ رہے تھے۔"
"پانچ لاکھ..... میرے خدایا یہ زندگیاں بچانے کی کوشش کرنے والے اسپتال ہیں یا لوٹ مار کے اڈے۔" سہیل تاسف سے سر ہلا کر بولا۔
ابو جی کو خوراک کے لیے جو این جی لگی ہوئی تھی اس میں خون آنے لگا تھا لہٰذا جوں ہی ایمبولینس پارکنگ میں رکی ہم نے ایک اور شخص کی مدد سے ابو جی کو اسٹریچر پر منتقل کیا اور ایمرجنسی وارڈ کی طرف لے کر بھاگے۔
ابو جی کی کنڈیشن دیکھتے ہوئے انہیں فوری ایمرجنسی وارڈ میں لے جانے کی اجازت دے دی گئی مگر مجھے ایمرجنسی وارڈ کے ریسپشن پر روک لیا گیا۔ "آپ فائل بنوائیں اور جو ضروری ٹیسٹ ہوں گے ان کے چارجز جمع کروا دیں۔"
"کتنے جمع کروانے ہیں اور ایڈمٹ کروانے کے کیا چارجز ہیں۔" میں نے فوراً سوال کیا۔
"دیکھئے ایڈمٹ کروانے کے لیے تو ابھی بیڈ خالی نہیں ہے..... ویسے کیا آپ افورڈ کر سکیں گے۔" تو اصل سوال یہ تھا۔
"ابھی کتنے جمع کروانے ہیں۔" میں نے پھر پوچھا۔
"فی الحال آپ دس ہزار جمع کروا دیں..... ویسے ایڈمٹ کروانے کے لیے بھی آپ کو پندرہ سے بیس ہزار آپ کو ادا کرنے ہوں گے جس میں بیڈ چارجز ڈاکٹر کی فیس میڈیسن وغیرہ شامل ہوں گے۔ جبکہ تیس ہزار آپ کو ایڈوانس کی مد میں جمع کروانے ہوں گے۔" ریسپشنسٹ نے کہا جو خود بھی ایک جونیئر ڈاکٹر ہی تھی۔
میں جو پانچ لاکھ کی کہانی سن کر آ رہا تھا یہ سن کر کچھ سکون کی سانس لی اور پوچھا۔ "تو بیڈ کب تک خالی ہو جائے گا۔"
"آپ تیس ہزار جمع کروا دیں بیڈ بھی اس وقت تک خالی ہو جائے گا۔" اس نے پیشہ ورانہ انداز میں کہا۔
"او کے جی..... آپ یہ دس ہزار تو جمع کریں۔" میں نے پیسے اس کے حوالے کر دیے میں مطمئن تھا میرے جان سے پیارے ابو جی کا ٹریٹمنٹ شروع ہو گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے روز ایک دوست کی مدد سے میں نے اپنی بائیک بیچ دی پندرہ ہزار سہیل نے کر کے دیے کچھ میرے اور دوستوں نے مدد کی۔ میں نے تیس ہزار جمع کروا دیے اور بقایا پیسے سنبھال کر رکھ لیے لیکن اگلے ہی دن اسپتال کی طرف سے مزید بیس ہزار کا تقاضہ ہوا، پتا چلا کہ دواؤں اور انجکشنز کی مد میں ہیں اور بیڈ چارجز بھی اس میں شامل ہیں۔ تیسرے دن مزید پچیس ہزار کا بل بنا تو ابو جی کے برابر والے بیڈ پر جو صاحب تھے ان کے چھوٹے بھائی نے مجھے مشورہ دیا۔ "میاں صاحبزادے! اب تمہارے ابو کی طبیعت ماشاء اللہ بہتر ہے بس اب انہیں گھر لے جاؤ..... ایک بات بتاؤں تمہیں..... یہ برابر والا اسپتال پیسے والوں کے لیے ہے اور یہ اسپتال پینل والوں کے لیے اتنا تو پینل بھی نہیں ہے، کہاں

سے لاؤ گے ہزاروں روپے روز، یہ تو یونہی منہ پھاڑ پھاڑ کر مانگے جائیں گے۔"

سوچ تو میں بھی یہی رہا تھا کہ مزید پیسوں کا انتظام کہاں سے کروں...... سچ تو یہی ہے کہ کسی اچھے اسپتال کے بیڈ یعنی کہ خالی بیڈ کے حصول کے لیے انسان کو خالی جیب ہرگز نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس کے لباس کی ہر جیب میں نوٹوں کی گڈیاں بھری ہونی چاہئیں تاکہ اپنے پیاروں کو سسکتا اور بلکتا دیکھنے کے بجائے پُرسکون کیفیت میں دیکھا جاسکے۔

گھر میں امی کی یادگار خاصی بھاری سونے کی بالیاں اور انگوٹھی رکھی تھی جو ابو جی نے میری دلہن کے لیے سنبھال رکھی تھی وہ بیچ کر میں نے اسپتال کا بل ادا کیا اور تھکا تھکا سا ابو جی کے پاس آ بیٹھا۔ انہوں نے اپنا بائیاں ہاتھ میری طرف بڑھایا تو میں نے کھڑے ہوکر مضبوطی سے ان کا ہاتھ تھام لیا۔ انہوں نے میرے ہاتھ کو دوبارہ تسلی دینے کے سے انداز میں دبایا۔ میرے ابو جی کو اس عالم میں بھی میری فکر ہے یہ سوچ کر میں زبردستی مسکرایا تو ان کے ہونٹ کپکپائے۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے میں جھک کر ان کے قریب ہوا تو ان کی کمزور سی آواز آئی۔ "گھر لے چلو۔" (گھر لے چلو) اس بار میرے لبوں پر حقیقی مسکراہٹ در آئی کیونکہ فالج کے اٹیک سے اب تک کے عرصے میں انہوں نے پہلی بار کچھ الفاظ ادا کیے تھے۔

طبیعت کی بہتری اپنی جگہ تاہم مالی حالات کا تقاضہ بھی یہی تھا کہ میں ابو جی کو آج ہی گھر لے جاؤں بصورتِ دیگر پھر کل کا بل منہ پھاڑے میرا منتظر ہوتا ورنہ جی تو یہی چاہ رہا تھا کہ ابو جی کم سے کم پندرہ سے بیس روز یہاں زیرِ علاج رہیں لیکن غربت کیا پرائیویٹ اسپتال کا خالی بیڈ کیا کے مصداق ابو جی ایک بار پھر بذریعہ ایمبولینس گھر آگئے چھٹی کے وقت مزید بیس ہزار کی ڈیمانڈ ہوئی جو جمع کروانے کے بعد میں نے اپنے ابو جی کو گویا بازیاب کروایا تھا۔

☆☆☆

ابو جی اپنے سنگل بیڈ پر لیٹے ہوئے تھے اسپتال میں کیونکہ مستقل اے سی میں رہے تھے تو سینہ بہت خرخرا رہا تھا حالانکہ اسپتال میں یہ حالت نہیں تھی شاید اس لیے کہ وہاں بڑے بڑے ڈاکٹرز کے تجویز کردہ اینٹی بائیٹک انجکشنز اور مخصوص دوائیں انہیں دی جارہی تھیں اور گھر پر وہی معمول کی دوائیں جو ڈاکٹرز نے ڈسچارج کے وقت دی تھیں لکھ کر......

سب رشتے دار ابو جی کو دیکھنے آرہے تھے رشتے کے چاچے، ماے، بھائی، پھوپھیاں، پڑوسی...... مگر جو بھی آتا وہ یہ مفید مشورہ ضرور دیا۔ "ابھی لانا نہیں چاہیے تھا اسپتال سے۔" میں خاموشی سے اب سب کے مشورے اور تجاویز سنتا گیا۔ کیا یہ سب میری مالی حالت نہیں جانتے تھے؟ اور کیا میری خواہش نہیں تھی کہ مجھ پر جان چھڑکنے والے باپ کا بہترین علاج ہوتا...... بس دنیا صرف زبان ہلانا جانتی ہے میں لبوں پر چپ سجائے ابو جی کا کمزور اور بیمار چہرہ تکتے دیکھتے ہوئے خود سے باتیں کیے جاتا۔ کئی بار ابو کے ماتھے پر پیار کرکے دل ہی دل میں کہتا ابو جی مجھے معاف کردیں کسی پرائیویٹ اسپتال میں آپ کے لیے خالی بیڈ نہیں ہے کیونکہ میں خالی جیب جو ہوں...... لگ کر ابو جی کی خدمت کر رہا تھا مگر شاید ابو جی سے میری ندامت اور پریشانی دیکھی نہ گئی اسی لیے محض ڈیڑھ ماہ بعد انہوں نے چپکے سے آنکھیں موند لیں۔

میں دھاڑیں مار کر رو رہا تھا...... میرے دو غم تھے ایک ابو جی کے جانے کا غم اور دوسرا خالی بیڈ افورڈ نہ کرسکنے کا غم۔

تجہیز و تکفین ہوگئی سب عزیز رشتہ دار مجھے دلاسہ دے رہے تھے گلے لگا رہے تھے میں نے اپنے ابو جی کو اپنے ہاتھوں سے قبر میں اتارا اور جھک کر ان کے کان میں سرگوشی کی۔ "ابو جی...... مجھے معاف کردیجیے گا میں کسی اسپتال میں تو آپ کو خالی بیڈ نہ دلوا سکا لیکن اس بیڈ سے آپ کو کوئی بے دخل نہیں کرسکے گا، یہ میں نے آپ کے نام کروادیا ہے۔ اللہ سب سے بڑا ہے ابو جی یہ آرام گاہ اس کی طرف سے آپ کے لیے ہے۔"

ابو جی کو اس دنیا سے سدھارے دو سال گزر گئے ہیں مگر آج بھی کسی ایمبولینس کا سائرن سن کر دل رونے لگتا ہے معلوم نہیں کب تک اس درد مسلسل میں مبتلا رہوں گا...... شاید اس وقت تک کہ جب تک اس ملک کا غریب شہری علاج کی خاطر اسپتال کے خالی بیڈ کے حصول کے لیے تڑپتا رہے گا ورنہ امراء کے لیے تو سرکاری اسپتالوں تک میں لگژری اپارٹمنٹس والی سہولیات موجود ہوتی ہیں اور ایک غریب مریض اپنے گھر کے بستر پر لیٹا خاموشی سے موت کی گھڑیاں گنتا رہتا ہے۔

++

# سندس ولا

محترمی مدیر
سلام شوق!
ارسال کردہ سچ بیانی کچھ عجیب سی لگے گی۔ پُراسرار واقعات برتے ہی ایسے ہیں کہ سمجھ میں نہ آئیں۔ عقل کی کسوٹی پر کھرے نہ اتریں۔ اس تحریر میں بھی کچھ ایسا ہی ہے کہ عقل میں نہ سمائے لیکن یقین کرنا ہی پڑتا ہے۔

مہوش اسد شیخ
(فیصل آباد)

را معمول تھا کہ عصر سے مغرب تک کا وقت
کتب کے مطالعہ میں صرف کرتا۔ اس وقت بھی میں
میں بیٹھا انہماک سے ایک کتاب کے مطالعہ میں
تھا۔

"مولانا جی......" مجھے اپنے عقب میں سرگوشی سنائی دی۔
مڑ کر دیکھا تو اک دبلا پتلا نحیف سا نوجوان کسی مجرم کی طرح سر جھکائے کھڑا تھا۔
میں کوئی مولانا نہیں تھا بس اللہ پاک نے میرے

کبھی دیکھنے کو نہ ملی تھی۔

میں موٹر سائیکل سمیت اپنے گھر کے سامنے آ گرا تھا..... اس کے بعد کیا ہوا کچھ یاد نہیں، میں اپنے حواس کھو بیٹھا تھا۔

جب آنکھ کھلی تو ماں جی میرے سرہانے بیٹھی قرآن کی تلاوت کر رہی تھیں۔

میرے ایک ہاتھ میں درد کی ٹیس اٹھی، دیکھا تو ڈرپ لگی ہوئی تھی۔

"مجھے کیا ہوا ہے؟" میرے لب ہلے مگر آواز برآمد نہ ہوئی۔

اگلے لمحے سے پیشتر وہ خوفناک رات کسی فلم کی مانند میرے دماغ کی اسکرین پہ چل پڑی۔

میں چیخنا چلانا چاہتا تھا مگر آواز حلق میں اٹک چکی تھی۔

میں نے خوف سے آنکھیں بھینچ لیں اور لعاب نگلتے ہوئے آیت الکرسی اور جو جو قرآنی آیات یاد تھیں زیرِ لب دہرانے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ میں ایک بار پھر حواس کھو رہا ہوں۔ میری یہ حالت کب تک رہی کچھ خبر نہیں۔ سب میرے لیے بہت پریشان رہے، مجھ سے بارہا پوچھا گیا کہ کیا ہوا تھا مگر میں کچھ بھی ان کے گوش گزار کرنے سے قاصر تھا۔

جب طبیعت سنبھلی تو سب سے پہلے افضل کو فون کیا۔ سندس ولا میرے حواسوں پہ چھایا ہوا تھا، کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ میں اس کی حقیقت جاننا چاہتا تھا۔

"یار...... وہ...... سن...... سندس...... و......ولا......" حال احوال دریافت کرنے کے بعد میں اصل مدعا کی طرف آیا، مگر زبان یکدم ہکلانے لگی۔

"سندس ولا...... اس ویران مکان کی بات کر رہا ہے نا؟......" اس نے تصدیق چاہی۔

"ہا...... ہاں......" میں نے زبان پھیر کر لبوں کو تر کرتے ہوئے کہا۔

یار سنا ہے وہاں ایک رات کسی لڑکی کا زیادتی کے بعد قتل ہوا تھا پھر اس کے کچھ ہی دیر بعد زیادتی کرنے والے کو بھی بے دردی سے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ اس مرد کو کس نے مارا یہ پُراسرار معما پولیس نے حل کرنے کی بہت کوشش کی آخر تھک ہار کر فائل بند کر دی گئی۔

بتایا جاتا ہے کہ گھر والے اس رات کسی فنکشن میں گئے ہوئے تھے، واپس آئے تو قیامت بیت چکی تھی۔

وقت گزرا اور پھر سندس ولا میں عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے۔ وہ لڑکی جس کا نام سندس بتایا جاتا ہے اس کی مدد کے لیے پکارنے کی آوازیں گھر میں گونجتی ہیں۔ گھر والوں نے اس مکان کو بیچنے کی بہت کوشش کی مگر ناکام رہے اور تھک ہار کر وہ مکان یونہی بند کر کے کہیں اور منتقل ہو گئے۔

عبدالکریم نام کی تختی لگی ہوئی تھی اس مکان کے باہر، جانے کب اور کیسے سندس ولا کی تختی لگ گئی کسی کو معلوم نہ ہو سکا۔

"اب اس میں کتنی حقیقت ہے کتنا فسانہ ہے کچھ کہہ نہیں سکتا۔" افضل نے ساری بات سنانے کے بعد گہری سانس خارج کی۔

"اوہ......" میں معاملے کی تہہ تک پہنچ چکا تھا۔ میرے رونگٹے کھڑے ہو چکے تھے، انگ انگ کانپ رہا تھا۔

وہ لڑکی جو کسی کی درندگی کا نشانہ بنی تھی اب معاشرے سے مجھ جیسے ناسوروں کو ختم کرنے کا بیڑا اٹھائے بھٹک رہی تھی۔ وہ سب درندوں کو مار کر اپنی روح کو سرشار کرنا چاہتی تھی۔ دوسری لڑکیوں کو ان کے شر سے محفوظ کرنا چاہتی تھی۔

میرا رب میری توبہ کا منتظر تھا تبھی مجھے اس رات نئی زندگی بخش دی۔ توبہ کا اک نادر موقع......

میں سنبھل گیا، اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ میں اپنے رب کے حضور سربسجود ہو گیا۔ سچے دل سے توبہ کر لی۔

وہ وقت جو فحش مواد دیکھنے اور پڑھنے میں گزارا کرتا تھا اب نماز قرآن کی تلاوت میں صرف کرنے لگا۔ باقاعدگی سے لائبریری جانے لگا اور اسلامی کتب پڑھنے لگا۔ چہرے پہ سنت نبوی سجالی۔ مغربی لباس چھوڑ دیا۔

رفتہ رفتہ لوگ میرا ماضی بھول گئے۔ آج مولانا کہہ کر مجھے پکارا جاتا ہے۔

اللہ پاک واقعی اپنے بندے سے ستر ماؤں سے بڑھ کر محبت رکھتا ہے اور ماں کبھی نہیں چاہتی کہ اس کی اولاد آگ کے گڑھے میں گرے۔

سو ہمارا رب بھی ہر دم ہماری توبہ کے انتظار میں رہتا ہے۔ یا اللہ تیرا شکر ہے تو نے مجھے توبہ کی توفیق دی۔

++

# قابلِ نفرت

جناب مدیر محترم
السلام علیکم!
ہمارے اردگرد کچھ ایسے لوگ بھی رہتے ہیں جنہیں دیکھ کے یہود و ہنود بھی شرما جائیں۔ کفر فخریہ کریں اور خود کو مسلمان کہیں۔ جادو حرام ہے پھر بھی کالا جادو کا سہارا لیں۔ شرمین اور آصف کی اس سچ بیانی میں بہت کچھ چونکانے والا ہے، پڑھ کر دیکھیں۔

نبیلہ خان
(ڈیرا سماعیل خان)

میرے لیے اس کی آنکھوں میں چبھتا طنز تھا۔ اس وقت میری حالت سولی چڑھتے شخص جیسی تھی جسے اپنی موت کے ٹل جانے کی موہوم سی امید لٹکتی رسی کو سامنے دیکھ کر ختم ہو جائے۔ مجھے اس نے بے موت مار دیا تھا۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا تھا۔ ہمیشہ کے لیے، یہ سوچے بغیر کہ میں اس کے بنا کیسے جی پاؤں گا۔ مگر اب مجھے اپنے خاموش دل کے رونے کا تماشا خود ہی جھیلنا تھا اور تاعمر جھیلنا تھا۔

یہ کہانی آج سے تین سال پہلے شروع ہوئی تھی اور اس کے مرکزی کرداروں میں "میں" (آصف علی) اور "وہ" (شرمین) شامل تھے۔ ہم دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ شوخ چنچل، خوبرو حسینہ اور میں بالکل عام سی شکل وصورت کا ایک نارمل انسان، جس کے پاس معمولی تعلیم، ایک ادنیٰ درجے کی نوکری اور کرایے کے گھر کے علاوہ دو بوڑھے ماں باپ تھے جن کی آنکھوں میں میرے لیے بڑے بڑے خواب اور اَن گنت دعاؤں کے جگنوں جھلملاتے رہتے تھے۔ جب کہ مجھے علم تھا کہ یہ خواب یہ جگنو بس ان کی سوچ تک ہی محدود رہنے والے ہیں... کیونکہ مجھے اپنی تمام تر حقیقت کا اندازہ بہت کم عمری میں ہی ہو چکا تھا مگر میں ان کی آنکھوں کے خوابوں کو نوچنے کا حوصلہ بھی خود میں نہیں پاتا تھا اس لیے ان کی ہر دعا کے جواب میں ہمیشہ اوپری دل سے ہی آمین کہہ کر انہیں

بوڑھے بزرگوں کی لاٹھی بننے کو ہر وقت تیار رہنے لگی تھی۔ محلے میں مجھے سب ڈاکٹرنی کے نام سے پکارنے لگے تھے۔ وہی لڑکے جو کبھی میرے حسن کے شیدائی تھے اب اپنی بیویوں کے علاج معالجے کے لیے میرے پاس دوڑتے ہوئے پہنچتے تھے۔ میں نے اپنی زندگی کو ایک مقصد دے دیا تھا۔ بس کبھی کبھی آصف کی یاد اور اس کی محبت دل میں شدت سے کروٹ لیتی تو میں بے چین ہو جاتی مگر یہ سب میں صرف اپنی ذات تک محدود رکھتی تھی۔ دنیا کے سامنے میں ایک مکمل مطمئن زندگی گزار رہی تھی۔ اماں ابا نے شروع میں تو بہت زور دیا کہ شادی کر لو شادی کر لو مگر میری ایک نہ میں نہیں بدلی میں یہی کہتی کہ میں نے خدمت خلق سے شادی کر لی ہے اب یہی میرا اوڑھنا بچھونا ہے۔

☆☆☆

"جلدی کرو ایمرجنسی کیس ہے جچہ بچہ دونوں کی جان کو خطرہ ہے۔" میٹرنٹی کلینک کا پورا عملہ بھاگ دوڑ میں مصروف تھا۔ میں نائٹ ڈیوٹی کر کے ابھی گھر پہنچی ہی تھی کہ مجھے دوبارہ سے بلا لیا گیا تھا۔ میں جو لمبی تان کر سونے کا سوچ رہی تھی اسی وقت الٹے قدموں واپس جانے کے لیے دوڑ پڑی تھی۔ اماں پیچھے سے پکارتی رہ گئیں مگر میری ایک ہی رٹ تھی۔ اماں ایمرجنسی ہے ڈاکٹر صاحبہ کو میری ضرورت ہے۔

"اللہ رحم کرے ان ایمرجنسی کیسوں نے میری بچی کی زندگی مشکل بنا کر رکھ چھوڑی ہے۔ اپنے لیے تو وقت ہی نہیں اس بچی کے پاس۔" اماں کی بڑبڑاہٹ نے گھر سے نکلنے تک میرا پیچھا کیا تھا۔

تیز تیز قدموں سے چلتے ہوئے جیسے ہی میں کلینک میں داخل ہوئی تو سامنے ہی شکستہ حال شخص کو دیکھ کر چلتے قدموں نے انکار کر دیا۔ اندر کو دھنسی آنکھیں بکھرے بے ترتیب بال، دھول مٹی جیسا اجڑا رنگ و روپ میرے دل کو دھکا سا لگا۔ میں نے تو کبھی بھی اسے بددعا کا ایک لفظ نہیں بخشا تھا۔ پھر وہ کیوں ایسے حالوں کو پہنچا تھا؟ یہ سوال میرے ذہن میں لمحے کے ہزارویں حصے میں آیا تھا مگر لمحے ہی کے لیے مجھے اپنے فرض نے باقی چیزوں سے بے نیاز کر دیا اور میں سب بھول کر سیدھی لیبر روم کی طرف دوڑی جہاں درد سے تڑپتی بدحال و نڈھال عورت میری توجہ کی منتظر تھی۔

☆☆☆

"بہت افسوس ہوا کہ ہم زچہ بچہ میں سے صرف زچہ کو بچانے میں کامیاب ہو سکے۔ اللہ کی رضا سمجھتے ہوئے شکر ادا کریں کہ اللہ نے بڑی جان کو محفوظ رکھا۔" تین گھنٹوں کی کوششوں سے بالآخر آصف کی بیوی کو ہی بچایا جا سکا۔ یہاں تک آنے سے پہلے ہی بچہ پیٹ میں مر چکا تھا اسی وجہ سے اس کی پیدائش میں اتنے مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ اب وہ خاتون خطرے سے باہر تھی اور اسے وارڈ میں شفٹ کر دیا گیا تھا۔

میں نے پوری کوشش کی کہ میرا سامنا آصف یا اس کی اماں سے نہ ہو۔ میں نے ڈاکٹر کو بھی بتا دیا تھا کہ یہ عورت آصف کی بیوی ہے۔ اور میں ان کے سامنے آنے سے گریز کرنا چاہتی ہوں اس لیے ڈاکٹر نے خود ہی ان لوگوں سے بات کی۔ اور اسے گھر جانے کی اجازت دے دی تاکہ وہ وہاں سے نکل سکے۔

☆☆☆

سیزیرین کی وجہ سے آصف کی بیوی کو تین دن رکنا پڑا تھا اور ان تین دنوں میں میری جان پر بن آئی تھی۔ میں مکمل گریز برت رہی تھی۔ مگر وہاں کے حالات اسٹاف سے باقاعدہ پوچھتی رہی تھی۔ جس دن ڈسچارج ہونا تھا اسی دن اچانک ایک اور ایمرجنسی آ گئی تو ناچار مجھے جانا پڑ گیا۔ کلینک میں گھستے ہی سب سے پہلے آصف اور اماں دونوں سے ہی مڈبھیڑ ہو گئی۔ مجھے سامنے دیکھتے ہی دونوں کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے اس سے پہلے کہ وہ دونوں سکتے کی کیفیت سے نکلتے میں تیزی سے اندر کی جانب بڑھ گئی۔ اس وقت دل کی حالت قابو سے باہر ہو چکی تھی۔ ہاتھ پاؤں ٹھنڈے پڑنے لگے تھے۔ دل جیسے پنجرے کو توڑ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھا اور نفس تیز تیز چلنے لگا تھا۔ اندر جاتے ہی میں نے لمبی لمبی سانسیں لینا شروع کر دیں۔ تاکہ حواس کچھ سنبھل سکے۔ دو منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ اماں تن فن کرتی کمرے میں آئیں اور مجھ پر چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ "تیری جرأت کیسے ہوئی یہاں آنے کی؟ کیوں میرے بچے کے پیچھے پڑی ہوئی ہے تو...... زندگی تو برباد کر ہی دی کیا اب اس کی جان لے کے ٹلے گی؟"

میں اماں کی لن ترانی سن کر حیران پریشان بس دیکھے جا رہی تھی۔ میں یہ سوچ رہی تھی کہ یہ کیسی عورت ہے؟ میری زندگی بھی تباہ کی اور الزام بھی مجھ پہ لگا رہی ہے۔

اماں کا واویلا سن کر نرسنگ اسٹاف اکٹھا ہونے لگا تھا۔ اور بات کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا کہ یکدم آصف نے اندر آ کر اماں کا ہاتھ پکڑ کر باہر کی طرف کھینچتے ہوئے اس سے چپ ہونے کا کہا مگر اماں تو جیسے ہی آخر کی تھی۔ "چھوڑ مجھے!

اس کو ذرا حیا نہ آئی کہ یہاں بھی پہنچ گئی۔ میں پہلے ہی کہتی تھی کہ یہ ابھی بھی تیرے ساتھ رابطے میں ہے جبھی تو تجھے بیوی کی پرواہ نہیں ہوتی تھی...... اس معصوم کے بچے مرتے رہے ہیں مگر مجال ہے کہ تجھے کبھی دکھ ہوا ہو۔ آخر کو تیری بھی تو اولاد تھی...... تین بچے چلے گئے مگر یہ تیرے دل سے نہ اتری...... ارے میں پوچھتی ہوں ایسا بھی کیا عشق کہ ماں باپ بیوی بچے سبھی کو پس پشت ڈال رکھا ہے تونے؟"

اب اماں کی توپوں کا رخ آصف کی طرف ہو چکا تھا۔

آصف کے چہرے پہ ایک رنگ آرہا تھا ایک جا رہا تھا اور میری تو جیسے جسم میں جان ہی نہیں رہی تھی۔ اتنے سالوں کی کمائی عزت کو اس گھٹیا عورت کی بکواس نے لمحوں میں مٹی میں ملا دیا تھا۔ اسٹاف میں سے کوئی دوڑتے ہوئے ڈاکٹر صاحبہ کو بھی اس جھگڑے کی اطلاع دے آیا تھا۔ انہوں نے آتے ہی اماں کی طرف غصے سے گھورتے ہوئے کہنا شروع کر دیا۔

"دیکھیں بی بی آپ بزرگ ہیں...... مگر عمل میں بزرگی کی رمق تک نہیں پائی جاتی۔ جس لڑکی کو اتنی دیر سے بے عزت کر رہی ہیں اسی نے اپنا خون دے کر آپ کی بہو کی جان بچانے کی سر توڑ کوشش کی ہے۔ جس کی زندگی کے ساتھ کھلواڑ کرتے ہوئے آپ نے ایک لمحہ نہیں لگایا اسی نے آپ پر آپ کے بیٹے اور بہو پر وہ احسان کیا ہے جس کا بدلا آپ سب مل کر بھی ادا کرنا چاہیں تو نہیں کر سکتے۔ اس کی انسانیت اور نیک نیتی دیکھو کہ ان تین دنوں میں اس نے ایک بار بھی آپ لوگوں کے سامنے آنے کی کوشش نہیں کی نہ ہی اپنا احسان جتانے کی کوشش کی۔ اور آج بھی وہ نہ آتی اگر یہاں اس کی ضرورت نہ پڑتی تو...... افسوس ہے آپ جیسے گھٹیا لوگوں کی وجہ سے ہی اچھے اور نیک فطرت لوگوں کی زندگیوں میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں...... یہ تو اس معصوم اور شریف بچی کی شاباش ہے کہ اس نے آپ لوگوں کے دیئے دکھ کو اپنی زندگی کا ناسور بنانے کی بجائے انسانیت کے جذبے کو زندگی میں شامل کر کے نہ صرف لوگوں کو سکون بخشا بلکہ اپنی زندگی کا مقصد بھی متعین کیا، مگر آپ لوگ یہاں بھی اس کی زندگی برباد کرنے پہ تل گئے ہیں۔ جاؤ بی بی اپنے دماغ کا علاج کرواؤ کسی پاگل خانے سے۔ یوں کھلے میں پھرو گی تو ایسے ہی کاٹ کھانے کو دوڑتی پھرو گی۔ اب مہربانی کرو اور یہاں سے بوریا بستر سمیت کر چلتی بنو۔"

ڈاکٹر صاحبہ کا غصہ اتنا شدید پہلی بار ہی پورے اسٹاف نے دیکھا تھا اور اب تک تمام صورت حال کا کچھ نہ کچھ اندازہ سب کو ہی ہو چکا تھا۔ آصف پہ تو گھڑوں پانی پڑ چکا تھا جبکہ اماں جیسے فرعون صفت لوگ کم ہی سدھرتے یا جھکتے ہیں۔

"ارے جاؤ جاؤ...... ہمیں بھی کوئی شوق نہیں یہاں پڑے رہنے کا۔ ہنہ...... چل بیٹا جانے کا انتظام کرے تاکہ دوبارہ شکل نہ دیکھنی پڑے ان منحوسوں کی۔"

ڈاکٹر صاحبہ کا دل تو چاہا کہ کس کے منہ پہ طمانچہ جڑ دیں مگر اپنے رتبے کا خیال کرتے ہوئے خاموش رہ گئی اور اسٹاف کو جلد از جلد ڈسچارج سلپ بنانے کی تاکید کرتے ہوئے پیشنٹ دیکھنے چلی گئی جو اس تماشے کی بدولت بیچ میں ہی رہ گئے تھے۔

☆☆☆

تبھی ایسا لگا کہ جیسے مجھے یعنی آصف کو ہوش آ گیا۔ میں نے مڑ کر اماں کی طرف دیکھا پھر کہا۔ "اماں، میری زندگی کسی دوسرے نے نہیں آپ نے برباد کی ہے۔" میں کچھ اور بھی کہتا کہ بستر پر لیٹی میری بیوی نقاہت بھری آواز میں بولی۔ "یہ عورت فرشتہ ہے اگر یہ مجھے نہ سنبھالتی، اپنا خون مجھے نہ دیتی تو میں مر چکی ہوتی۔ آج میں بتاتی ہوں، جیسے ہی میں اُمید سے ہوتی آپ مجھے پتا نہیں کیا کیا گھول کر پلاتیں، طرح طرح کی راکھ چٹواتیں اس کی وجہ سے حمل ضائع ہوتا۔ میں ڈر سے خاموش رہ جاتی کہ کہیں آصف مجھے شرمین کی طرح چھوڑ نہ دے۔ مگر آج میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ میں خود آپ کو چھوڑ دوں، اب میں بھی یہیں، شرمین کے پاس رہ کر لوگوں کی خدمت کروں گی۔ اس کے پیر دھو دھو کر پیوں گی۔ اگر آصف کو مجھے رکھنا ہے تو الگ گھر لے کر دے ورنہ وہ بھی میری زندگی سے نکل جائے۔"

میں نے ماں کو پیچھے دھکیل کر بیوی کا ہاتھ تھام لیا۔

"کاش میں اماں کی بے وقوفیاں سنبھال سکتا، مگر میں بزدل ٹھہرا۔ میں شرمین کے پاؤں پکڑ کر معافی مانگتا ہوں۔" کہہ کر میں واقعی شرمین کے پیروں پر گر پڑا۔

شرمین نے پیچھے ہٹ کر کہا۔ "میں نے آپ کو اور اماں کو معاف کیا۔ اب آپ میرے لیے نامحرم ہیں اس لیے دور رہیں۔"

اماں کا بھی سر جھک گیا تھا پھر بھی مجھے رحم نہ آیا۔ میں نے کہا۔ "اماں آپ گھر جائیں۔ میں اسے اس کے والدین کے پاس چھوڑنے جا رہا ہوں اور اب اسے لے کر کسی کرایہ کے گھر میں رہوں گا۔ خرچا آپ کو ملتا رہے گا مگر اب میں آپ کو نہیں ملوں گا۔"

++

# الفاظ کا جادو

محترم عذرا رسول
السلام علیکم!
یہ سچ بیانی ہر ایک کے لیے ہے۔ اس میں بیان کردہ نکات کو قارئین نے ذہن نشین کرلیاتو زندگی سدھر جائے گی۔ الفاظ کی اہمیت کیا ہے۔ اسے وہی جانتا ہے جو زبان کا زخم خوردہ ہو۔

کرن نعمان
(کراچی)

آخری بار دورانِ پریگنینسی کچھ کمپلیکیشنز کی وجہ سے ضیاالدین اسپتال میں میری ڈاکٹرز نے مجھے ایڈمٹ ہونے کے لیے کہا۔ میرے شوہر چاہتے تھے کہ میں پرائیوٹ روم میں رہوں پر اس میں خرچا اچھا خاصہ تھا اور پھر کسی کو ساتھ رکھنا بھی پڑتا۔ میں کسی کو مشکل میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی کیونکہ سسرال والے پہلے ہی میرے تین بچوں کو سنبھال رہے تھے۔ موسم اچھا تھا اس لیے میں نے انہیں منع کردیا اور جنرل وارڈ میں داخل ہوگئی۔

وارڈ میں زیادہ رش نہیں تھا۔ مجھ سے پہلے چار خواتین
وہاں ایڈمٹ تھیں۔ روز بچی کی وجہ سے اور وہ بری طرح
کسی کمپلیکیشن کی وجہ سے وہاں آئی تھیں۔ میں بنیادی طور پر
ذرا کم گو ہوں اور بے زحمت لوگوں میں گھل مل جانے سے
پرہیز کرتی ہوں پھر جب کسی سے بات چیت شروع ہو جائے
تو اچھی طرح ڈیل کر لیتی ہوں۔

میری ایک جانب بیڈ خالی تھا اور دوسری جانب ایک
جواں سال لڑکی تھی جس کا نام ماریہ تھا باقی تینوں میری ہم عمر
تھیں۔ سب نے ہی آنکھوں آنکھوں میں مجھ سے سلام دعا
کی ماریہ جلد مجھ سے فری ہو گئی۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے
بعد وہ ٹیسٹ کروانے لیبارٹری چلی گئی تو میں نے بیگ ٹٹولا
اور سکون سے لیٹ کر بیگ سے مستنصر حسین تارڑ کی بہترہ
داستان نکالی اور پڑھنے لگی۔ اس کتاب کا انتخاب میں نے
اس لیے کیا تھا کہ شاید یہ اسپتال کے ٹینشن زدہ ماحول میں
میرے لیے راحت افزا ہو گی۔

کچھ ہی دیر بعد میرے ساتھ والے خالی بیڈ پر ایک
زچہ کو منتقل کیا گیا جس کے ہاں بچی کی ولادت ہوئی تھی۔
کیس نارمل تھا پر تکلیف کے آثار اس کے چہرے پر واضح
تھے لیکن صرف تکلیف ہی نہیں تھی کچھ اور بھی ایسا تھا اس
کے چہرے پر جو بہت واضح تھا اس کی آنکھوں میں نمی سی تھی
جسے وہ بار بار محسوس طور پر صاف کر رہی تھی۔ مجھے
حیرت ہوئی اس کے ساتھ کوئی بھی نہیں تھا اسے دیکھ کر میرا
کتاب سے دل ہٹ گیا۔ میرا دھیان بار بار اس کی طرف
بھٹک رہا تھا۔

آخر کار مجھ سے رہا نہیں گیا اور میں اس کے قریب
چلی گئی۔ اس کا حال چال پوچھا اور پھر اس کی پریشانی کی وجہ
پوچھی وہ بولی: "کچھ نہیں" پھر نگاہ برابر میں لیٹی بچی کی طرف
اٹھ گئی۔ میں کچھ کچھ سمجھ گئی۔ "بیٹی ہونے کی وجہ سے
پریشان ہو؟"

اس نے مجھے دیکھا۔ "بیٹی تو پھر بیٹی ہوتی ہے۔"

میں اس سے اس بات کا مطلب جاننا چاہتی تھی پر اسی
وقت ڈاکٹر راؤنڈ پر آ گئی تو مجھے اس کے پاس سے ہٹ کر
اپنے بیڈ پر آنا پڑا۔ ماریہ بھی آ گئی تھی ڈاکٹر نے میرے بیڈ
پر کتاب دیکھی تو مسکرا کر بولی۔ "واہ بھئی تم تو ادبی ذوق
رکھتی ہو۔" ان کی بات سن کر میں نے صرف مسکرانے پر ہی
اکتفا کیا۔

ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں اس کے پاس جانے
لگی تھی کہ ایک آدمی اس کے پاس آ گیا اور اس کے قریب
پڑے بینچ پر بیٹھ گیا۔ ایک عجیب سی سرد مہری اس کے
چہرے سے عیاں تھی۔ وہ اس کے لیے کھانا لے کر آیا تھا۔
وہ عورت اس سے بات کر رہی تھی پر وہ ویسا ہی کسی بات کا
جواب دیتا کسی کا نہیں۔ میں مطالعہ کرتے ہوئے ان پر بھی
نگاہ ڈال لیتی تھی کچھ دیر میں ہی وہ ننھی بچی پر نگاہ ڈالے
جیب سے کچھ پیسے نکال کر اس کے پاس رکھ کر چلا گیا۔ اس
نے کھانا نکالا اور آنسوؤں کی آمیزش کے ساتھ کھانے
لگی۔ مجھے لگا وہ کھانا نہیں زہر اپنے اندر اتار رہی ہے۔
میں اس کی طرف بڑھی پر مجھ سے بھی پہلے ماریہ اس تک
پہنچ گئی تھی اور اس کے آنسو صاف کر کے اسے اپنے ہاتھ
سے کھلانے لگی۔ اس کا نام یاسمین تھا اور اس نے ہمیں
بتایا کہ آنے والا شخص اس کا شوہر تھا جو کہ چوتھی بیٹی کی
ولادت پر اس سے ناراض تھا چونکہ جدید ٹیکنالوجی نے
انہیں پہلے ہی بتا دیا تھا کہ ان کے ہاں بیٹی کی ولادت
متوقع ہے اس لیے سسرال میں سے کوئی ساتھ نہیں آیا تھا
بلکہ اس کو بکنے میں تھا۔

مجھے اس کے حالات جان کر دکھ ہوا پر ماریہ کو شدید
غصہ آیا۔ "بھلا بیٹی پیدا ہونے میں اس کا کیا قصور ہے، اب
آئے اس کا شوہر میں تو سناؤں گی اسے کہ بھائی جو اللہ
نے چاہا وہی تمہارے گھر پیدا ہوا۔"

بلاشبہ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی پر اس کی بات سن کر یاسمین کا
رنگ اڑ گیا۔ "خدا کے لیے ایسا مت کرنا وہ پہلے ہی غصے
میں ہے ایسی باتیں سن کر مجھے چھوڑ دے گا تو میری بچیوں کو
کون پوچھے گا۔"

میں نے اسے تسلی دی اور ماریہ کو منع کیا کہ ایسا کچھ نہ
کہے۔ اس کے بعد میں اور ماریہ بچی سنبھالنے میں اس کی مدد
کرتے رہے۔ رات میں اس کا شوہر پھر آیا تو اس کی باقی
تینوں بچیاں بھی اس کے ساتھ تھیں۔ جو بالترتیب دس، آٹھ
اور چار سال کی تھیں۔

تینوں بچیاں بار بار محبت سے چھوٹی بہن کو گود میں
لے کر پیار کر رہی تھیں پر ان کا باپ اب بھی سخت بیزار بیٹھا
تھا۔ اسے دیکھ کر میں نے ماریہ کو دیکھا وہ بھی اس آدمی کو دیکھ
کر برا سا منہ بنا رہی تھی۔ یاسمین نے بچی اپنے شوہر کی
طرف بڑھائی تو اس نے ایک بیزار نگاہ [illegible]

## فاتحہ

سورۃ فاتحہ، قرآن مجید کی پہلی سورت کا نام ہے۔ اس سورۃ کا نام فاتحۃ الکتاب ہے اس لیے کہ قرآن مجید کا آغاز اسی سے ہوتا ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ بعض مدنی کہتے ہیں۔ مگر زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ یہ مکی بھی ہے اور مدنی بھی ہے۔ ایک بار مکہ میں نازل ہوئی جب نماز فرض کی گئی۔ پھر مدینہ میں نازل ہوئی جب قبلہ کی تبدیلی ہوئی۔ اس کا نام ام الکتاب اور ام القرآن بھی ہے کیونکہ رسول اللہ نے فرمایا ہے اس شخص کی نماز نہیں ہوتی جو ام القرآن نہ پڑھے۔ سورۃ وافیہ اور سورۃ کافیہ بھی اس کا نام ہے اس لیے کہ یہ قرآن کے اکثر مضامین پر جامعیت کے ساتھ مشتمل ہے۔ سورۃ الکنز بھی اس کا نام ہے... کیونکہ حدیث قدسی میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: فاتحۃ الکتاب میرے عرش کے خزانوں سے ایک خزانہ ہے۔ سورۃ شفاء اور سورۃ شافیہ بھی اس کا نام ہے... کیونکہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے: فاتحۃ الکتاب شفاء من کل داء الا السلام۔ سورۃ الشانی بھی اس کا نام ہے... کیونکہ وہ ہر نماز میں دو دو بار پڑھی جاتی ہے۔ سورۃ الصلوۃ بھی اس کو کہا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ نماز میں پڑھنی واجب اور بعض کے نزدیک فرض ہے۔ سورۃ الحمد اور سورۃ الاساس بھی اس کو کہا جاتا ہے... کیونکہ وہ قرآن مجید کی اساس (بنیاد) ہے۔ ابن عباسؓ نے کہا ہے: جب تو بیمار ہوجائے یا تجھے صحت کی شکایت ہوجائے تو اساس (الحمد) کو لازم پکڑ۔ سورۃ الحمد اس لیے کہ اس میں خدا کی حمد درج ہے۔

اقتباس: اسلامی انسائیکلو پیڈیا

مرسلہ: احسن فاروق، کوٹ ادو

ایک خیال نے میرے دل کو چھوا۔ ''مبارک ہو بھائی ماشاء اللہ بہت پیاری بچی ہے آپ کی۔''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر ایک دھیمی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر در آئی۔ ''یہ بچی آپ کے لیے ان شاء اللہ بلند بخت ثابت ہوگی۔''

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''بہن آپ کو کیسے پتا۔''

''بھائی بچی کی چوڑی پیشانی اور اس پر ابھرنے والی لکیر یہ بتا رہی ہے کہ یہ نصیبوں والی ہے اور مستقبل میں آپ کے لیے انتہائی نفع بخش ثابت ہوگی۔ میں نے پامسٹری یعنی علم نجوم میں بہت نام کمایا۔ آپ نے ٹی وی پر میرا پروگرام دیکھا ہوگا۔ میں اس بچی کی قسمت پڑھ کر تعجب میں پڑ گئی ہوں۔ آپ کی قسمت بدل کر رکھ دے گی۔'' میری بات سن کر اس آدمی کی ہی نہیں یاسمین اور ماریہ کی آنکھوں میں بھی حیرت اتر آئی تھی۔ چند لمحوں بعد ہی وہ بچی جسے اس کی ماں بدنصیب کہہ رہی تھی وہ اپنے باپ کی گود میں تھی۔ میرے حوصلہ افزا الفاظ جادو کر گئے تھے۔ اب وہ آدمی بچی کو گود میں لیے اپنی بیوی کو بھی پیار بھری مسکراہٹ سے نواز رہا تھا۔

انہیں وہیں چھوڑ کر میں وارڈ سے ملحقہ ٹیرس میں نکل آئی تو ماریہ بھی میرے پاس آگئی۔ ''واہ، آپ نے تو کمال کر دیا ایسی بات بتائی کہ پل میں کایا ہی پلٹ گئی۔''

میں نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا۔ ''میں نے بات نہیں بنائی وہی کہا جو صحیح ہے۔''

وہ سن کر حیران ہوئی۔ ''تو کیا آپ مستقبل کے بارے میں بتا سکتی ہیں۔''

اس کی بات سن کر میں مسکرا دی۔ ''ہاں میں بتا سکتی ہوں کہ میرے پیارے نبیؐ نے اگر یہ فرمایا ہے کہ جس کی دو بیٹیاں ہوں اور وہ انہیں اچھی طرح پروان چڑھائے تو وہ جنت میں میرے ساتھ ایسے ہوگا جیسے میری دو انگلیاں' تو یقیناً ایسے ہی ہوگا اور اس سے بڑھ کر کسی انسان کی بلند بختی کیا ہوگی۔ اب تم ہی بتاؤ میں نے صحیح کہا نا۔''

اس نے محبت سے مجھے دیکھا اور پھر مجھ سے لپٹ گئی۔ وہ جان گئی تھی کہ کسی بھی غلط فعل کو تلخی سے نہیں بلکہ نرمی اور حوصلہ افزائی کی باتوں سے بدلا جاتا ہے۔

++

شہرینہ باورچی خانے میں کھڑی کسی کام میں معروف تھی جب ہمسائی نے اسے عقب سے آواز لگائی۔ اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ روٹیاں لپیٹنے والے رومال اور ایک مجوری چنگیر پکڑاتے ہوئے شہرینہ سے کہنے لگی۔

''بیٹا! یہ پکڑو چنگیر، یہ بالکل نئی ہے، میں نے اپنے ہاتھوں سے بنائی ہے اور یہ لو دو رومال یہ بھی بالکل نئے ہیں۔ یہ دونوں چیزیں رکھ لو، جب بھی چاچی (شہرینہ کی تائی) کے لیے روٹی بھیجنا، اسی میں بھیجنا...... سمجھ گئی ناں؟''

# روٹی کا رومال

محترم و مکرمی مدیر اعلیٰ

سلام شوق!

ہم مسلمان ہیں۔ اللہ کے پسندیدہ دین کے پیروکار۔ ہماری ہدایت کے لیے اللہ تعالیٰ کا کلام ہر گھر میں موجود ہے لیکن ہم اس پر مکمل عمل پیرا نہیں ہیں۔ عمل کرتے ہیں تو خاندانی روایت پر۔ یہ سچ بیانی بھی اسی کی ایک کڑی ہے کہ زندگی میں کوئی خبر گیری نہیں کرتا لیکن مرنے کے بعد بریانی کی دیغیں کھلائیں گے۔

سحرش اعجاز
(میانوالی)

"جی بھی گی۔" شہرینہ نے انہیں حیرت سے دیکھا۔
ہمسائی کے جانے کے بعد وہ سوچنے لگی کہ یہ وہی ہمسائی تھی جو تائی اماں کو پیٹھ پیچھے کیا کیا باتیں کیا کرتی تھی اور اب ان کے لیے کیسی باتیں لے کر آئی ہے۔ ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ خالہ زہرہ (تائی اماں کی بہن) باورچی خانے میں داخل ہوئی اور اس سے کہنے لگی۔
"بیٹا یہ لو سفید رومال..... کل تمہاری تائی کا کفن بنایا تھا تو اس میں سے کچھ کپڑا بچ گیا تھا۔ جب بھی اپنی تائی کے لیے روٹی بھیجنا اس میں بھیجنا انہیں ثواب پہنچے گا۔" شہرینہ نے انہیں بھی حیرت سے دیکھا جیسے وہ بھی ہمسائی کی طرح کوئی عجیب بات کر رہی ہوں۔ یہ وہی خالہ تھیں جن کے بچوں کے رشتے بہن کے بچوں کے ساتھ ہو جانے کی وجہ سے تائی اماں کے ساتھ بھی نہیں بنتی تھی۔ شہرینہ نے ان کی آنکھوں میں بہن سے جدائی کا ایک آنسو تک نہ دیکھا تھا۔
تھوڑی ہی دیر میں بھابی نسرین (تائی اماں کی بڑی بہو) بھی کچن میں داخل ہوئی، جن کے ہاتھوں میں کچھ نئے کورے برتن تھے۔
"شہرینہ یہ کچھ نئے برتن بازار سے منگوائے ہیں۔ جب بھی خالہ کے لیے روٹی بھیجو گی ہم انہی میں بھیجا کریں گے۔ تمہیں اس لیے بتا رہی ہوں کہ خالہ کے لیے نئے برتنوں کے علاوہ دوسرے برتن استعمال نہ کیے جائیں۔" وہ تنبیہ کر رہی تھیں جبکہ شہرینہ کے ذہن میں ساس کے ساتھ رکھے ان کے رویے کے متعلق بہت کچھ چل رہا تھا۔ اس وقت شہرینہ کے پاس سوائے افسوس کے کچھ نہ تھا۔
"لیکن ان کے لیے روٹی کیوں بھجوائی ہے؟ یہ کیسے ممکن ہے، وہ تو فوت ہو چکی ہیں، وہ کیسے کھا سکیں گی۔" شہرینہ کے ذہن میں کئی انہونے سوالات ابھرے جو اس نے کہہ ڈالے۔
"بیٹا چالیسویں تک ان کے نام کی روٹی مسجد میں یا کسی غریب کے گھر لازمی بھیجنی ہوتی ہے۔ انہیں اس عمل کا ثواب پہنچتا ہے۔ چالیسویں کے بعد روٹی ہر جمعرات کی جمعرات بھیجی ہوگی۔ یہ رسوم ہوتی ہیں جو ہر حال میں پوری کرنی ہوتی ہیں۔" بھابی کے بجائے ان کی امی نے اپنے تئیں تفصیل سے بتایا۔
"لیکن یہ سب کہاں لکھا ہے؟ کس کتاب میں لکھا ہے؟" شہرینہ کو یہ سب بہت عجیب لگ رہا تھا کیونکہ وہ قرآن پاک کو ترجمہ تفسیر سے پڑھ چکی تھی، اس میں ایسا کچھ نہیں لکھا جو یہ سب بیان کر رہے تھے۔ نہ ہی احادیث میں کبھی کچھ ایسا سنا تھا۔ خالہ کچھ برا مناتے ہوئے کہنے لگی۔
"دراصل بات یہ ہے کہ شعور میں آتے ہی ہم یہی سب دیکھتے آئے ہیں، ہمارے بڑے ایسا ہی کرتے تھے، اب کوئی انوکھا تو نہیں ہو رہا۔"
"جی بہتر..... میں تو بس حقیقت بیان..... اچھا ٹھیک ہے۔" وہ مزید بات کرتے کرتے رکی۔ اس نے صورت حال کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے بات ختم کر دی۔

☆☆☆

تائی اماں کو فوت ہوئے سات دن گزر چکے تھے۔
"چاول، گوشت، دال، [illegible]، کھیر، سبزی وغیرہ وغیرہ۔"
ممانی (تائی اماں کی بھابی) نے ابو کو کھانوں کی فہرست بتائی۔ ابو فہرست پکڑ کر باہر چلے گئے جبکہ شہرینہ جو ان کے پاس ہی کھڑی سب سن رہی تھی، ابو کے جاتے ہی ممانی سے پوچھنے لگی۔
"ممانی جان اتنے سارے کھانے پکانے کی کیا ضرورت ہے۔ میرے خیال میں ایک دو ہی کافی ہیں۔"
"بیٹا آج تمہاری تائی اماں کو فوت ہوئے پورے سات دن مکمل ہو گئے ہیں۔ آج ان کے ساتے کا ختم ہے لہٰذا سات کھانے بنانا لازمی ہیں۔"
شہرینہ نے افسوس سے سوچا کہ یہ پیارے انہیں ان کی زندگی میں یاد کیوں نہیں آتے۔

☆☆☆

تائی اماں کے سب بچوں کی شادیاں ہو چکی تھیں ان کی تین بہویں تھیں عائزہ، نسرین اور شہرینہ۔ عائزہ، نسرین تائی اماں کی بہن کی بیٹیاں تھیں جبکہ شہرینہ دیور کی بیٹی تھی۔ عائزہ اور نسرین دونوں بہنوں کو ساس سے ڈھیروں ڈھیر شکایتیں رہتی تھیں۔ جس کا غصہ وہ اکثر محتاج ساس پر نکالا کرتی تھیں۔ شہرینہ کو بھی شکایات تو تھیں مگر اسے اللہ کے کسی بندے سے زیادتی کر جانے سے اللہ کے عذاب کا خوف رہتا تھا۔ وہ قرآن پاک میں برا کرنے والوں کے انجام سے خوب واقف تھی۔

☆☆☆

ٹھک..... ٹھک..... ٹھک۔
اپنے کمرے میں خاموشی سے بیٹھی وہ کہیں کھو گئی۔ سوئی ہوئی شہرینہ کو اپنے کانوں میں ٹھک ٹھک کی آواز محسوس ہوئی تو وہ نیند سے بیدار ہوئی۔ یہ فجر کا وقت تھا۔ اسے باہر تائی اماں کے بولنے اور ٹھک ٹھک کی آواز سنائی دی۔ اس نے سوچا تائی اماں لاٹھی کے سہارے چلتی ہیں شاید وہ غسل خانے سے وضو کر کے برآمدے میں بچھی اپنی چارپائی کی طرف آ رہی ہیں۔ یہ ضرور لاٹھی کے زمین سے ٹکرانے کی آواز ہے۔
شہرینہ بھی نماز پڑھنے کی غرض سے کمرے سے نکل آئی۔ برآمدے سے گزرتے ہوئے تائی اماں کے چند الفاظ اس کے کانوں میں پڑے۔
"یا اللہ کسی کا محتاج نہ کری..... محتاجی بڑی بے وہ..... اللہ تو بس اپنا ہی محتاج رکھیں۔" یہ کہہ کر وہ رونے لگیں۔
"کیا ہوا تائی اماں..... کیا بات ہے۔" پیچھے کھڑی شہرینہ نے انہیں دوپٹے کے پلو سے آنکھیں صاف کرتے دیکھ کر پوچھا۔
"کچھ نہیں بیٹے (بیٹا) جا میرا پتر وضو کر کے نماز پڑھ لے..... جا شاباش۔" وہ بات بدل گئیں جبکہ شہرینہ افسردہ کھڑی سوچتی رہی کہ وہ اپنے رب سے ٹھیک ہی تو دعا کرتی ہیں۔ دراصل وہ ہم سب کی محتاج ہو گئی ہیں اور اس محتاجی سے بچنے کی دعا کرتی ہیں اور ہم جو ٹھیک ٹھاک ہیں اپنے بڑھاپے سے غافل ہیں، خود پر محتاجی کا وقت آنے سے ڈرتے نہیں، گھر کے چھوٹے موٹے کاموں اور باتوں سے ان سے بدگمانی کر جاتے ہیں۔
وہ کمرے میں تن تنہا خاموش بیٹھی تائی اماں کی یادوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ اپنے ہاتھوں پر چند ندامت کے آنسو گرنے سے وہ ماضی سے حال میں لوٹی..... اسے یاد آیا کہ وہ بھی کئی باتوں پر ان سے بدگمانی کر جایا کرتی تھی اور تائی اماں کا ظرف اتنا بڑا تھا کہ وہ اگلے ہی لمحے سب بھلا کر مان جاتی تھیں۔ وہ اپنے چہرے کو ہاتھوں میں چھپائے خوب رو دی۔
"کاش میں تائی اماں سے ان کی زندگی میں معافی مانگ لیتی، کاش میں ان کا دل نہ دکھاتی، اب رونے سے کیا حاصل..... وقت میرے ہاتھ سے نکل گیا۔" وہ وقت کی تیز رفتاری پر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

☆☆☆

روز بلاناغہ تائی اماں کے نام کی روٹی مسجد یا کسی غریب کے گھر نئے کورے برتنوں اور نئے رومالوں میں لپیٹ کر جانے لگی۔ اس دوران شہرینہ کی آنکھوں کے سامنے کئی تکلیف دہ منظر آتے رہے۔ وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتی کہ یا اللہ ہم اتنے عجیب و غریب اور بے حس لوگ کیوں ہیں؟ ہم لوگ زندگی میں ان کو پوچھتے نہیں اور مرنے کے بعد یہ دکھاوا کیوں؟ اب بھی وہ ماضی میں کہیں کھو گئی۔
"پتّر مینوں روٹی لیا دے (بیٹا مجھے روٹی لا دو)"
تائی اماں نے بڑی بہو سے صبح کا ناشتا مانگا۔
"جی اچھا۔" نسرین نے کہا۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ایک ٹوٹی پھوٹی چنگیر میں ایک روٹی بغیر رومال میں لپیٹے رکھی، ایک کٹوری میں رات کا بچا سالن ڈال کر بچے کے ہاتھ ساس کو بھجوا دی کہ جاؤ دادی اماں کو ناشتا دے آؤ۔ تائی اماں سخت جلی ہوئی روٹی دیکھ کر روتے ہوئے کہنے لگیں۔
"میں کیاں کھاواں اے روٹی، اینوں تے کیویں کھاواں (جب آنکھیں نہ کھائیں، اسے کیسے کھاؤں؟)"
"کیا ہوا تائی اماں..... آپ رو کیوں رہی ہیں۔" شہرینہ ساتھ والے کمرے سے ان کی آوازیں سن کر آئی۔
"کچھ نہیں بیٹے..... جا اک گلاس پانی تے اک کپ چاہ دا لیا دے مینوں..... بچہ پانی نہیں دے کے گیا۔" انہوں نے دوپٹے سے آنکھیں پونچھتے ہوئے کہا۔
"لائیں میں دوسری نرم روٹی لا دیتی ہوں۔" اس نے معاملہ سمجھتے ہوئے کہا۔
"نہیں میں کھا لوں گی..... اللہ کسی کا محتاج نہ کرے..... بس چاہ پانی لیا دے۔" وہ بولی تو شہرینہ نے ان کے آگے سے روٹی اٹھائی اور واپس بھابی کے پاس باورچی خانے میں گئی اگر وہ انہیں کچھ کہتی تو گھر میدان جنگ بن جاتا۔ لہٰذا اس نے کچھ کہنے سے گریز کیا اور وہاں سے ایک تازہ روٹی اٹھائی، صاف ستھرے رومال میں لپیٹ کر سالن گرم کیا، ساتھ چائے اور پانی رکھ کر ان کے لیے لے آئی۔
"تائی اماں آپ کھانے کا مجھے کہہ دیا کریں..... کسی سے مت کہا کریں۔" شہرینہ نے انہیں کھانا دیتے ہوئے یہ الفاظ کئی مرتبہ دہرائے تھے مگر پھر بھی کئی وجوہات کی بنا پر انہیں دوسروں کو کہنا ہی پڑ جاتا تھا۔
"اچھا پتّر تیرا بھلا ہووے (بیٹا تیرا بھلا ہو)" وہ کھانا پکڑ کر بولیں۔
وہ بھاری جسم کی مالک تھیں اور سانس کی مریضہ بھی۔ کھانا خود لینے کی بجائے بہوؤں ہی کو کہہ دیتی تھیں اور بہوؤں نے بھی اپنی ذمہ داری بخوبی نبھائی تھی، [illegible]

تائی اماں بہت تنگ آ کر کہہ دیتیں کہ میری روٹی نہ پکایا کرو میں خود پکالوں گی مگر ان کے اس کہے کا کسی پر ذرہ برابر اثر نہ ہوتا۔ دوسرے نمبر والی بہو بھی ایسا ہی روکھا سوکھا کھانا دیتی کہ وہ رو پڑتیں، انہیں آج یہ خوف لاحق نہ ہوتا کہ کل کلاں کو ہم نے بھی بڑھاپے کا مزہ چکھنا ہے۔

☆☆☆

چالیسویں کا دن بھی آ گیا، تائی اماں کو فوت ہوئے چالیس دن گزر گئے تھے۔ اب بھی تمام احباب جمع تھے، تمام رسوم کی طرح چالیسویں کا ختم بھی بڑھ چڑھ کر دلوایا گیا۔

جب سب مہمان ایک کمرے میں محو گفتگو تھے تو بڑی پھوپو نے شہرینہ سے کہا۔ ''بیٹا! صبح فجر کی اذان سے پہلے ڈھائی مٹھی چاولوں کی ابالنی ہیں، چاولوں کے ساتھ دہی بھی رکھ لینا اور اذان ہونے سے پہلے پہل نئے برتنوں سمیت کسی غریب کے گھر بھیج دینا۔''

''وہ کیوں پھوپو؟'' شہرینہ کو پھر سے حیرانی ہوئی کہ اب یہ کیا ہے۔

''یہ روح ودرع (الوداع) کرنے کے لیے کرتے ہیں، اگر ایسا نہ کیا جائے تو روحیں انسانوں کو پریشان کرتی ہیں، گھر میں بھٹکتی پھرتی ہیں۔'' پھوپو اتنے اعتماد سے کہہ رہی تھیں جیسے کوئی بہت بڑی عالمہ ہوں۔ شہرینہ کچھ کہے بنا چند ثانیے کھڑی بت بنی انہیں دیکھتی رہی، کیونکہ یہ وقت بحث کرنے کا نہ تھا اور وہ اپنے احباب کی خصلت سے بھی خوب واقف تھی کہ وہ اپنے سے کسی چھوٹے کی بات کو کوئی اہمیت نہ دیں گے، تصدیق کرنے کے بجائے الٹا سچ کہنے والے کے علم کو برا بھلا کہیں گے، ناقص عقل، نافرمان کہیں گے۔

فجر سے پہلے اس نے چاول ابالے اور اسی کمرے میں واپس آ گئی جہاں سب پھوپیاں اور ممانیاں سو رہی تھیں ان میں سے ایک پھوپو اور ممانی کو جاگتا دیکھ کر وہ پوچھنے لگی۔

''پھوپو! چاول ایک پلیٹ سے زیادہ ہیں اب کیا کروں؟''

''بس تم ایک پلیٹ میں چاول اور ایک کٹوری میں دہی ڈال کر کسی غریب کے گھر بھجواؤ۔''

''جی اچھا۔'' وہ پلٹنے لگی کہ عقب سے ممانی نے اسے آواز دے کر روکا۔

''دو پلیٹوں میں چاول اور دو ہی کٹوریوں میں دہی ڈال کر کسی دو گھروں میں بھیجتی ہیں نہ کہ ایک پلیٹ میں......'' ممانی نے اپنی چارپائی پر بیٹھے بیٹھے شہرینہ اور پھوپو کی طرف دیکھتے ہوئے نیا حکم صادر کیا۔

''چاولوں کی دو پلیٹیں کس لیے دینی ہیں، فوتگی ایک ہوئی ہے تو پلیٹ بھی ایک ہی دینی چاہیے۔'' شہرینہ کی بجائے پھوپو نے اکڑتے ہوئے جواب دیا۔

''بیشک فوتگی ایک ہوئی ہے مگر ہم شروع سے یہی دیکھتے آئے ہیں کہ چالیسویں کے بعد بڑے بزرگ دو پلیٹیں چاولوں اور دو ہی کٹوریوں میں دہی بھیجتے ہیں۔ آگے آپ کی مرضی..... مانے یا نہ مانے......'' ممانی نے بھی سیدھا سادا کھرا جواب دے دیا۔

''ہم نے تو اپنے بڑوں سے یہی سنا تھا کہ ایک پلیٹ میں ہی بھیجتے ہیں خیر جو مرضی کرو......'' پھوپو نے بھی سارا ملبا مرضی پر ڈال کر بات ختم کر دی۔ دونوں کی بحث سے تنگ آ کر وہ وہاں سے چلی گئی۔ دونوں کی باتوں میں نہ تو پختگی تھی نہ ہی ان کے پاس اس بات کی کوئی مضبوط دلیل تھی سوائے اس کے کہ ہمارے بڑے یہ کہتے تھے، وہ کہتے تھے، فلاں کام کرتے تھے، فلاں کام نہیں کرتے تھے وغیرہ وغیرہ۔

دونوں بحث ایسے کر رہی تھیں جیسے بہت بڑی عالمہ فاضلہ ہوں مگر حقیقت حال یہی تھی کہ دونوں بے عقلی، بے علمی کی انتہا پر تھیں۔ کسی بات کی تحقیق کی بجائے دونوں بڑوں کی تقلید کے گن گا رہی تھیں، چاہے بڑے اپنے دور میں ایسے مسئلے مسائل سے لاعلم ہی رہے ہوں۔

☆☆☆

شہرینہ سوچتی کہ ہم کیسے عجیب اور بے حس لوگ ہیں، زندہ انسان کی قدر نہیں کرتے اور اس کے مرنے کے بعد اس سے اتنی محبت جتاتے ہیں اتنی محبت جتلاتے ہیں کہ جیسے وہ ہماری اس محبت کو چاہت کو دیکھ رہا ہوگا، محسوس کر رہا ہوگا..... جبکہ ایسا ناممکن ہے اس دنیا سے جانے والے ہماری محبت یا ریاکاری کو نہ تو دیکھ سکتے ہیں نہ ہی محسوس کر سکتے ہیں۔

اسے صد افسوس ہوتا کہ ہم کیوں فرسودہ خیالات سے نہیں نکلتے؟ ہم کیوں سچائی کی تصدیق و تحقیق نہیں کرتے؟ ہم کیوں زندہ انسانوں کی قدر نہیں کرتے؟

ہم کیسے نہ سمجھ، بے عقل لوگ ہیں جو بھلے وقت کو کھو دیتے ہیں۔ نیکیوں کو اپنے ہی ہاتھوں ضائع کر دیتے ہیں۔ اپنی جنت اپنے ہی ہاتھوں تباہ کر دیتے ہیں۔

اے انسان افسوس ہے تجھ پر، صد افسوس ہے تجھ پر.....

++

# قسم کھائی

جناب من

سلام مسنون!

اس سچ بیانی کو میں نے افسانوی انداز میں لکھا ہے تاکہ قاری کی دلچسپی قائم رہے۔ لوگ بڑی آسانی سے قسم کھالتے ہیں پھر جب اس کا نتیجہ سامنے آتا ہے تو سر پکڑ لیتے ہیں۔ صابر کی زندگی پر دو قسموں نے بہت اثر ڈالا۔ انہی دو قسموں کے گرد یہ سچ بیانی ہے۔

ایم حسن نظامی
(قبولہ شریف)

گاڑی برق رفتاری سے سوئے منزل گامزن تھی۔ بہار کی آمد آمد تھی۔ ہر سو ہریالی تھی۔ گندم کی ادھ پکی فصل لہلہارہی تھی۔ سرسوں کے پھول دور تک زرد قالین کی صورت پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی کماد، مکئی اور دوسری فصلیں اپنی توانائیاں بکھیر رہی تھیں مگر اس کے رگ و پے میں اداسی، ویرانی اور بے چینی چھائی تھی۔ پچھلی سیٹ پر اس کے بھائی کا بے حس وحرکت پڑا وجود اس کے بھی اعصاب پر حاوی تھا۔ جب یہ بے چینی اضطراب کی صورت بڑھی تو اس نے سر جھٹک کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سبھی مناظر تیزی سے پیچھے کی طرف بھاگتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ حد نگاہ سبزہ ہی سبزہ بکھرا تھا۔ اونچے اونچے کیکر، شیشم اور کھجور کے پیڑ ہیبت ناک صورت اختیار کیے ہوئے تھے۔ دھیرے دھیرے سبھی مناظر، سارے موسم اور روپے اس کی نگاہوں کے سامنے دھندلانے لگے۔ ان

بھاگتے دوڑتے مناظر کے ساتھ اس کی یادیں بھی ماضی کی طرف لوٹنے لگیں اور پھر آن واحد میں بیتے وقت کا پل پل اس کی نگاہوں کے پردہ اسکرین پر نمودار ہوتا چلا گیا۔

☆☆☆

چوہدری رحمت کے تین بیٹے اصغر، اکبر اور صابر تھے جبکہ ایک بیٹی صابرہ تھی۔ انہوں نے اپنی وراثت میں بہت بڑی حویلی اور کاروبار چھوڑا تھا۔ سبھی بہن بھائی تعلیم یافتہ اور سلجھے ہوئے تھے۔ دو بھائی شادی شدہ تھے اور کاروبار سنبھالے ہوئے تھے جبکہ صابر بی اے کرتے ہوئے حصول ملازمت کے لیے کوشاں تھا مگر اسے کہیں بھی شنوائی نہ ہوئی تو اس نے اپنا کاروبار کرنے کا سوچا اور اکبر و اصغر سے اپنا حصہ مانگا۔ وہ ٹال مٹول کرنے لگے۔ جب بات ذرا آگے بڑھی تو انہوں نے بہت تھوڑی سی رقم دے کر کہا کہ کام شروع کرو، بقیہ حصہ بھی تمہیں مل جائے گا۔ اس ادنیٰ سی رقم سے اس نے اپنا کاروبار شروع کیا مگر زیادہ آمدن نہ ہوئی جو کاروبار مزید آگے بڑھ سکے بمشکل دو وقت کی روٹی ہی چلتی۔ اسی اثنا میں بھائیوں نے اس کی شادی کا سوچا انہوں نے صابر سے رائے پوچھی اور رشتے کے بارے میں پوچھا۔ وہ خاموش رہا مگر ان کے بے حد اصرار پر اس کے لبوں سے ماموں کی بیٹی کا نام پھسل پڑا۔ اسکول کے دور میں وہ اکٹھے ہی پڑھا کرتے تھے۔ ایک دوسرے کی رفاقت میں جوانی کے جذبات نے سر ابھارا اور یوں دونوں نے جینے مرنے کی قسمیں کھائیں، عہد و پیمان کیے مگر چوہدری رحمت کی اچانک وفات پر دونوں طرف سے خاموشی چھا گئی اور صابر کی شادی کی بات آئی گئی ہو گئی۔

چھ ماہ گزرنے کے بعد بھائی، صابر کے کہنے پر رانی کے رشتہ کے لیے ماموں کے ہاں پہنچے تو اس نے اس رشتے پر رضامندی تو ظاہر کر دی مگر بہت بڑے جہیز، گاڑی اور زمین رانی کے نام کرنے کی شرط رکھی جس پر وہ خاموشی سے لوٹ آئے۔ اس بات کا صابر کو بہت زیادہ دکھ ہوا۔

☆☆☆

پھر وقت ذرا اور آگے بڑھا تو صابرہ کی شادی کی فکر انہیں بری طرح ستانے لگی۔ وہ جوانی کی حدود میں قدم رکھ چکی تھی۔ ماں باپ کے نہ ہوتے ہوئے اس سے اس کی رضامندی پوچھنا نہایت ضروری تھا۔

کس قدر خوش نصیب ہیں وہ بیٹیاں جو ماں باپ کی الفتوں اور دعاؤں کی چھاؤں میں رخصت ہوا کرتی ہیں۔ وہ چاہے بیٹی کی مرضی پوچھیں یا اپنے ہی انتخاب پر اسے بیاہ دیں۔ بیٹیاں ان کے اعتماد اور سوچ پر خاموشی سے تقدیر اور قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیا کرتی ہیں اور پوری عمر سر جھکائے رہتی ہیں۔

صابرہ کی ایک ہی ضد تھی پہلے بھائی صابر کی شادی کرو میں پیا کے گھر سدھار گئی تو صابر کی روٹی پانی کا کون بندوبست کرے گا۔ جبکہ بھابیاں پہلے ہی اسے قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتیں مگر ان کے بے حد اصرار پر صابرہ کو خاموشی اختیار کرنا پڑی۔ اب انہوں نے صابر کو تیار کیا کہ صابرہ سے اس کی رضامندی پوچھو۔

صابر نے ایک روز صابرہ کو خوش دیکھا تو بات چھیڑ دی۔ پہلے تو وہ ہنس کر ٹال مٹول کرتی رہی مگر صابر کی مزید کرید پر اس کے لبوں پر چچا کے بیٹے بلال کا نام پھسل ہی پڑا۔ اسے اچنبھا ہوا۔ وہ بغور اس کی صورت تکنے لگا جہاں بے پناہ مسرتوں کے پھول کھلے اپنی رعنائیاں بکھیر رہے تھے۔

”بھائی ہم ایک دوسرے سے بے پناہ پیار کرتے ہیں اور بلال نے قسم اٹھائی ہے کہ وہ میرے بنا عمر بھر کسی اور سے شادی نہیں کرے گا۔“

”بے بی وہ تو......“ صابر کو تشویش سی ہوئی۔ وہ خاموش تھا۔

”ہاں...... مجھے معلوم ہے۔ وہ نہایت غریب ہے مگر سودے دلوں کے ہوا کرتے ہیں امارت اور غربت نہیں دیکھی جاتی۔ اس کی شادی پچھلے سال ہو رہی تھی اس نے صرف اور صرف میری وجہ سے انکار کر دیا تھا۔ یوں رضیہ آگے بیاہی گئی۔ صابرہ بے بسی و بے چارگی کی تصویر بنی دور آکاش پر اڑتے پرندوں کو دیکھنے لگی۔

ایسی صورت حال میں صابر نے اس سے مزید بات کرنا مناسب نہ سمجھا اور بولا۔ ”بے بی...... تم پریشان نہ ہو میں بھائی جان سے بات کروں گا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گیا اور صابرہ گزرے لمحوں میں کھونے لگی۔

ہمارے معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ دولت مند روپے پیسے اور بینک بیلنس پر تکبر کرتے ہوئے غریبوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور غریب اپنے لکھے مقدر پر نوحہ کناں ہوتے ہوئے قبر کی پہنائیوں میں اترتے چلے جاتے ہیں۔ ان کی حسرتیں، آہیں اور خواہشیں دم توڑنے لگتی ہیں۔ دولت بھی کسی کی نہیں ہوا کرتی اور نہ ہی وقت سدا ایک سا رہتا ہے۔



آج میرے پاس ہے تو کل کسی اور کے پاس۔ امارت اور غربت کا سفر دھوپ چھاؤں کا سا ہے جو سدا بدلتا ہی رہتا ہے تو پھر ہم اس پر اس قدر اعتماد اور بھروسا کیوں کر لیا کرتے ہیں۔ اپنے سے کم درجے کے لوگوں کو حقارت کی نظر سے کیوں دیکھتے ہیں۔ غریب کے جذبات سے کیوں کھیلتے ہیں۔ انہیں اپنے سے کمتر کیوں سمجھتے ہیں۔ حالانکہ صورتیں، سوچیں اور جذبات بھی ایک جیسے ہوا کرتے ہیں۔ اپنا اچھا برا اور خواب و خیالات پر بھی سبھی کو یکساں اختیار حاصل ہے۔ یہ سبھی کچھ سوچتے ہوئے صابرہ کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلکنے لگیں۔

صابر نے بہن کی پسند کے بارے میں اکبر سے بات کی تو وہ یکدم ہی اچھل پڑا جیسے اسے کسی بچھو نے کاٹ لیا ہو۔

”بلال اور ہمارے اسٹیٹس میں کتنا بڑا فرق ہے۔ وہ دن بھر اپنی تعلیم میں مگن رہتا ہے تو رات گئے مزدوری کرتا ہے تب کہیں جا کر ماں بیٹے کی روٹی روزی پوری ہوتی ہے اور ہم...... ہمارے پاس روپے کی ریل پیل۔ کتنا بڑا کاروبار ہے۔ نہیں...... صابر...... نہیں۔ اس کا اور ہمارا کیا جوڑ ہے۔ ایسا تصور میں بھی ممکن نہیں۔“ اس نے سر ادھر ادھر ہلایا۔

”مگر...... بھیا! وہ صابرہ......“ صابرہ کا نام اس کے گلے میں جیسے اٹک سا گیا اور وہ خاموشی سے اکبر کو دیکھنے لگا۔

”گولی مارو اسے۔“ وہ صابر کی بنی ان سنی کرتے ہوئے غصے سے دہاڑا۔

”مگر بھائی......“ اس نے بولنا چاہا۔

”اگر مگر کچھ نہیں چھوٹے...... صابرہ کی شادی وہاں ہو گی جہاں ہم چاہیں گے ورنہ......!“

”ورنہ کیا......؟“ صابر نے بغور اس کی آنکھوں میں جھانکا جو لال انگارہ ہو رہی تھیں۔

”ورنہ میں اس حرام خور کا گلا دبا دوں گا۔“ اکبر نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا اور جلدی سے باہر نکل گیا۔

صابرہ بیڈ روم کی کھڑکی سے کان لگائے سبھی کچھ سن رہی تھی۔ وہ پل بھر کو کانپ کر رہ گئی۔ اسے بہن کے جذبات و احساسات کا ذرہ بھر بھی خیال نہ رہا۔ امارت کے آسیب نے اس کے خیالات کا ترازو بھی جھکا دیا تھا۔ وہ صابرہ کے انتخاب پر اسے مرنے مارنے پر تل گیا تھا۔ وہ غم کی تصویر بنی ساکت تھی۔ اسے اپنی امیدوں، خواہشوں اور حسرتوں کے محل ریت کی مانند زمیں بوس ہوتے محسوس ہونے لگے۔ اس کا پورا وجود دکھ سے بھر گیا اور یاس و حسرت سے آنکھیں بری طرح چھلکنے لگیں۔

☆☆☆

صابر کی بھابیوں سے پہلے ہی نہیں بنتی تھی۔ بات بات پر لڑائی جھگڑا آئے روز کا معمول تھا۔ بھائیوں نے اپنی بیگمات کے اکسانے پر صابرہ اور صابر کو کنوارے ہی علیحدہ کر دیا۔ اسے معمولی رقم میں کام کرنا دشوار ہی نہیں ناممکن سا ہو کر رہ گیا اور اب تو دونوں بہن بھائی کی دو وقت کی روٹی بھی مشکل ہو کر رہ گئی۔ تبھی اس نے ایک پھر بھائیوں سے اپنا حصہ مانگا۔

انہوں نے اندازے کے مطابق ہی کاروبار کا جائزہ لگایا۔ اس دور کے مطابق کل اثاثہ نوے ہزار میں گنا گیا جبکہ یہ بولی کسی کباڑیے کے اندازے سے بھی کم تھی۔ عام دکاندار کی نظر میں تقریباً چار لاکھ سے بھی تجاوز کرتی تھی۔ انہوں نے تین حصے کیے۔ تیس ہزار روپے لاہور جہاں سے سامان خریدتے تھے وہاں دکاندار کو دینے کا کہہ دیا۔ بقیہ رقم سے اسے بمشکل بیس ہزار کا حصہ دار ٹھہرایا گیا۔ چونکہ پندرہ ہزار وہ پہلے ہی لے چکا تھا۔ بقیہ پانچ ہزار روپے ہزار ہزار روپے کی ماہوار قسط دینے پر وہ رضامند ہوئے۔

پوری وراثت سے اس قدر کم رقم اس کے ساتھ نہ صرف مذاق تھا بلکہ طمانچہ تھا اس کی شرافت کے منہ پر کہ اس نے باپ کے کاروبار سے اپنا حق کیوں مانگا۔

صابر اس ادنیٰ سی رقم اور ان کے بٹوارے پر قطعی راضی نہ ہوا تو اکبر نے اسے پیار سے بلا کر سمجھانے کے سے انداز میں کہا۔

”بیٹے...... تو ہمارا چھوٹا بھائی ہے۔ بھلا ہم تمہارا حق کھا سکتے ہیں؟“

”مگر بھیا...... میں آپ کی اس تقسیم اور ایسے حصے کرنے پر قطعی رضامند نہیں ہوں۔ آپ نے بھی کاروبار کو کباڑیے کے ترازو میں تولا ہے۔ یہ میرے ساتھ سراسر ناانصافی ہے۔ مجھے اس بندر بانٹ سے اختلاف ہے۔“

اکبر نے اس کا بازو تھاما اور اپنے ساتھ کھڑا کرتے ہوئے خانہ کعبہ کی طرف منہ کرتے ہوئے بولا۔

”خدا کی قسم! میں نے کسی قسم کی ہیرا پھیری نہیں کی میں نے بھی کاروبار کا جائزہ درست اور ایمانداری سے لگایا

ہے۔"

صابر سیدھا سادا اور ایمان کا پختہ انسان تھا۔ نماز روزے کا پابند اور کسی سے زیادتی کرنے والا بھی نہیں تھا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں اور دل رونے لگا۔ وہ چپ چاپ ان کے گھر سے نکل گیا۔ اس کے اندر جیسے دھماکے سے ہونے لگے اور پورا وجود ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو کر رہ گیا۔ اس کے وجود کی رگ رگ چیخ چیخ کر کسی انہونی کا اعلان کرنے لگی ہو جیسے۔ وہ بھیگی پلکوں اور لرزتے وجود کو لیے بمشکل گھر پہنچا اور جاتے ہی پلنگ پر ڈھے سا گیا۔

تڑپ کر...... صابرہ نے اس کی بے چینی اور پریشانی کو بھانپتے ہوئے پوچھا۔ "بھیا کیا ہوا؟ آج کچھ زیادہ ہی پریشان دکھائی دے رہے ہو۔ خدا نہ کرے کوئی نقصان تو نہیں کر آئے۔"

"ہاں...... بہنا! آج میں اپنی عمر بھر کی پونجی ہار آیا ہوں۔ بھائیوں نے مجھے بھی کاروبار سے خالی ہاتھ نکال دیا ہے۔"

وہ حسرت بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی......!

"انہوں نے میرے ساتھ آج ایسا سلوک کیا ہے کہ دشمن بھی ایسا نہیں کرتا۔" اس کی آنکھوں سے اشک بہنے لگے۔

"مگر...... گھر میں جو زیورات وغیرہ تھے۔" وہ حیران ہوئی۔

"وہ کہتے ہیں کہ سبھی کچھ ہمارا ہے۔ ماں جی نے تمہارے اور بہن کے لیے بمشکل دو دو تولے سونے کے زیور بنائے تھے وہ ہمارے پاس امانت ہیں جب جی چاہے لے لینا۔"

"آپ فکر نہ کریں بھیا! میں ان سے بات کروں گی۔" اس نے اپنے آنچل سے صابر کے آنسو صاف کرتے ہوئے اسے مطمئن کرنا چاہا۔

"وہ ہرگز نہیں مانیں گے۔ میں نے قسمت کا لکھا اپنے دامن میں ڈال لیا ہے۔ اب میں ان سے کچھ نہیں مانگوں گا۔ کچھ بھی نہیں۔" وہ دور کھیتوں میں کھڑے اس ٹنڈ منڈ پیڑ کو دیکھنے لگا جس پر کوئی شاخ تھی اور نہ پتہ۔

جب دلوں میں پیار نہ رہے۔ محبت کی جگہ نفرت بھر جائے دین و ایمان دولت بن جائے تو پھر رشتے ناتے دم توڑ جایا کرتے ہیں۔ اپنوں کا لہو سفید پڑ جاتا ہے۔ بھائی، بھائی نہیں رہتے دشمن لگتے ہیں۔ اپنے ہی خون کے پیاسے بن جاتے ہیں مگر......!

اوپر والا بھی سب کچھ دیکھ رہا ہے۔ اس کی لاٹھی بے آواز ہے۔ اور...... کرنی کا انجام تو ہر بندے کو بھگتنا ہی پڑتا ہے مگر تب تک بہت سا وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

☆☆☆

موسم بدلتے رہے۔ وقت بھی اپنی مخصوص رفتار سے گزرتا رہا۔ صابر نے اسی تھوڑے بہت کاروبار کو اپنا مقدر سمجھا۔ دلچسپی سے اسے جاری رکھا اور جان توڑ محنت کرنے لگا جس سے ان کی گزر بسر کچھ آسان ہونے لگی مگر...... کبھی کبھی رانی کا تصور اور اس کی رفاقت میں گزرے پل اسے رلانے جاتے۔ اسے وہ لمحے یاد آتے جب رانی اور اس کے باپ سے باتیں ہوئی تھیں۔ ایسی باتیں جن میں وفاؤں کی چاشنی تھی۔ الفت کے تذکرے اور محبتوں کی خوشبو تھی۔

ان کا ملن حد سے بڑھا تو رانی کے باپ نے پاس بلا کر کہا تھا۔ "صابر بیٹا۔ میں نے کون سا جرم کیا ہے جو تم میری غیرت تباہ و برباد کرنے پر تلے ہو؟"

"میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟" اس نے حیرت اور نرمی کے ملے جلے لفظوں سے پوچھا۔

"تم جیسے لوگ ہمیشہ یہی کرتے آئے ہیں۔ ہم جیسے غریب لوگوں کی بھولی بھالی لڑکیوں کو بہلا پھسلا کر سنہرے خواب دکھاتے ہوئے ان کی جوانیوں سے کھیلتے ہیں...... اور پھر وہ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتیں۔ میں زمانہ شناس بندہ ہوں اپنی آنکھوں کے سامنے ایسا نہیں ہونے دوں گا۔" اس کا لہجہ تلخ اور ماتھے کے بل گہرے پڑنے لگے۔

"آپ غلط سمجھے ہیں انکل۔" اس نے قدرے کھلتے ہوئے کہا۔ "میں رانی سے شریفانہ طریقے سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ اور یہ شادی آپ کی رضامندی سے ہوگی۔ ہر انسان ایک جیسا نہیں ہوا کرتا۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کریں۔" جس سے وہ ذرا نرم پڑ گیا اور اس کی بوڑھی آنکھوں سے اشک بہہ نکلے۔ صابر نے اسے مکمل یقین دلایا کہ میں آپ کے اعتماد کو کبھی مجروح نہیں ہونے دوں گا۔ تب سے وہ اس پر مکمل بھروسا کرنے لگا۔

اس روز گھر کے سبھی افراد کسی قریبی شادی پر گئے ہوئے تھے۔ شب کے پچھلے پہر دنیا پرسکون نیند سوئی ہوئی تھی جب رانی اس کے گھر آن وارد ہوئی تھی۔ اس کا دل یوں دھڑک رہا تھا جیسے ابھی سینے سے باہر آ جائے گا۔ سانسیں بے ترتیب اور جسم لرز رہا تھا وہ بوکھلائی صورت لیے سامنے تھی۔

"تو اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہے۔ خیر سے تمہارا باپ تو ٹھیک ہے نا......"

"وہ شام سے گھر سے باہر ہے۔" وہ مذبذب میں تھی جیسے......!

"تو...... پھر...... تجھے اس وقت یوں ہرگز نہیں آنا چاہیے تھا۔ میں تمہیں شہنائیوں کی گونج میں سہرا سجا کر گھر لانا چاہتا ہوں۔" وہ حیران سا ہوا۔

"تو...... تم...... مجھ سے شادی کرو گے نا......" اسے جیسے اس کی بات کا یقین نہ ہو۔

صابر نے اس کی طرف بغور دیکھا اور کہا۔ "ہاں رانی...... ہاں۔"

رانی کے چہرے پہ پھولوں جیسی شگفتگی چھا گئی۔

"ہاں ضرور اپناؤں گا۔" اسے رانی کے تپتے ہوئے مرتعش جسم کے لمس کی وجہ سے جواب دینا دوبھر ہو رہا تھا۔ اسے محسوس ہو رہا تھا کہ اگر وہ کچھ دیر مزید اس کے قریب رہی تو اس کے اعصاب چٹخ جائیں گے۔ کنپٹیوں کی رگیں پھٹ جائیں گی۔ اس کا خون رگوں میں پھنکارنے لگا تھا۔ جذبات میں دھماکے سے ہونے لگے اور آنکھوں کے سامنے تاریکی کی سیاہ چادر پھیلنے لگی تھی۔ گہری تاریکی کی دبیز چادر......

لیکن اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ طوفان آئے اور اپنے ساتھ سبھی کچھ بہا کر لے جائے۔ اگر وہ اس دوشیزہ کو نہ بھی اپنا سکے تو کم از کم اس کا مجرم تو نہ بنے۔

اس نے دھکیل کر اسے سینے سے دور کیا تو رانی گڑبڑا کر بولی۔ "یہ کیا حرکت ہے میں...... میں تمہیں پسند نہیں صابر؟"

"اس لیے کہ میں تمہیں بے حد چاہتا ہوں۔ اگر میں تمہیں نہ پا سکوں تب بھی میری وجہ سے تمہاری زندگی پر کوئی آنچ نہ آئے۔ ہر چیز اپنے وقت پر ہی اچھا بھلا لگتا ہے۔ یہ میری زندگی کا تجربہ ہے۔ میں تمہارے باپ سے کیے وعدے پر قائم ہوں اور اپنے خوابوں کو زندہ تعبیر دیکھنا چاہتا ہوں۔"

صابر کے جواب پر وہ خفا سی ہو کر اٹھتے ہوئے اپنے قدم دھیرے دھیرے بڑھاتی ہوئی دروازے سے نکل گئی۔

وہ تو اس کے باپ کی توقعات پر پورا اترنا چاہتا تھا پھر بھلا انہوں نے بھائیوں سے جہیز، گاڑی اور پلاٹ کا کیونکر مطالبہ کیا تھا۔ یہی سوچیں تھیں جو اسے اندر ہی اندر کرب میں مبتلا کیے دے رہی تھیں اور وہ یادوں کے اعصاب شکن زاویوں میں جکڑتا چلا جا رہا تھا۔ لحظہ بہ لحظہ بے چین و مضطرب کیے ہوئے تھا۔ یوں نجانے رات کے کون سے پہر اسے نیند کی دیوی نے اپنی آغوش میں لے لیا۔

☆☆☆

اس روز صابر کام پر جانے کے لیے گھر سے نکل رہا تھا کہ سائرن بجاتی تیز رفتار ایمبولینس آ کر اچانک ان کے دروازے پر رکی۔ "اکبر کا روڈ ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔" ایک شور سا بلند ہوا اور پھر بھی لوگ آن واحد میں ادھر بڑھنے لگے۔

"یا اللہ خیر......" جس جس نے سنا ان کے لبوں سے بے ساختہ الفاظ ادا ہوئے۔

"تمہارے بھائی کی حالت بہت خراب ہے اسے بڑے کسی اسپتال لے جانا ہے۔" ریسکیو عملے سے کسی نے صابر کو جھنجھوڑا وہ اس افتاد سے چونکا اور تقریباً بھاگتے ہوئے اپنے گھر میں داخل ہوا۔ کچھ رقم جیب میں ٹھونسی اور الٹے قدموں گاڑی میں آ بیٹھا۔ تب تک اصغر بھی آ چکا تھا پھر گاڑی تیزی سے سڑک پہ دوڑنے لگی۔ سائرن پھر سے شور مچانے لگا۔

چھٹی ہونے کی وجہ سے ہیلتھ سینٹر میں سناٹا تھا۔ اتفاق سے ڈسپنسر موجود تھا۔ اس نے اسے طبی امداد دی۔ اس کے سر اور جسم پر مرہم پٹی کر دی پھر پورے جسم کو چیک کرتے ہوئے بائیں ٹانگ پر پہنچ کر وہ حیران رہ گیا۔ اکبر کی ٹانگ گھٹنے سے نیچے بل کھاتے ہوئے ایک طرف مڑی ہوئی تھی۔ اسے سیدھا کر کے اسے پٹیوں سے باندھا اور پھر بڑے اسپتال کا رخ کیا۔

بڑے اسپتال کے ڈاکٹر رؤف علوی نے اکبر کا مکمل چیک اپ کرتے ہوئے دو تین ٹیسٹ لیے اور اگلی صبح پاؤں کا آپریشن اور بلڈ کا بندوبست کرنے کی اطلاع دی۔ اصغر اکبر کے پاس رکا اور صابر بلڈ کے لیے نکل کھڑا ہوا۔

اب اسے رہ رہ کر اٹھائی گئی اس قسم کا خیال ستانے لگا تھا جو اکبر نے اپنا منہ کعبہ کی طرف کرتے ہوئے اٹھائی تھی۔ وہ صبر کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ یہ اسی اٹھائی گئی جھوٹی قسم کا نتیجہ تھا کہ آج وہ بستر مرگ پر پڑا تھا صابر کو جھرجھری

سی آ گئی اور آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہہ نکلے۔ خدایا تو ہی بہتر جاننے والا ہے تیرے فیصلوں پر کسی کو کچھ اختیار نہیں۔ وہ اندر ہی اندر بڑبڑایا۔

ڈاکٹر صاحب نے ٹانگ کے آپریشن کے لیے اس کی سوچ سے بہت زیادہ رقم مانگی جس پر اصغر خاموشی سے رضامند ہوگیا۔ یوں اکبر کا آپریشن کر دیا گیا۔ اگلے روز ڈاکٹر نے یقین دہانی کراتے ہوئے انہیں چھٹی دے دی۔

☆☆☆

کاروبار اب اصغر نے سنبھالا ہوا تھا۔ بستر پر پڑا اکبر انہیں ہدایات جاری کر رہا تھا۔ اکبر کی بیوی ناک منہ بناتی ہوئی اس کے پاس سے گزرتی۔ اب اس کا رویہ بھی بدلنے لگا تھا۔ بات بات پر اکبر کو کاٹ کھانے کو دوڑتی۔ یوں آئے روز گھر میں تو...... تو...... میں...... میں کی تکرار ہونے لگی۔ بات حد سے بڑھی تو وہ روٹھ کر میکے چلی گئی۔ اب اکبر کی نگہداشت صابر اور صابرہ پر آن پڑی۔ وہ اس کا مکمل خیال رکھے ہوئے تھے۔ اگر کبھی کبھار صابر کام پر چلا جاتا تو واپسی پر اکبر اس سے الجھنے لگتا۔ اکیلی بہن تمام دن بھاگ بھاگ کر ہلکان ہو جاتی ہے۔ تمہیں اپنے کام کی فکر ہے۔ میرا ذرہ بھر احساس نہیں۔

صابر دل مسوس کر رہ جاتا اور زیر لب بڑبڑاتا۔ "تو نے ہمارا کب احساس کیا ہے۔ تمہارے ذہن اور اعصاب پر تو دولت سوار تھی۔ اب بتاؤ...... بھائی بہن...... ماں باپ اور قریبی رشتے زندگی کی خوبصورتی میں کتنے اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس وقت تو...... تم دھکے اور گالیاں دے رہے تھے۔ اب...... اب بھائی، بھائی پکار رہے ہو۔ کہاں ہے وہ بیوی بچے جن کے مستقبل کی خاطر تم الگ ہو کر بھی کچھ منظم کرلیا تھا اور مجھے بھی دست و بازو نکال باہر کیا تھا مگر...... یہی کچھ تقدیر اور قسمت کا لکھا سمجھ کر وہ اس کی خدمت کر رہے تھے۔ اپنا فرض نبھا رہے تھے اور اکبر پھر بھی ان پر راضی نہ تھا۔

کام سے واپسی پر وہ اصغر سے دن بھر کی کارروائی سنتا تو اس سے بھی جھگڑنے لگتا کہ میری موجودگی میں اتنے ہزار روپے روزانہ کی آمدنی تھی اب اتنے ہزار کم کیسے ہوگئی۔ تم نے وہ سامان سستا بیچا۔ وہ چیز اتنے روپے کی کم کیوں بیچی۔ کبھی کبھی تو اصغر بھی اس کی نوکیلی اور جلا دینے والی باتوں سے چڑ سا جاتا مگر مجبوری میں ابھی کچھ چپ چاپ سنتا رہتا۔

اسی اثنا میں تین ماہ گزر گئے جب چیک اپ کروایا گیا تو پتا چلا کہ ٹانگ کی ہڈی نہیں جڑ سکی اور آپریشن دوبارہ کرنا پڑے گا۔ بہن بھائیوں کے چہروں پر ہوائیاں سی اڑنے لگیں اور وہ دل مسوس کر رہ گئے۔

☆☆☆

اکبر کی ٹانگ کی فکر، رانی کی یادوں کی اذیت، کاروبار کا نہ ہونا اور صابرہ کی جوانی کی فکر۔ یہ ایسے اندوہناک اور اعصاب شکن واقعات تھے جو صابر کے دل پر ہر وقت مسلط رہتے۔ اس کی روح کے سکون کو تفکرات کھائے جا رہی تھی۔ اس کا دل اچاٹ سا ہونے لگا۔ اس کا جی چاہتا جس قدر جلدی ممکن ہو وہ یہاں سے کہیں دور بھاگ جائے۔

وقت بھی ایک سا نہیں رہتا۔ آج دکھ ہیں تو کل مسرتیں۔ خزاں کے بعد بہار ضرور آتی ہے۔ رات کی سیاہی دن کے اجالے میں ضرور نمودار ہوا کرتی ہے۔ مشکلات خواہ کتنی ہی صبر آزما کیوں نہ ہوں آسانیاں ضرور پیدا ہوا کرتی ہیں اور یاس و حیرت سے مرجھائے چہروں پر بھی تا بھی مسرتیں ضرور کھلا کرتی ہیں بس ذرا ہمت اور حوصلے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

آفتاب، صابر کا گہرا دوست تھا۔ وہ اس کے سبھی واقعات سے بخوبی واقف تھا۔ ساہیوال میں اس کا بہت بڑا کاروبار تھا۔ وہ ہر سال کمپنی کے ٹکٹ پر دو افراد سعودیہ بھیجتا تھا۔ وہ اس سے ملا اور بولا۔ "یار تم اس قدر پریشان نہ ہو۔ میرے پاس سعودیہ کا ویزا ہے میں نے دو آدمیوں کو تیار کیا تھا مگر بروقت اسلم نامی بندے کا باپ وفات پا گیا اس نے جانے سے انکار کردیا۔ اب تم تیاری کرو میں تمہیں اسی ویزے پر سعودیہ بھیج دوں گا۔"

اس کی بات سن کر صابر کا چہرہ خوشی سے سرشار ہوگیا۔ فرط جذبات سے اس کے آنسو نکل آئے۔ آفتاب نے اسے گلے لگا لیا۔ یوں چند روز میں وہ حالات کے دکھوں سے رنگا، دیار غیر کے لیے رخت سفر باندھنے لگا۔

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ جانے سے قبل ایک بار رانی کو مل لے اس سے پوچھے کہ تم نے تو ہی بیکراں محبتوں کا والہانہ اظہار کیا تھا اور اس قدر قریب ہو چلی تھی کہ تم اور میں کا فرق مٹ جاتا۔ تم نے کہا تھا میں تم سے عمر بھر پیار کرتی رہوں گی پھر...... پھر تمہارے باپ نے رشتے کے لیے کیوں کر جواب دیا۔ مجھے کیوں ٹھکرا دیا۔ یہ سوچ کر اس نے



اپنے قدم ادھر بڑھا دیے۔

رانی گھر میں نیم کے بوڑھے پیڑ تلے کپڑے دھو رہی تھی۔ اسے یوں اچانک دیکھ کر چونکی اور پھر اس کے مقابل آ کھڑی ہوئی۔ وہ بھی چپ چاپ تھا اور دل کی ڈکشنری میں الفاظ تلاش کر رہا تھا کہ وہ گویا ہوئی۔

"آ...... آپ دور جا رہے ہو صابر۔" اس کے لب بمشکل "وا" ہوئے اور اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

"ہاں...... مگر......" صابر نے بولنا چاہا۔

"آپ جا رہے ہیں تو مجھے ہرجائی سمجھ کر بھلانے کی کوشش نہ کرنا اور نہ ہی کسی رنج و غم کو دل میں جگہ دینا۔ شاید چند دنوں تک جدائی کا احساس تمہیں ستائے لیکن خدارا، بزدلوں کی طرح کسی اور چیز میں سکون تلاش نہ کرنا بلکہ اپنی معمولات کے ساتھ ہنس ہنس کر زندگی کا ساتھ نبھانا۔" وہ اسے بغور دیکھے جا رہی تھی۔

وہ اب تک خاموش تھا پتھر کی طرح ساکت لیکن اس کے لہجے میں جانے کیا بات تھی کہ دل کی گہرائیوں سے پھوٹ پڑا۔ آنسو پلکوں کا بند توڑ کر امڈ آئے۔ رانی نے جھک کر اس کے سینے پر سر ٹکا دیا اور ہولے ہولے سسکیاں لینے لگی۔ تب صابر کو احساس ہوا کہ اس کا غم رانی کا بھی غم ہے اور یہ آنسو دونوں کے یکساں ہیں۔ اس احساس نے گویا دل پر شبنم کی مانوس سی ٹھنڈک پھیلا دی اور دکھ کے بگولے تہ تشفی ہونے لگے۔ اس کے دل میں سوچوں کی تیز و تند آندھیاں سنسناتی رہیں اور کرب کی اندھی گہرائیوں میں ڈوب کر اس نے بڑی تگ سے اپنے دل کو یقین دلایا کہ رانی خود غرض، ہرجائی اور بے وفا نہیں ہے۔

"تمہارے باپ نے میرے بھائیوں کو جواب کیوں دیا؟" آخر دل کی بات اس کی زبان پر آ ہی گئی۔ پھر بھی پردے کھل سے گئے۔

"کون سا جواب؟ اور کس بات پر؟" وہ بے بسی کی تصویر بنی پوچھ رہی تھی۔

"یہی کہ جہیز کا بھاری سامان، گاڑی اور زمین۔" وہ بولتا ہی چلا گیا۔

رانی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ "یقین کرو صابر۔ مم...... مجھے کچھ خبر نہیں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تمہارے بھائی کب ہمارے گھر آئے۔ شاید...... یہ بات بابا کو معلوم ہو۔ وہ ان سے ملے ہوں۔ مم...... مجھے...... مجھے خبر نہیں۔" وہ روہانسی ہونے لگی۔ پھر کئی لمحے گزر گئے پھر وہ آہستگی سے بولی۔ "صابر...... میں نے تمہیں چاہا۔ تم سے محبت کی اور سدا تمہاری رہوں گی۔" اس نے دور خلاؤں میں گھور کر اپنی پختہ وفا کا یقین دلایا۔ تو وہ پھر سے اپنے تازہ ذہن کو لیے باہر چلا آیا۔ باہر دھیمی دھیمی خنک ہوا کی سرسراہٹ میں خوشی بھرے گیتوں کا پیار پھیلتا جا رہا تھا جو اسے مطمئن کرنے کے لیے کافی تھے۔

☆☆☆

گھر آ کر اس نے رخت سفر باندھا۔ بہن اور بھائی کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھا تو اکبر بولا۔ "یہ کدھر جا رہا ہے۔ صابر؟"

"بھائی...... یہیں کام پر جا رہا ہے۔"

"اچھا......" اس نے اچھا کو قدرے لمبا کرتے ہوئے کہا۔ پھر ذرا توقف کے بعد بولا۔ "جانے دو اس منحوس کو۔ اسی کی وجہ سے ہم خدا کی گرفت میں ہیں شاید......"

صابر نے بھی کچھ اپنے کانوں سے سن لیا تھا مگر اس میں بھائی کو جواب دینے کی ہمت نہ تھی شاید۔ اس نے بیگ اٹھایا اور خاموشی سے سر جھکائے گھر کا بیرونی گیٹ عبور کر گیا۔ اس کے لیے اتنا ہی سننا کافی تھا شاید...... اس کا دوست آفتاب منتظر تھا اور وہ اس کے ساتھ چلا آیا۔

گاؤں سے باہر آ کر اس نے آخری بار ایک نظر گاؤں کی طرف دیکھا اور پھر بس میں سوار لاہور کے لیے روانہ ہوگیا جہاں اس کی فلائٹ تھی۔

☆☆☆

صابر نے اپنے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں اور مجبوریوں کو بالائے طاق رکھ کر ہمت نہ ہاری اور نئے عزم و حوصلے سے اپنے سینئرز کے بتائے کام پر ڈیوٹی سرانجام دینے لگا۔ ابتدائی ایام میں اسے ذرا دقت ہوئی مگر دھیرے دھیرے وہ اس ماحول میں اپنے آپ کو مصروف رکھنے لگا۔ جب بھی اس کا دل ذرا پریشان ہوتا تو گزرے دنوں کو یاد کرتے ہوئے چند آنسو بہا لیتا۔ تب اس کا وجود ہلکا پھلکا اور ذہن پرسکون سا ہو جاتا اور وہ پھر سے اپنے کام پر جت جاتا۔

اس نے اپنے اسٹاف کے کسی فرد کو بھی شکایت کا موقع نہ دیا یوں رفتہ رفتہ وہ سبھی کے دلوں پر حکمرانی کرنے لگا اور سبھی اس کے گن گانے لگے۔

اپنوں سے دور اس صحرا میں کام کرتے ہوئے اسے

چند ماہ ہو چکے تھے۔ وہاں اسے وہی کام ملا تھا جس کا وہ ماہر
تھا بھی وہ اسے آسانی سے سرانجام دے رہا تھا۔ اس کے
ساتھ بیشتر پاکستانی تھے۔ وہ اپنے اہل خانہ کے لیے ریالوں
کی صورت میں خوشیاں خریدنے گھروں سے کوسوں دور
موجود تھے۔ ان کے اپنے مسکراہٹوں اور خوشیوں کے
دلفریب سپنوں میں یوں کھو گئے تھے کہ انہیں ان کے دکھ
ہاتھوں کے زخم اور رتجگوں کی بے خوابی دکھائی نہیں دیتی تھی یا
وہ اپنوں کو سرے سے ہی فراموش کر بیٹھے تھے کہ ان کے
سامنے تو بچاراں خوشیوں کے انبار لگے تھے۔ انہوں نے
اپنوں کو زندگانی کی بھی ضرورتیں پا کر فراموش کر دیا تھا۔
انہیں کیا معلوم کہ ایسی مسرتیں اور آسائشیں میسر کرنے
والے اپنے دل کا لہو کیوں کر خرچ کرتے ہیں اور ان سے
دوری کا بچاراں دکھ کیسے برداشت کر رہے تھے۔
کاش ہمارے اہل خانہ اپنی خواہشیں اور ضرورتیں
محدود کر لیں تو ان کے اپنوں کو دیار غیر میں ان جاں گسل اور
کربناک لمحات سے نہ گزرنا پڑے۔
اس نے کئی ساتھیوں کو اپنوں سے جدائی کی آگ میں
چھپ چھپ کر آنسو بہاتے اور سرد آہیں بھرتے دیکھا تھا۔
انہیں اپنے گھر اور گھر والے شدت سے یاد آتے تھے۔ جن
سے کبھی دوری کا خواب بھی انہوں نے نہیں دیکھا تھا۔ ان
کے سامنے بس اپنوں کے ارمان ہی تھے جن کا حکم تھا کہ وہ
اس وقت تک گھر واپس نہ لوٹیں جب تک کہ بھی ضرورتیں
پوری نہ ہو جائیں۔
یادیں پیچھے لوٹیں تو اسے ایک دم رانی یاد آنے لگی۔
وہ من موہنی، خوبرو اور اسمارٹ سی دوشیزہ۔ وہ اس کے اس
قدر قریب چلی آئی تھی جیسے روح اور بدن کا بندھن۔ مچھلی اور
پانی کا ناتا، چندا اور چکور کی قربت ہو۔ پھر اسے بھائی،
بھابیوں کے ناروا سلوک، ان کی تقسیم اور پیاری بہن صابرہ
شدت سے یاد آنے لگی جو صرف اور صرف بلال کا نام لبوں
پر سجائے پھرتی تھی اور اسے ہی سب کچھ سمجھ کر اپنا جیون بتا
رہی تھی۔
وہ بھابیوں کی تلخ کلامی، ان کے سلوک اور بدنیتی کو
یاد کرتے ہوئے رونے لگتا مگر سر جھٹک کر پھر سے اپنے کام
میں مصروف ہو جاتا۔ اسے یہ حسرت اور خواہش بری طرح
ستاتی تھی کہ میں امیر بنوں۔ میرے پاس بھی زیادہ سے
زیادہ روپیا پیسا ہو کہ آج کل کے دور میں دولت ہی عزت
ہے، دولت ہی مقام ہے اور دولت ہی اسٹیٹس ہے ورنہ
زندگی...... زندگی نہیں موت ہے...... بدتر موت۔
دوسرے ساتھیوں کی طرح اس نے بھی دن دیکھا اور
نہ رات۔ اپنی جان کو مارتے ہوئے جان توڑ محنت کی۔
مشقت اٹھائی۔ دن کو ڈیوٹی پر ہوتا تو رات اوور ٹائم میں بسر
کرتا۔ کھانے پینے، اوڑھنے بچھونے اور لباس پر بھی کم سے
کم خرچ کرتے ہوئے روپے ریالوں کی صورت اکٹھے
کیے۔ اپنی بچاراں خواہش کو دبا کر دیار غیر میں محنت مزدوری
کرنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ جو اس نے بڑے احسن
طریقے سے سرانجام دیا اور اپنے سینئرز اور ماتحتوں سے
مبارکبادیں وصول کیں۔

☆☆☆

دو سال کا ویزا ختم ہو چکا تھا۔ اس کے باس نے چھٹی
پر اسے پاکستان بھیجنے کے بارے میں اسے بتایا۔
"صابر...... تم نے اپنے کام کو احسن طریقے سے
سرانجام دیا۔ کبھی کوتاہی نہیں کی اور نہ ہی شکایت کا موقع
دیا۔ اپنے اہل خانہ سے مل آؤ۔ جب تک واپس نہیں لوٹو گے
میں تمہاری تنخواہ جاری رکھوں گا اس لیے کہ تم نے کبھی چھٹی
نہیں کی۔ اور اب......! اب تو تمہیں اپنے بھی یاد کرتے
ہوں گے اور تمہیں بھی ان کی بہت یاد آتی ہوں گی۔ اس
زمرے میں تمہاری دیانت داری کو مدنظر رکھتے ہوئے تمہیں
گھر جانے کی اجازت ہے۔"
گھر اور اس میں بسنے والوں کے بارے میں سن کر
اس کی آنکھوں میں آنسوؤں کے سیلاب امڈ آئے۔ جنہیں
روکنا اس کے بس کی بات نہ تھی شاید...... وہ زار و قطار
رونے لگا۔ ایسی صورت حال دیکھ کر اس کا باس دنگ رہ گیا
اور اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ رکھتے ہوئے پوچھا۔ "لوگ
تو گھر کا نام سنتے ہی کھل اٹھتے ہیں۔ مسرتوں سے ان کے
مرجھائے چہرے گلنار ہو جایا کرتے ہیں مگر تم...... تمہیں گھر
والوں نے کون سا ایسا گہرا گھاؤ بخشا ہے جو تمہیں یوں ہلکان
کیے دے رہا ہے اور تم ان سے بیزار ہو رہے ہو؟"
"ک...... کچھ...... کچھ نہیں سر...... کچھ بھی تو نہیں۔"
اس نے اپنے بھیگے رومال سے آنسو صاف کرتے ہوئے
ہیجان سے کہا۔ وہ انہیں کیسے بتاتا کہ اپنوں کی نفرتوں نے ہی
تو اسے جلاوطن ہونے پر مجبور کیا۔ ان ہی کے ناروا سلوک پہ
وہ بے گھر ہوا اور انہی کی لگائی آگ سے وہ اپنے آپ کو آج
تک جلا رہا ہے۔ وہ کیسا گھر تھا اور اس میں بسنے والے جو
ایک نوالے کا محتاج کرنا چاہتے تھے۔ کیا ایسے رشتوں کو
بھائی کہا جا سکتا ہے؟
"تم خاموش ہو۔ میری بات کا جواب نہیں دے
رہے۔" وہ شفقت پدری سے اس کے سر پر ہاتھ رکھے
ملائمت سے پوچھ رہے تھے۔
اس نے اشکوں سے لبریز، بچاراں بے بس نگاہیں
اٹھا کر ان کی طرف دیکھا اور دھاڑیں مار کر ان سے لپٹ
گیا۔ صابر کی پریشانی سے متاثر ہو کر باس کی آنکھیں بھی
آبدیدہ ہو گئیں۔ "صبر کرو بیٹا۔"
"میں ان کا بھی ہوتا ہوں جن کا کوئی نہیں ہوتا۔" یہ
خداوند کریم کا فرمان ہے۔ خدا بڑا ہی بابرکت ہے۔ بندہ ایک
بار خلوص دل سے اسے پکارے تو وہ ستر مرتبہ کہتا ہے۔ "جی
میرے بندے۔" وہ بہت بڑا کارساز ہے۔ اسے سب خبر
ہے۔ تم اس قدر کیوں پریشان ہو۔ آج سے میں تمہارے
ساتھ ہوں۔ مجھے اپنا ہی کچھ سمجھو اور سبھی دکھ، غم اور
پریشانیاں مجھ پر آشکار کر دو۔ میں ادنیٰ سا بندہ تمہارے کسی
کام آسکوں شاید۔" وہ دور افق کی گہرائیوں میں ڈوبتے
سورج کو دیکھنے لگا تھا۔
"سر جی...... آپ بہت عظیم ہیں۔ آپ کے مجھ پر
پہلے ہی بہت احسان ہیں۔ آپ نے مجھے کبھی میرے اپنوں
کا احساس نہیں ہونے دیا اور میں آج جو کچھ ہوں آپ ہی
کے مرہون منت ہوں۔"
سر جی نے ایک بار پھر اسے اپنے بازوؤں کے حصار
میں لے لیا۔
انہوں نے اس سے پوری روداد سنی۔ اپنی سرگزشت
سناتے ہوئے کئی بار اس کی آنکھوں سے آنسو چھلکے جنہیں اس
خدا کے بندے نے رومال سے صاف کیا پھر سے اس کے
سر پر پیار بھرا ہاتھ رکھا اور دلاسا دیا۔
"بیٹے......! یوں دور رہنے سے حالات ہرگز نہیں
سنبھلیں گے اور حق رو کر نہیں چھین کر حاصل کیا جاتا ہے۔
تاریخ میں وہی لوگ نامور ٹھہرے جنہوں نے باطل کے
سامنے تلوار اٹھائی اور جابر کے سامنے کلمہ حق بلند کیا۔ وہ تو
پھر بھی تمہارے بھائی ہیں۔ جاؤ...... بیٹے گھر چلے جاؤ۔ ان
سے اپنا حق مانگو۔ تمہیں انصاف ملے گا۔ تمہارا حق ملے گا۔
تمہیں پیار ملے گا۔" ان کی باتوں میں خلوص کی اس قدر
شیرینی تھی کہ صابر نے اپنے اشک صاف کرتے ہوئے
انہیں ہاں کہہ دی۔

☆☆☆

نظیر اکبر آبادی کی مثال ایسی ہے جس نے
اپنی فقیری اور قلندری کی ترنگ میں عمر بھر آگرہ
سے قدم باہر نہ نکالا۔ یہ روایات ضعیف ہی سہی کہ
انہیں لکھنؤ، بھرت پور اور عظیم آباد سے کئی بلاوے
ملے مگر انہوں نے سب کو ٹال دیا۔ مگر یہ بہت بڑی
حقیقت ہے کہ نظیر کی جوانی اور شہرت میں دلی (ان
کے اپنے وطن) کا دربار بھی جو شعرا اور ادبا کے لیے
بہتی گنگا کے مصداق تھا اور جس میں ہر کس و ناکس
بقدر ہمت و بساط ہاتھ دھو رہا تھا، کسی کشش کا سبب
نہ بن سکا۔ نظیر کی اس بے نیازی اور فقیری نے
انہیں...... اپنے عہد کے دبے اور کچلے ہوئے عوام
کی زبان بنا دیا۔

**گلڈ Guild**

ہم پیشہ لوگوں کی انجمن، ایسی انجمنیں، ازمنہ
وسطیٰ میں یورپ میں قائم ہوئی تھیں۔ ان میں تاجروں
اور کاریگروں کی انجمنیں خصوصیت سے قابل ذکر ہیں۔
ان کا مقصد ہم پیشہ ارکان کی مدد، ان کے حقوق کی
حفاظت اور مشترکہ مفاد کا حصول تھا۔ تاجروں کی سب
سے پہلی انجمن بارہویں صدی میں انگلستان میں قائم
ہوئی۔ تاجروں نے کاریگروں کو اپنی انجمنوں سے دور
رکھنے کی کوشش کی، جس کے نتیجے میں تیرہویں صدی
میں کاریگروں نے بھی اپنی انجمنیں بنا لیں۔
مرسلہ: فراز یاسین، چنیوٹ

وہ دو سال بعد گھر لوٹ رہا تھا مگر اسے یوں محسوس
ہو رہا تھا جیسے کل ہی کی بات ہو۔ اسے یقین تھا کہ اب وہ
رانی کو با آسانی اپنا لے گا۔ اس کے پاس اتنی رقم تھی کہ رانی
کا جہیز، گاڑی اور مکان بخوبی خرید سکے۔ گزری یادوں کے
در "وا" ہوئے تو اسے بھائی یاد آئے جو اسے نیچا دکھانے کی
کوشش میں تھے۔ ان کی کڑوی کسیلی باتیں، گالیاں اور
قسمیں اسے بے چین و مضطرب سی کرنے لگیں۔ وہ کس حال
میں ہوں گے۔ میرے ساتھ کیسا سلوک کریں گے۔ اپنا
سمجھیں گے بھی یا......!
اسے واپس لوٹا رہی تھیں تو رانی کی وفائیں۔ اس کی
من موہنی اور دلچسپ باتیں۔ ادائیں۔ گزرے پلوں کی یادیں
مگر جانے وہ کس حال میں ہوگی اور اگر وہ نہ ملی تو؟ اس کے

دل کے کسی کونے سے صدا ابھری۔ اسے جھرجھری سی آ گئی اور اتنی آنکھوں کی منڈیروں پر کٹنے لگے۔ مسرتوں کے پھول مرجھانے لگے۔ وہ لمحہ بھر کو یونہی ساکت نگاہوں اور بوجھل وجود سے دور خلاؤں میں تیرتے پرندوں کو گھورتا رہا پھر اس کی آنکھوں کے سامنے گہرے بادل سے چھانے لگے اور ایک اضطراب سا اس کے وجود کو مرتعش کر گیا۔ جیسے اپنی ذات کا کوئی گہرا یقین اس کے اندر ٹوٹ کر کرچی کرچی ہو گیا اور وہ ان کرچیوں کی چبھن سے بے چین و مضطرب سا ہو گیا۔

"جہاز لاہور کی حدود میں داخل ہو رہا ہے اور چند لمحوں بعد لینڈ کرنے والا ہے براہ کرم..... اپنے اپنے بیلٹ باندھ لیں۔" وہ ایک دم چونکا اور بیلٹ اپنے وجود کے گرد حائل کرنے لگا۔

☆☆☆

اس قدر طویل خاموشی اور اکتا دینے والے سفر کے بعد رانی کی یادوں کی مہر خوشبو لیے وہ اپنے شہر پہنچا۔ اپنا علاقہ اس کے لیے جانا پہچانا تھا اور گاؤں، گھر اور گلیاں بھلا کب بدلا کرتے ہیں۔ ان میں تبدیلی کا عمل تو صدیوں بعد رونما ہوا کرتا ہے۔ ان میں بسنے والوں کے خلوص و پیار کی سانجھ دیواروں اور مکانوں میں پوشیدہ ہوا کرتی ہیں جو ان کو جلد بدلنے نہیں دیا کرتیں۔

وہ اپنے مکان کے سامنے تھا دستک دینے پر جب دروازہ کھلا تو وہ لمحہ بھر کو گڑبڑا سا گیا مگر اس کے وجود میں دوڑتا بھاگتا لہو اس کے حیات ہونے کا جواز تھا۔

دروازہ اکبر ہی نے کھولا تھا۔ اس کی بغل میں بیساکھی تھی۔ پاؤں بظاہر وجود کے ساتھ تھا مگر چار پانچ انچ چھوٹا تھا جس کی وجہ سے وہ لنگڑا کر بمشکل بیساکھی کے سہارے دروازے تک آیا تھا۔

"بھا..... بھائی جان۔" وہ چیخ کر ایک دم ہی اس سے لپٹ گیا اور آنکھیں ساون بھادوں بن گئیں۔

"میں..... صابر..... یہ..... یہ سبھی کچھ اسی جرم کا نتیجہ ہے شاید۔" اکبر کی آنکھیں بھی آبدیدہ ہو گئیں اور سر ندامت سے جھکتا چلا گیا۔

سامنے پلنگ سے اٹھ کر صابرہ دوڑی۔ وہ بھائی کو چھوڑنے اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے بوکھلایا سا تھا۔ صابرہ سسکنے لگی پھر آن واحد میں دونوں کی دہاڑیں دور تک سنائی دینے لگیں۔

گھر کے در و دیوار سونے سونے ویران اور اجڑے اجڑے سے محسوس ہو رہے تھے۔ آنگن میں بوڑھا نیم کا پیڑ پتوں کے پیراہن سے خالی اور شاخیں جیسے سوکھ چکی ہوں۔ مکان سے جگہ جگہ پلستر اکھڑ چکا تھا۔ دیواروں کا رنگ و روپ، دھوپ اور بارشیں چاٹ چکی تھیں۔ ہر طرف بکھری ویرانی ان کی غریبی اور مفلسی کی نوحہ کناں محسوس ہو رہی تھیں۔

"یہ..... سب..... کچھ کیسے ہوا بھیا.....؟" صابر کے اشک ٹوٹ ٹوٹ کر اس کے گال بھگوتے ہوئے بہے جا رہے تھے اور وہ بھائی بہن کے ہاتھ تھامے ان کے ساتھ چلتے ہوئے پریشانی سے پوچھ رہا تھا۔

اکبر اسے کیا بتاتا بھلا..... یہ سبھی کچھ تو اسی کا کیا دھرا تھا، اسی کی نفرت اور امارت کی حقارت کا بیج تھا جو اب غریبی اور مفلسی کے تناور درخت کی صورت اس کے سامنے تھا۔

یاد رکھو..... انسان جو کچھ بوتا ہے اسے وہی کاٹنا پڑتا ہے۔ جو بو کر گندم کاٹنے کی خواہش میں انسان سدا خسارے میں رہتا ہے اور یہی کچھ اس دنیا سے اگلے جہان کے لیے کافی ہے۔ وہ چلتے ہوئے پلنگ تک آئے تب تک اکبر کا پورا وجود لرزنے لگا اور وہ زور زور سے کھانسنے لگا۔

صابرہ دوڑتے ہوئے اس کے لیے پانی لائی۔ دو گھونٹ حلق میں اتارنے پر اس کی جان میں جان آئی۔

بہن کا اترا چہرہ، کھلے بال جن پر سفیدی کے تار نمودار ہو چکے تھے جھریوں بھرا چہرہ ہاتھوں پر جما میل اس کی بے بسی و بے چارگی کی مکمل داستان سنا رہا تھا۔

صابر سے ایسی صورت میں کچھ بھی نہ پوچھا جا سکا۔ وہ نڈھال ہو کر پلنگ پر گر سا گیا۔

کئی لمحات یونہی گزر گئے اور پھر وہ ایک جھٹکے سے اٹھا اور جلدی جلدی رانی کے گھر کی طرف بڑھنے لگا مگر اس کے دروازے پر لگے بہت بڑے تالے کو دیکھ کر اسے دھچکا سا لگا اس کا وجود ایک بار پھر کانپ کر رہ گیا۔ پاؤں بوجھل سے ہو گئے اور آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ وہ یونہی نیچے بیٹھتا چلا گیا۔ جانے کتنی دیر وہ اسی کیفیت میں گلی کی دیوار سے پشت لگائے بیٹھا رہا۔ نگاہوں سے اندھیرے کی دھند اتری تو وہ اٹھ کر دھیرے دھیرے کسی ہارے ہوئے جواری کی مانند گھر کی طرف بڑھنے لگا۔

☆☆☆

"بھیا رانی نے تمہارا بہت انتظار کیا۔ روزانہ مجھ سے پوچھا کرتی تھی کہ صابر کب آئے گا؟ اس نے اپنی خیریت کی خبر نہیں دی؟ اس نے میرے بارے میں پوچھا؟" میرا نفی میں جواب سن کر وہ ناامید سی ہو جاتی پھر اپنی آنکھوں سے آنسو بہاتی ہوئی گھر چلی جاتی۔ اس کا ہر دن تمہاری چاہت میں اور ہر شب تصور میں گزری۔ کوئی بھی تو ایسا دن نہ تھا جب اس نے تمہیں یاد نہ کیا ہو۔ وہ روز جی جی کر مرتی اور مر مر کر جیتی رہی اور کرب کے ان بھاری لمحات سے گزرتی رہی۔" بہن اسے بتا رہی تھی اور اسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اس نے صابرہ سے کیا پوچھا ہے اور وہ اسے کیا بتا رہی ہے۔ وہ اس کی جدائی میں پل پل کے لیے ہلکان ہو رہا تھا۔ وہ چند لمحے توقف کے بعد لمبی سانس کے بعد پھر بولی۔ "وہ اکبر کے ساتھ جھگڑنے لگی تھی۔ تم نے جھوٹ کیوں بولا کہ رانی کے باپ نے لمبا جہیز، گاڑی اور بہت کچھ مانگا ہے۔ تم نے مجھ سے میرا پیار، میری وفا، میری زندگی چھین لی ہے، تم بھی کبھی زندہ نہ رہو گے شاید۔"

پھر اچانک اس کا باپ بیمار ہو کر بستر پر آ پڑا۔ اسے رانی کی فکر بری طرح ستانے لگی تھی شاید ایک روز آخر اس سے رہا نہ گیا۔

"بیٹی۔ میری زندگی کے لمحات پورے ہو چکے ہیں شاید اور تو جس کے انتظار میں کھوئی ہوئی ہے وہ میرے ہوتے ہوئے نہ آ سکے شاید۔ میری آخری خواہش ہے کہ میں جیتے جی تیرے ہاتھ پیلے کر جاؤں تاکہ میرے بعد تجھے سائبان میسر آ سکے۔ یہ نہ ہو کہ میرے دن پورے ہو جائیں اور تم بے سہارا رہ جاؤ۔ تیرے چچا کا بیٹا تجھے بے حد چاہتا ہے۔ مجھے امید ہے وہ تیری آنکھوں میں آنسو نہیں آنے دے گا۔" اس کی بوڑھی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے اور شفقت بھرا ہاتھ رانی کے سر پر تھا۔

یوں رانی نے بھی اشکوں کی برسات میں سر کے اشارے سے ہاں کہہ دی پھر سادہ سی تقریب میں چند رشتے داروں کی موجودگی میں اسے آصف کی عزت اور غیرت بنا دیا گیا۔ اس کے چند ہی ماہ بعد بابا جی اگلے جہاں سدھار گئے۔

آخری لمحوں میں وہ مجھے ملی تھی اور گلوگیر آواز میں بتا رہی تھی۔ "صابرہ..... ہماری محبت پاکیزہ تھی۔ چاہت بے لوث اور پیار کی انتہا مگر..... کہیں نہ کہیں ہم سے غلطی ضرور ہوئی ہے جو ہم منزل پر نہ پہنچ سکے۔ وہ دور آسمان پر بھاگتے دوڑتے بادلوں کو دیکھ رہی تھی۔

پھر ایک دم ہی چونکتے ہوئے بولی۔ "ہاں..... مجھے یاد آیا مجھ ہی سے غلطی ہوئی تھی۔ میں نے خدا کی قسم اٹھا کر اسے اپنی سچی اور کھری محبت کا یقین دلایا تھا۔ ہاں باجی اسی قسم کی سزا ہے کہ آج میں کسی اور کے نام کی حنا ہاتھوں پہ سجا رہی ہوں۔ وہ سسکیاں لیتے ہوئے اپنے گھر کی طرف بھاگ گئی تھی۔

یہ سن کر صابر کے رہے سہے اوسان بھی خطا ہو گئے۔ اسے ہر سو آندھیاں سی چلتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ اس کے لیے بھی کچھ جیسے اجڑ کر ویران ہو گیا ہو۔ اسے اپنے وجود میں ایک ساتھ کئی دیواریں سی گرتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ نڈھال سا ہو کر پلنگ پر گرتا چلا گیا۔ پھر اسے کچھ خبر نہ رہی۔

☆☆☆

اکبر نے دولت کے بل بوتے پہ صابرہ کی شادی اس کی خواہش پر بلال سے نہ کی بلکہ اپنے مقابل دولت اور جاگیروں والے امیر چوہدری سے کی۔ صابرہ نے اسے قسمت کا لکھا سمجھ کر قبول کرتے ہوئے ان کی خواہش کے سامنے اپنی حسرتیں اور آرزوئیں قربان کر دیں۔ گھر تو اچھا خاصہ بس گیا مگر کاتب تقدیر کو یہ منظور نہ تھا۔ وہ اپنی کار میں کام سے واپسی پہ گھر آ رہا تھا کہ ہائی وے پر گاڑی کو اوور ٹیک کرتے ہوئے کار بڑے ٹرالر سے ٹکرا گئی اور قلابازیاں کھاتے ہوئے سڑک کنارے کھڑے درخت سے جا ٹکرائی جس سے وہ موقع پر ہی دم توڑ گئے۔

صابرہ کے لیے جیسے پوری دنیا اندھیر نگری بن کر رہ گئی۔ وہ جوانی ہی میں اجڑ کر پھر سے اسی دہلیز پہ چلی آئی تھی، روز تک وہ سکتے کی سی کیفیت میں رہی۔

اس کے منہ سے بار بار بلال ہی کا نام نکلتا اور یہ سبھی کچھ بلال سے بے پناہ محبت اور پیار میں اٹھائی گئی خدا کی قسم کا ہی نتیجہ ہے کہ وہ بے گھر ہو گئی۔ وہ بار بار آسمان کی طرف نگاہ اٹھاتی اور کہتی۔ "بھائیو..... خدا کے لیے کبھی پیار میں یا یونہی کسی بھی مقام پر قسم مت اٹھانا۔ بربادی ہے۔ تباہی ہے۔ خسارہ ہے اور انجام بہت برا ہے۔"

پھر اس کے علاج معالجے پر جانے کتنی رقم خرچ کی گئی۔ پیروں، فقیروں کے پاس لے جایا گیا۔ تب کہیں جا کر وہ اس قابل ہوئی کہ نارمل حالت میں باتیں کرنے لگی۔ اب بھی جب کبھی اسے بیتے لمحات یاد آتے ہیں تو اس کے لبوں پر بلال ہی کا نام آتا ہے۔ وہ مسکرانے لگتی ہے تو

کبھی زور زور سے رونے لگتی ہے۔

☆☆☆

خدا جب اپنے بندوں کو نوازتا ہے تو پھر وہ ان کی بیکراں محنتیں نہیں دیکھا کرتا بلکہ ان کے خلوص ارادے، سچے جذبے اور نیت دیکھا کرتا ہے پھر اسے دیے ہی چلا جاتا ہے۔ اپنی رحمت کا جوش دکھاتا ہے۔ اپنی خدائی، بڑائی اور اپنا آپ منواتا ہے، اور دنیا والوں کو بتاتا ہے کہ میں جسے چاہتا ہوں عزت دیتا ہوں اور جسے چاہتا ہوں ذلت و گمراہی کے اندھیروں میں ڈبو دیتا ہوں۔

بلال کو اپنے ٹھکرائے جانے کا احساس شدت سے تھا جو اسے احساس کمتری میں مبتلا کیے ہوئے تھا مگر اس نے اپنی اس ناکامی کو انا کا روگ نہ بننے دیا اور شب و روز محنت مزدوری کے ساتھ ساتھ اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا۔ بی اے کے بعد اعلیٰ تعلیم کی ڈگری حاصل کرتے ہوئے گورنمنٹ کالج میں بطور سائنس ٹیچر تعینات ہو گئے۔ یوں اس کے دن پھرنے لگے۔ تقریباً دو سال بعد اس نے اپنا دو منزلہ مکان بنالیا اور گھر میں اور ٹائم چند ٹیوشن رکھ لیں۔

رفتہ رفتہ بائیک سے چھوٹی سی گاڑی خرید لی۔

دھیرے دھیرے دولت اس کے آگے پیچھے آنے لگی۔ یوں کل کا غریب اور مفلس اچھا خاصا مالدار اور دولت مند لوگوں کی صف میں شمار ہونے لگا۔ اب اس کے لیے بڑے بڑوں کے رشتے آنے لگے مگر...... وہ آج بھی صابرہ کی اُمید پہ اپنی زیست گزار رہا تھا۔ اس نے آنے والے رشتوں سے کہہ دیا تھا کہ میری شادی ہو گی تو صابرہ سے ورنہ عمر بھر یونہی تنہائیوں میں گزار دوں گا۔

☆☆☆

صابر نے اب چپ سی سادھ لی تھی۔ وہ کسی سے بات کرتا اور نہ کچھ کھاتا پیتا۔ اس کی اس کیفیت کو بھانپتے ہوئے اکبر ایک روز لاٹھی کے سہارے چلتا ہوا اس کے کمرے میں چلا آیا۔

صابر اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”بھائی جان...... آپ مجھے بلا لیتے آپ......“ اس نے بولنا چاہا۔ اکبر نے اس کے سامنے دونوں ہاتھ باندھ دیے اور جھکے سر کے ساتھ بولا۔

”م...... میں...... میں نے تمہارے ساتھ بہت بڑی زیادتی کی ہے۔ ت...... تم میرے بھائی نہیں بیٹے بھی ہو۔ مجھے جو چاہو سزا دے لو مگر...... خدا کے واسطے مجھے دل سے معاف کر دو۔“ اس کی آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔

”م...... مگر...... آپ؟“

”ہاں صابر تم واقعی صابر ہو۔ میں نے اللہ تعالیٰ کی قسم اٹھا کر بہت بڑی غلطی کی تھی۔ یہ میری زندگی کی بہت بڑی بھول تھی جس نے مجھے یہ دن دکھایا ہے۔ کاروبار میں خسارت اور میں بھی اسی دن سے اپاہج ہو کر لنگڑا رہا ہوں۔ یہ اسی جھوٹی قسم کا نتیجہ ہے شاید کہ میں اپنے پاؤں چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہا اور جب تک میں زندہ ہوں یہ میری بدنیتی، ہوس اور لالچ میں اٹھائی گئی قسم کی یاد دلاتا رہے گا۔“ اس نے صابر کے آگے جھکنا چاہا۔

”بھیا! آپ خدا سے پناہ مانگیں۔“ اس نے اسے بازوؤں سے تھام لیا اور بغل گیر ہو گیا۔ ”مجھے...... شرمندہ نہ کریں۔ اس کے حضور سر تسلیم خم کر لیں۔ وہ بڑا غفور و رحیم اور بخشنے والا ہے۔ اس کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں۔“

وہ ایک بار پھر صابر سے لپٹ گیا۔ رونے کی آواز سے پوری حویلی کے در و دیوار لرز کر رہ گئے۔

☆☆☆

صابر کے لیے اب ہر سو اندھیرا تھا۔ اسے نہ پیار ملا اور نہ سکون۔ اس نے صابرہ کا پیار بلال کی صورت اسے ملا دیا۔ سادہ سی تقریب میں وہ پیا دیس سدھار گئی۔ وہ خود آنسوؤں کی سوغات لیے پھر سے سعودی عرب روانہ ہو گیا۔ جہاں اسے پھر سے خوشیاں، چاہنے والے اور سکون میسر تھا۔

دانشوروں کا قول ہے۔ ”قسم، قدم اور قلم سوچ کر اٹھانا چاہیے۔ دولت بھی کسی سے وفا نہیں کرتی۔ زندگی میں وقتی مفادات کے حصول کے لیے جھوٹی قسم کا سہارا لینا انسان کو ذلت اور رسوائی کے سوا کچھ بھی نہیں دیتا۔“

خدا کی قسم نے کہاں کہاں اپنا انجام دکھایا۔ اکبر عمر بھر کے لیے اپاہج ہوا۔ رانی کا پیار منزل مقصود تک نہ پہنچ سکا۔ بلال کی قسم نے بھی دوری دکھائی مگر وہ اسی بھائی کے وسیلے سے کامیاب ہوئی۔

خدا کی قسم کن کن لوگوں نے اٹھائی مگر...... گھر ایک ہی تباہ و برباد ہوا۔

خدارا کسی بھی کاروبار میں، پیار و وفا میں اور روز مرہ زندگی میں دوسروں کی یقین دہانی اور اپنے منافع کے لیے کبھی بھی قسم نہ اٹھاؤ کہ اس کا انجام بہت بھیانک ہے۔

ہمارے پیارے نبیﷺ نے فرمایا۔ ”قسم اٹھانے سے مال بک جاتا ہے مگر برکت نہیں رہتی۔“ (سبحان اللہ)

++